ملّتِ اسلامیّہ کی مختصر تاریخ

(اَوّل)

ثروت صولت

ملّتِ اسلامیّہ کی مختصر تاریخ

(اوّل)

ثروت صولت

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

نام کتاب: ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ (اوّل)
مصنف: ثروت صولت
اشاعت: دسمبر 2014ء
ایڈیشن: 10
تعداد: 600
قیمت: -/340 روپے
مطبع: مکتبہ جدید پریس، لاہور

اہتمام:
عبدالحفیظ احمد (مینجنگ ڈائریکٹر)
اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
منصورہ ملتان روڈ، لاہور پاکستان
فون: 042-35417074, 35417071
فیکس: 042-35417072
موبائل: 0300-8485030
ویب سائٹ: www.islamicpak.com.pk
ای میل: islamicpak@yahoo.com

انتساب

میں اس کتاب کو ابا مرحوم
ڈاکٹر صولت خاں صاحب کے نام معنون کرتا ہوں
جن کی توجہ، محبت اور شفقت نے نہ صرف یہ کہ مجھ
میں تاریخ کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا بلکہ دنیا کے تمام
معاملات کو اسلام کے نقطۂ نظر سے دیکھنا بھی سکھایا۔

عرضِ ناشر

ملت اسلامیہ کی تاریخ پر ہماری زبان میں کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ کچھ کتابیں نہایت ضخیم اور علمی و ادبی انداز میں لکھی گئی ہیں جن تک ایک عام آدمی کی دسترس مشکل ہے کچھ صرف مسلمانوں کی قومی تاریخ کی حیثیت سے لکھی گئی ہیں اور کچھ صرف سطحی انداز میں۔ ایک عرصے سے اس موضوع پر ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو ایک طرف تو مختصر اور جامع ہو اور دوسری طرف مستند اور صحیح نقطۂ نظر کی حامل ہو جس سے ایک عام آدمی بھی استفادہ کر سکے اور ایسے تعلیم یافتہ حضرات بھی جو ضخیم کتابوں کے پڑھنے کی نہ فرصت پاتے ہیں اور نہ خریدنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔

اس تالیف کے ذریعہ ہمارے محترم دوست ثروت صولت مرحوم نے اس اہم ضرورت کو نہایت خوبی سے پورا کیا ہے۔ آپ نے تمام اہم اور مستند واقعات کو نہایت عام فہم اور جدید تاریخی اسلوب میں بیان کیا ہے اور ملتِ اسلامیہ کی پوری تاریخ کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھ کر پیش کیا ہے۔ اس میں اُمّت مسلمہ کی نہ صرف سیاسی بلکہ تہذیبی، علمی اور ادبی تاریخ کو بھی سمو دیا ہے۔

ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ کے چار حصے ان ملکوں کی تاریخ پر مشتمل تھے جہاں مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے ذریعہ معاشرتی زندگی کا رُخ موڑا، جہاں مسلمانوں کو بالادستی نصیب ہوئی اور جہاں آج بھی مسلمانوں کے دورِ اختیار و اقتدار کی یادیں اور یادگاریں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ اب یہ پانچواں حصہ ان ملکوں کے حالات و کوائف پر مشتمل ہے جہاں مسلمان اقلیت کی صورت میں ہیں اور مسلمان حکومتوں اور اسلامی انقلاب کی علمبردار تحریکوں کی توجہ، تعاون اور سرپرستی کے امیدوار ہیں۔ شاید کہ یہ داستان درد اہلِ دل مسلمانوں کو چونکا سکے اور انہیں اپنے مظلوم و مقہور اور بے سہارا بھائیوں کو الحاد و بے دینی کے بڑھتے پھیلتے جال اور چنگل میں پھنس کر دولت ایمان و اسلام سے محروم ہو جانے سے بچا سکے۔

"ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" کے پانچ حصے 1985 تک کے واقعات کے ہیں۔ اس کے بعد کے واقعات پر چھٹی اور ساتویں جلد مرتب ہو رہی ہے۔ ان شاء اللہ یہ بھی جلد شائع ہو جائیں گے۔

مینجنگ ڈائریکٹر

27۔ اکتوبر 2014ء

فہرست مضامین

فہرست نقشہ جات

مقدمہ اشاعت سوم

ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ حصہ اول کی یہ تیسری اشاعت ہے اور جیسا کہ قارئین ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہ اشاعت پہلی اور دوسری اشاعت سے بہت مختلف ہے۔ اس مرتبہ میں نے پوری تاریخ پر نظر ثانی کی ہے، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ پوری تاریخ از سر نو لکھی ہے اور اس کی حیثیت بڑی حد تک ایک نئی کتاب کی ہوگئی ہے۔ اب اس تاریخ کا حصہ اول حجم کے لحاظ سے پہلے کے مقابلے میں دوگنا اور دوسرا حصہ اس سے بھی زیادہ ضخیم ہوگیا ہے۔ پہلے میرا ارادہ ایک مفصل تاریخ اسلام لکھنے کا تھا، لیکن کام کی زیادتی اور وقت کی کمی کی وجہ سے اس کی تکمیل ممکن نظر نہیں آ رہی۔ ایسی صورت میں قارئین سے اشاعت اول کے مقدمہ میں مفصل تاریخ لکھنے کا جو وعدہ کیا تھا اس کے ایفاء کی یہی صورت نظر آئی کہ مختصر تاریخ کو کسی قدر مفصل کر دیا جائے تاکہ تاریخ اسلام کا طالب علم تشنگی بھی محسوس نہ کرے اور اہم واقعات اور مسائل بھی نظر انداز نہ ہوں۔ اس مقدمہ کے پیش نظر ان اہم واقعات کو جو پہلی اشاعت میں بہت مختصر تھے نئی اشاعت میں کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے متعدد نئے مباحث کا اضافہ بھی کیا گیا ہے اور اس کی کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ کے مختصر حجم کو پیش نظر رکھتے ہوئے تاریخ اسلام کا کوئی دور اور اسلامی دنیا کا کوئی ملک ایسا نہ رہے جس کی تاریخ نئے ایڈیشن میں پیش نہ کی گئی ہو۔

ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ کے دوسرے حصے کی ترتیب میں بھی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ پہلے اس حصے میں کل ۲۸ باب تھے اب ان کی تعداد ۳۶ ہوگئی ہے۔ اس حصے میں ہر ملک کی تاریخ اس سال تک پہنچا کر ختم کر دی گئی ہے جس سال اس ملک پر غیر مسلم طاقتوں کا اقتدار قائم ہوا یا جس سال قدیم دور ختم ہو کر جدید دور کا آغاز ہوا۔ مثال کے طور پر الجزائر کی تاریخ ۱۸۴۷ء پر، اسلامی ہند کی تاریخ ۱۸۵۷ء پر، انڈونیشیا کی تاریخ ۱۸۷۴ء پر، مشرقی ترکستان کی تاریخ ۱۸۷۶ء پر،

تونس کی تاریخ ۱۸۸۱ء پر، مصر کی تاریخ ۱۸۸۲ء پر، مغربی ترکستان کی تاریخ ۱۸۸۴ء پر، ملایا کی ۱۸۸۵ء پر، مشرقی افریقہ کی تاریخ ۱۸۸۹ء پر، مغربی افریقہ کی تاریخ ۱۹۰۲ء پر، مراکش کی تاریخ ۱۹۱۲ء پر، اور ترکی کی تاریخ ۱۹۲۴ء پر جب کہ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا، ختم کی گئی ہے۔

ملت اسلامیہ کی تاریخ کے تیسرے حصے میں اسلامی دنیا کے دور جدید کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ اس حصے میں ہر اسلامی ملک کی آزادی کی جدوجہد، آزادی کے بعد تعمیر و ترقی کا حال اور جدید نظریاتی کشمکش کی داستان پیش کرنے کے علاوہ علمی و ادبی ترقی پر بھی ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ آبادی، رقبہ، زرعی اور صنعتی پیداوار سے متعلق اعداد و شمار اس حصے کی ایک بڑی خصوصیت ہیں۔

ہماری تاریخ کے اس نئے ایڈیشن میں تاریخ کے مختلف ادوار کے تجزیہ اور تحلیل کے علاوہ اسلامی دنیا کے اسباب زوال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جو پہلے ایڈیشن میں بڑی حد تک نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں اس نئے ایڈیشن میں نظریاتی نقطۂ نظر سے کتاب کو زیادہ سے زیادہ جاندار بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حکمران خاندانوں کے شجروں کی تعداد بھی بڑھا دی گئی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مقامات پر سنہ ہجری اور سنہ عیسوی دونوں دیئے جائیں، اہم واقعات کی فہرست زیادہ مکمل اور مفصل کر دی گئی ہے اور آخر میں اہم اشخاص، مقامات اور اصطلاحات کے انگریزی مترادفات کی ایک فہرست کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یہ فہرست ان حضرات کے لیے مفید ثابت ہوگی جو انگریزی میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کرتے وقت صحیح ناموں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اسی طرح اُردو میں مطالعہ کرنے والے حضرات کو ان ناموں کے انگریزی مترادفات معلوم ہو جانے کے بعد انگریزی کتب کے مطالعہ میں سہولت ہوگی۔

ان تبدیلیوں اور اضافوں کے بعد ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ کے اس نئے ایڈیشن نے ایک ایسی مکمل اور جامع اسلامی تاریخ کی شکل اختیار کر لی ہے جس کی مثل میری معلومات کی حد تک کسی زبان میں موجود نہیں۔ ان تمام تبدیلیوں کے باوجود کتاب کی زبان حسب دستور آسان اور اندازِ بیان حسب سابق دلچسپ اور عام فہم رکھا گیا ہے تاکہ پڑھنے والوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کتاب سے فائدہ اٹھا سکے۔ قوی امید ہے کہ ان اضافوں کے بعد ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ قارئین کے لیے پہلے سے زیادہ دلچسپ، مفید اور معلومات افزا ثابت ہوگی۔

کراچی۔ ۱۶۔ دسمبر ۱۹۷۶ء   ثروت صولت

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

دیباچہ

تاریخ اسلام عام اصطلاح کے مطابق کسی ''قوم'' کی تاریخ نہیں ہے بلکہ ایک تحریک کی تاریخ ہے اور ایک نظریئے کے عروج و زوال کی داستان ہے۔ اگر ہم اسلامی تاریخ کو گروہ یا جماعت سے نسبت دیں تو اس گروہ یا جماعت کے لیے ''قوم'' کی بجائے ملت کا لفظ زیادہ صحیح ترجمانی کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ ملت کا لفظ ہمارے ہاں قوم کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ لیکن اسلامی مفکرین نے ہمیشہ اس کی وضاحت کر دی ہے کہ سیاسی اصطلاح کے طور پر قوم یا ملت کا مفہوم مسلمانوں میں وہ کبھی نہیں رہا جو مغرب اور دوسری اقوام میں سمجھا جاتا ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی (اقبال)

یا

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے (اقبال)

تاریخ کا طالب علم ایک سرسری جائزے کے بعد آسانی سے معلوم کر سکتا ہے کہ اسلامی تاریخ ایک نظریاتی کش مکش کی تاریخ ہے۔ جب بھی اسلامی اصولوں پر عملدرآمد کے معاملے میں کمزوری کا اظہار ہوا تو مسلمان حکمرانوں اور مصلحین نے فوراً تدارک کی کوشش کی۔ حضرت ابو بکرؓ اور فاروق اعظمؓ سے لے کر اورنگ زیب عالمگیرؒ تک یہی کشمکش نظر آتی ہے اور پاکستان کا قیام بھی اس کشمکش کا آخری بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ تازہ ترین مظہر ہے۔

تاریخ اسلام کے اس مفہوم کے تعین کے بعد کہ یہ ایک نظریے کی تاریخ ہے ایک مورخ کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ ملت اسلامیہ کی تاریخ کا مطالعہ ان ہی اصولوں کی روشنی میں کرے جن پر ملت اسلامیہ کی بنیاد ہے اور وہ یہ دیکھے کہ مسلمان کہاں کہاں ان اصولوں پر عمل پیرا ہوئے اور کہاں کہاں انھوں نے ان اصولوں سے انحراف کیا۔

۲

اس جگہ ہماری تاریخ نویسی کے رجحان کی طرف اشارہ کر دینا بے موقع نہیں ہوگا۔ ہمارے مورخین بالعموم ہر اُس کارنامے کو سراہنے لگتے ہیں جو غیر معمولی نوعیت کا ہوتا ہے۔ وہ اس کا خیال نہیں رکھتے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارے نزدیک اس کارنامے کی کیا اہمیت ہے۔ اس طرز تحریر کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ تیمور اور نادر بھی اس صف میں آ گئے ہیں جس میں صلاح الدین اور نور الدین ہیں اور اتاترک کو بھی اسی مقام پر بٹھا دیا گیا ہے جس پر قائداعظم محمد علی جناح فائز ہیں حالانکہ ان دونوں رہنماؤں کے نظریات میں بعد المشرقین ہے۔ جدید دور کی تاریخ میں یہ خامی خاص طور پر نمایاں ہوگئی ہے۔ ہر وہ شخص جس نے مغربی استعمار یا غیر مسلم طاقتوں کا مقابلہ کیا وہ ہمارا قابل تقلید ہیرو بن گیا۔ اس طرح ہر وہ مسلمان قابل احترام ہو جاتا ہے جو مادی زندگی کے کسی بھی پہلو میں غیر معمولی امتیاز حاصل کر لیتا ہے۔ اس معاملے میں ''اسلام کا معیار'' تقریباً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ دراصل ہمارا نقطۂ نظر ''اسلامی'' کی بجائے قوم پرستانہ ہوتا جا رہا ہے۔ چونکہ اس نقطۂ نظر سے ہر اس کارنامے کو سراہا جاتا ہے جو غیر قوم کے مقابلے میں انجام دیا گیا ہو اس لیے ہم بھی ایسا ہی کرنے لگے ہیں۔ لیکن یہ ایک مغربی اور غیر اسلامی نقطۂ نظر ہے۔ اس کی وجہ سے اسلامی نقطۂ نظر کو جو اچھے اور بُرے کے درمیان امتیاز کرنے کا ہمارے لیے سب سے بڑا معیار ہے نقصان پہنچ رہا ہے۔ جدید دور کی تاریخ میں یہ نقطۂ نظر خاص طور پر بہت نمایاں ہوگیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہر پرانی بات اور پرانے رسم و رواج کو ہدف ملامت بنا لیا جاتا ہے اور ہر نئی تبدیلی اور ہر نئی تحریک کا تذکرہ حوصلہ افزا انداز میں کیا جاتا ہے۔ تنقید کے وقت ہم یہ بات قطعی بھول جاتے ہیں کہ عہد جدید کی بہت سی نئی تحریکیں اپنے ساتھ غیر اسلامی اثرات بھی لا رہی ہیں اور ان کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں اس طرح غیر اسلامی تصورات، نظریات، اور رسم و رواج فروغ

پانے لگے ہیں جس طرح عہد قدیم کے مختلف زمانوں میں غیر اسلامی تصورات اور رسم و رواج ہمارے معاشرے میں داخل ہوگئے تھے۔ اس طریق فکر کا ایک مضحکہ خیز نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بہت سی وہی باتیں جو ہمارے عہد قدیم کے کارنامے شمار کی جاتی ہیں اور جن پر مغربی مستشرقین کے اعتراضوں کا ہمارے اہل علم جواب دیتے رہے ہیں وہی باتیں موجودہ دور میں خود ہمارے اپنے اہل قلم حضرات کے ہاتھوں سے شعوری اور غیر شعوری طور پر مذموم قرار دی جارہی ہیں۔ ہمارے جدید تاریخ نویسوں کی تحریر کا یہ تضاد بڑا مہلک ثابت ہورہا ہے اور اس کی وجہ سے مسلمانوں میں اسلام سے متعلق تشکیک اور بے یقینی بڑھتی جارہی ہے۔

۳

ایک اور حقیقت جو تاریخ اسلام کے مطالعے سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ ملت اسلامیہ چونکہ بنیادی طور پر ایک ہی ثقافت اور ایک ہی تہذیب کی علمبردار ہے اس لیے ہم ملت کی تاریخ کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتے۔ اسلامی تاریخ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے تاریخ اسلام کے صرف ایک دور کا مطالعہ کافی نہیں ہوسکتا اور نہ ہی کسی ایک ملک کی تاریخ سے ہم اسلامی تہذیب و تمدن اور نظریات کا مکمل احاطہ کرسکتے ہیں۔ مسلمانوں کے عروج و زوال، ان کی حیات اجتماعی اور ان کی نظریاتی اور تصوراتی کشمکش کو کسی ایک دور کی روشنی میں نہیں بلکہ پوری تاریخ کی روشنی میں ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ تاریخ عالم میں اسلامی دور کی اہمیت اور اس کا مقام صحیح تعین بھی صرف اسی صورت میں کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ اسلام کی اس وحدت کو ہمارے دور عروج کے مورخوں نے ہمیشہ تسلیم کیا ہے۔ طبری سے لے کر تاریخ الفتی تک اول ایک ہزار سال میں جس قدر اہم تاریخیں لکھی گئی ہیں ان کا موضوع پوری اسلامی تاریخ رہا ہے۔ یہ صرف دور زوال ہی ہے جس میں ہم سیاسی انتشار کے ساتھ ساتھ تہذیبی انتشار میں بھی مبتلا ہوگئے۔ اب جب کہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوچکا ہے ہمارے لیے اپنی اس تاریخ اور تہذیبی وحدت کو بحال کرنا انتہائی ضروری ہے۔

۴

یہ تھے وہ چند اصول جن کے مطابق راقم الحروف نے اب سے کوئی پندرہ سال قبل ایک

مکمل اور جامع تاریخ اسلام مرتب کرنے کا کام شروع کیا تھا۔ افسوس کہ وقت کی کمی کی وجہ سے ——— ملازمت پیشہ انسان کے لیے ایسے کاموں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ہے ——— یہ تاریخ ابھی تک مکمل نہ ہوسکی۔ چونکہ کتاب کی تکمیل میں ابھی کافی وقت درکار ہے اس لیے یہ مناسب سمجھا گیا کہ فی الحال مذکورہ بالا اصولوں کا خیال رکھتے ہوئے ایک مختصر اور عام فہم تاریخ مرتب کر دی جائے جو طالب علموں، کم تعلیم یافتہ لوگوں اور ان افراد کی ضرورت پوری کر سکے۔ جو وقت کی کمی کی وجہ سے تفصیلی تاریخ کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔ پیش نظر کتاب میری اسی کوشش کا نتیجہ ہے۔ کتاب کو عام فہم بنانے کی وجہ سے نہ تو زیادہ سنجیدہ مسائل زیر بحث آ سکتے تھے اور نہ ان پر علمی انداز میں بحث کی جا سکتی تھی۔ بہرحال کتاب کی اس ''عام فہم'' حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے جس حد تک بحث اور غور و فکر کی گنجائش تھی اس سے کام لیا گیا ہے۔ اس مقصد میں کہاں تک کامیابی ہوتی ہے یہ فیصلہ کرنا پڑھنے والوں کا کام ہے۔ میں اپنی صفائی میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے اس لیے کوتاہی اور غلطی کا امکان زیادہ ہے۔ اگر صاحب بصیرت اور صاحب علم حضرات نے رہنمائی کی تو نہ صرف یہ کہ اگلی اشاعت کو بہتر بنایا جا سکے گا بلکہ تاریخ اسلام کے مطالعے اور تنقید کی ایک نئی راہ کھل جائے گی اور مجھ سے زیادہ صلاحیت رکھنے والے اہل قلم اپنی تحقیق کے نتائج کو زیادہ مکمل اور بہتر شکل میں پیش کر سکیں گے۔

۵

پیش نظر کتاب میں اگرچہ چودہ سو سال کی تاریخ کو کم و بیش پانچ سو صفحات میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ تاریخ اسلام کا کوئی پہلو نظر انداز نہ ہونے پائے۔ اس مختصر کتاب میں آغاز اسلام سے موجودہ دور تک ہر اس خطے کی تاریخ آ گئی ہے جہاں مسلمانوں نے کوئی بھی نمایاں کام انجام دیا ہے۔ چنانچہ روس اور انڈونیشیا جیسے دور دراز ملکوں اور صحرائے اعظم کے جنوب میں افریقہ کے سیاہ فام باشندوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں کتاب میں صرف فتوحات اور سیاسی معاملات ہی کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی علمی، ادبی، معاشرتی اور تمدنی تاریخ بھی پیش کی گئی ہے۔ بادشاہوں اور وزیروں کے علاوہ عالموں،

ادیبوں، شاعروں، فن کاروں اور سیاحوں کے حالات اور کارنامے بھی زیادہ سے زیادہ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاریخ اسلام پر عربی، اردو اور انگریزی میں متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن اس کے باوجود پڑھنے والے اس جامع مختصر اور عام فہم تاریخ میں ایک نئی بات پائیں گے اور یہ محسوس کریں گے کہ تاریخ ملت اسلامیہ ہمارے تاریخی ادب میں ایک نیا اور مفید اضافہ ہے۔

۶

کتاب کے اس تعارف کے بعد چند جملے کتاب کے طرز تحریر کے متعلق بھی ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ کتاب میں پڑھنے والے کو براہ راست مخاطب کیا گیا ہے اور یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی تاریخ ہماری اپنی تاریخ ہے اور گزشتہ چودہ سو سال میں جو بھی اچھے اور برے کام انجام دیئے گئے ہیں وہ ہمارے ہی آباؤ اجداد کے ہیں۔ اگر اچھے کارنامے ہمارے لیے باعث فخر ہیں تو برے کاموں کی شرمندگی بھی ہمارے ہی حصے میں آئے گی۔ ہمیں اچھے کاموں کو مشعل راہ بنانا ہے اور برے کاموں اور غلطیوں سے سبق حاصل کرنا ہے تاکہ آئندہ ان غلطیوں کا اعادہ نہ ہو سکے۔

کتاب کا مقصد چونکہ اپنی تاریخ کی روشنی میں مستقبل کے لیے راہ ہموار کرنا ہے اس لیے میرے خیال میں یہ طرز تحریر اس کتاب کے لیے نہایت مناسب ہے۔ اگر کتاب نے پڑھنے والے میں وہی جذبہ پیدا کر دیا جو اس کتاب کا مقصد ہے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ لیکن اگر کتاب اس مقصد میں ناکام رہی تو خدا سے خلوص نیت کا اجر طلب کرنے کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں۔

آخر میں اپنے دوست محبوب الحق صاحب وفا متھوی اور اپنے ایک سابق رفیق سید حبیب احمد صاحب کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان دونوں حضرات نے خصوصاً محبوب صاحب نے اس کتاب کے مسودے کو جس خلوص اور محنت سے ٹائپ کیا اس کے احسان سے میں سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ مدد نہ کرتے تو کتاب کی اشاعت میں معلوم نہیں اور کتنی تاخیر ہو جاتی۔

۳۳۳ بی۔ بلاک ۲ — ثروت صولت

پاکستان ایمپلائز کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی — ۱۵۔ اپریل ۱۹۶۴ء

باب ۱

خُدا کا پیغام

ہماری یہ دنیا کب اور کیسے پیدا ہوئی، انسان کس طرح وجود میں آیا۔ یہ کائنات خود بخود پیدا ہوگئی یا اس کا کوئی پیدا کرنے والا بھی ہے۔ یہ دنیا ہمیشہ قائم رہے گی یا کسی دن دنیا اور اس کی ہر چیز فنا ہو جائے گی؟ یہ ایسے سوال ہیں جو انسان کے ذہن میں پیدا ہوئے ہیں اور پیدا ہوتے رہیں گے۔ لیکن یہ ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے کہ عقل اور علم کی مدد سے ابھی تک حل نہیں ہو سکا۔ اور حل ہو بھی کیسے سکتا ہے جبکہ یہ دنیا اُس وقت بھی موجود تھی جب انسان کا وجود نہیں تھا۔ اور جب انسان پیدا ہوا تو وہ ہزاروں سال تک لکھنے پڑھنے کے قابل نہ ہو سکا۔ شروع میں وہ اتنا غیر مہذب تھا کہ شہر تو بڑی چیز ہے گاؤں میں بھی رہنا نہیں جانتا تھا۔ نہ کھیتی باڑی کر سکتا تھا اور نہ کوئی چیز بنا سکتا تھا۔ جنگلوں میں ننگا پھرتا تھا اور مکانوں کی بجائے غاروں میں رہتا تھا۔ پیٹ بھرنے کے لیے جنگل کے پھل اور پتوں پر گزر کرتا تھا۔ ایسی صورت میں انسان کے لیے اپنے وجود سے پہلے کا حال بتانا تو بڑی بات ہے خود اپنے زمانے کے ابتدائی حالات اور تاریخ کو بھی یاد رکھنا ممکن نہیں۔ اس لیے اس دنیا کی پیدائش کے بارے میں کچھ بتانا اور ایک ایسے دَور کے حالات معلوم کرنا، جب بنی نوع انسان کا اس زمین پر آغاز ہوا، ناممکن سا ہے۔ عالموں اور سائنس دانوں نے اس سلسلے میں کچھ تحقیقات ضرور کی ہیں لیکن یہ یقینی باتیں نہیں اور حقیقت کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح غیب کے حالات یعنی ایسی دنیا کے حالات بتانا جس کو ہم آنکھوں سے نہ دیکھ سکتے ہوں صرف عقل کے بس کی چیز نہیں ہے۔

کائنات کا خالق اللہ ہے

کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس دنیا کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں اور یہ سب کچھ خود بخود پیدا ہو گیا۔ یہ بات نہ تو عقل میں آتی ہے اور نہ دل کو مطمئن کر سکتی ہے اور یقینی تو کسی حال میں نہیں ہو سکتی۔ ایک ترک شاعر نے کہا ہے:

"جب تم ایک کتاب پڑھتے ہو تو جانتے ہو کہ اس کا کوئی لکھنے والا بھی ہے۔

اور جب تم ایک شاندار عمارت کو دیکھتے ہو، تو تمہارا ذہن اس کے بنانے والے کی طرف جاتا ہے۔

تو کیا زمین و آسمان کا کوئی بنانے والا نہیں؟

اے لوگو غور کرو اور جان لو کہ کائنات کا یہ وجود خود ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اُس کا پیدا کرنے والا بھی کوئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے"

لہٰذا سچی اور دل کو لگنے والی بات یہی ہے کہ یہ کائنات خود بخود پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس کا پیدا کرنے والا بھی ہے۔ اسی خالق کائنات کو اللہ کہا جاتا ہے۔[1] اب اگر اللہ خود اپنے بندوں کو دُنیا، انسان، اور کائنات سے متعلق کوئی خبر دے تو وہ یقیناً شک وشبہ سے بالا ہوگی۔

خوش قسمتی سے مسلمانوں کے پاس ایک ایسی کتاب ہے جو انسان کی لکھی ہوئی نہیں، بلکہ اللہ کا کلام ہے۔ یہ قرآن ہے۔ ہم یہاں اس بحث میں نہیں پڑیں گے کہ قرآن کو اللہ کی کتاب کیوں سمجھا جائے۔ یہ بحث مختصر طور پر اگلے صفحوں میں موجود ہے اور اس موضوع پر بڑی بڑی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں جن میں یہ بحث تفصیل سے موجود ہے۔

قرآن کے مطابق دنیا اور اس کی ہر مخلوق اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے۔ صرف اللہ ہی کی ذات ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، باقی ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ اللہ نے اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے اور غیب کی اُن باتوں کو بتانے کے لیے، جن سے کوئی شخص اپنی محدود عقل کی مدد سے واقف نہیں ہوسکتا، ایک کتاب دی ہے جس کو قرآن مجید کہا جاتا ہے۔ اس کتاب میں اللہ نے دنیا کی پیدائش اور اس کے خاتمہ سے متعلق کچھ ایسی باتیں بتائی ہیں جو کسی اور ذریعہ سے معلوم نہیں ہوسکتیں۔ چونکہ یہ باتیں ایک ایسی ہستی کی بتائی ہوئی ہیں جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، اس لیے ہمارے لیے معلومات حاصل کرنے کا اس سے زیادہ صحیح اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اللہ نے اپنی کتاب میں یہ تو نہیں بتایا کہ انسان کب پیدا ہوا، ہاں یہ ضرور بتایا کہ تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام اور ان

---

(۱) اللہ کے وجود کے بارے میں ملاحظہ کیجیے تفہیمات اول از سید ابوالاعلیٰ مودودی، مضمون "عقل کا فیصلہ" زیادہ تفصیلی مطالعہ کے لیے ذیل کی دو کتابیں ملاحظہ کیجیے (۱) خدا موجود ہے۔ مترجمہ عبدالحمید صدیقی۔ مغرب کے چالیس سائنسدانوں کے مضامین کا مجموعہ۔ (۲) خدا ہمارے ساتھ ہے۔ مصنفہ اے، کریسی ماریسن مترجمہ مولانا صلاح الدین احمد۔

کی بیوی حضرت حوا علیہا السلام کی اولاد ہیں جو پہلے انسان ہیں۔ قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب اللہ نے حضرت آدمؑ کو جنت سے زمین پر بھیجا تو ان سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ آنیوالی نسلوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے اللہ اپنے رسول اور نبی بھیجتا رہے گا۔[1] جو لوگ ان رسولوں کی ہدایت پر چلیں گے وہ کامیاب ہوں گے۔ ان کی دنیا بھی اچھی گزرے گی اور مرنے کے بعد آخرت کی زندگی بھی اچھی ہوگی۔ لیکن جو لوگ اللہ کے بھیجے ہوئے ان رسولوں کی ہدایت کے خلاف عمل کریں گے ان کی دنیا شاید اچھی ہو جائے لیکن آخرت، جو ہمیشہ کی زندگی ہے، اچھی نہیں ہوگی۔

توحید انسان کا پہلا عقیدہ

قرآن کی اس اطلاع کے مطابق اس دنیا میں انسان کا آغاز اس علم کی روشنی میں ہوا کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا صرف ایک اللہ ہے اور انسان اور ہر جاندار اس کا بندہ اور غلام ہے۔ نیز یہ کہ سب سے پہلے انسان کا صرف ایک اللہ پر ایمان ہی نہیں تھا بلکہ وہ انسان خود اللہ کا رسول اور نبی بھی تھا۔ یہ عقیدہ بعض غیر مسلم مفکروں کے اس خیال کے برعکس ہے کہ انسان کا آغاز جہالت کی تاریکی میں ہوا اور اللہ کا عقیدہ اور مختلف مذاہب بعد کی پیداوار ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ حقیقت نہیں، صحیح بات یہ ہے کہ توحید یعنی اللہ کو ایک ماننا انسان کا سب سے پہلا عقیدہ تھا اور بعد میں انسان گمراہ ہو کر بت پرستی، شرک اور الحاد کی طرف چلا گیا۔ قرآن کے اس دعوے کی اب جدید تحقیق نے بھی تصدیق کر دی ہے۔[2]

حضرت آدمؑ کے بعد جب ان کی اولاد بڑھی اور جگہ جگہ پھیل گئی تو اللہ نے اپنے وعدے کو پورا کیا۔ اس نے ہر ملک اور قوم میں رسول، نبی اور ہادی بھیجے جو لوگوں کو ایک اللہ کی طرف بلاتے تھے اور اللہ کی ہدایت کے مطابق اچھی باتوں کا حکم دیتے تھے۔ ہمیں ان رسولوں میں سے صرف چند کے نام معلوم ہیں یعنی ان کے نام جن کا قرآن میں ذکر آیا ہے۔ ان کے علاوہ دنیا کی دوسری قومیں جن بزرگوں کو ہادی اور رہنما اور خدا کی طرف سے مقرر کیے ہوئے اوتار یا پیغمبر سمجھتی ہیں ممکن ہے کہ وہ بھی نبی ہوں، لیکن چونکہ ہمیں صحیح طور پر معلوم نہیں اور ان کی تعلیم بھی ہم تک اصلی حالت میں نہیں پہنچی اس لیے ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ نبی تھے یا نہیں۔

---

(۱) ملاحظہ ہو ''دینیات'' از سید ابو الاعلیٰ مودودی باب ''نبوت''

(۲) ملاحظہ کیجیے پروفیسر ڈبلو شمڈ کی کتاب کا انگریزی ترجمہ مطبوعہ لندن۔

رسول اور ان کی تعلیم

جن نبیوں کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے ان میں ایک حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ وہ اب سے تقریباً چار ہزار سال پہلے عراق کے شہر اُر میں پیدا ہوئے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ جب بڑے ہوئے تو اللہ نے ان کو نبوت کے مرتبہ پر سرفراز کیا۔ نبی ہونے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے عراق اور اس سے ملے ہوئے ملکوں، شام اور مصر میں اللہ کا پیغام پہنچایا۔ اس کے بعد وہ ملک عرب گئے جہاں انھوں نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ مل کر شہر مکہ میں اللہ کی عبادت کے لیے ایک گھر بنایا جو خانہ کعبہ کہلاتا ہے۔ یہ وہی خانہ کعبہ ہے جس کی طرف منہ کر کے ساری دنیا کے مسلمان نماز پڑھتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے بعد بھی بہت رسول آئے۔ ان میں حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت عیسیٰؑ بہت مشہور ہیں۔ قرآن مجید کی طرح ان نبیوں پر بھی اللہ نے کتابیں اتاری تھیں، جو توریت، زبور اور انجیل کہلاتی ہیں۔ توریت حضرت موسیٰؑ پر، زبور حضرت داؤدؑ پر اور انجیل حضرت عیسیٰؑ پر اتری۔

دنیا کا دستور ہے کہ کچھ لوگ سیدھے راستے پر چلتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں اور کچھ لوگ غلط راستہ اختیار کر لیتے ہیں اور بُرے بُرے کام کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ان نبیوں کی ہدایت پر تو لوگ صحیح راستہ اختیار کر لیتے تھے لیکن ان کے بعد جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا لوگ اصل راستے سے بھٹک جاتے تھے اور اپنے نفس، خواہش اور اغراض کو رہنما بنا لیتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لوگوں نے ان کی بتائی ہو تعلیم بُھلا دی، ایک اللہ کی عبادت کرنے کے بجائے بُتوں کو پُوجنے لگے اور دوسروں کو اللہ کا شریک بنانے لگے۔ (۱) انھوں نے سب سے زیادہ بُری بات یہ کی کہ اللہ کی کتابوں میں بھی ردوبدل کرنے لگے۔ توریت اور انجیل کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ (۲) اس طرح یہ معلوم کرنا ممکن نہیں رہا کہ ان رسولوں کی صحیح تعلیم کیا تھی۔ ان پیغمبروں کی اُمتوں نے اپنے اصل مذہب یعنی ''اسلام'' کو بگاڑ کر دہ مذہب

---

(۱) ملاحظہ کیجیے ''رسالہ دینیات'' از سید ابو الاعلیٰ مودودی۔

(۲) الہامی کتابوں میں کس طرح تحریف کی گئی اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے ''الجہاد فی الاسلام'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی جس کے باب ششم میں یہودی مذہب، مسیحیت، ہندومت اور بودھ مذہب کے مآخذ سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ''تفہیم القرآن'' از سید ابو الاعلیٰ مودودی حصہ اول صفحہ ۴۹۱۔ ۴۹۵، صفحہ ۵۱۵۔ ۵۱۶ بھی ملاحظہ کیجیے جس میں الوہیت مسیحؑ و مریمؑ کے عقیدے سے بحث کی گئی ہے۔

بنائے جو اس وقت مختلف ناموں سے دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً عیسیٰ علیہ السلام نے جس مذہب کی تعلیم دی تھی وہ اسلام ہی تھا مگر اُن کے بعد اُن کے پیرووں نے خود حضرت عیسیٰ ؑ کو معبود بنا ڈالا اور ان کی دی ہوئی تعلیم کے ساتھ کچھ دوسری باتیں ملا جُلا کر وہ مذہب ایجاد کر لیا جس کا نام آج عیسائیت ہے۔''(1)

پچھلی امتوں کی اس گمراہی کو دُور کرنے کے لیے اور اپنے پیغام کو قیامت تک زندہ رکھنے کے لیے اللہ نے اپنا آخری نبیؐ دنیا میں بھیجا، اور اسؐ کو ایک کتاب دی جس کو قرآن مجید کہتے ہیں۔ اس کتاب میں اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ قرآن مجید کی قیامت تک حفاظت کرے گا اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہونے دے گا تاکہ لوگ اپنے پیدا کرنے والے کا حکم اور اس کی ہدایت ہمیشہ صحیح صورت میں معلوم کر سکیں۔ یہ آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

قرآن مجید دوسرے رسولوں کی تصدیق کرتا ہے

بعض لوگ غلط فہمی کی بنا پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بانیٔ اسلام کہتے ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے۔ آپؐ اور آپؐ کی طرح دوسرے نبی بانیٔ اسلام نہیں تھے بلکہ اللہ کے رسول تھے۔ انھوں نے اپنی مرضی سے کوئی مذہب ایجاد نہیں کیا، صرف اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچایا۔ اور سب کا پیغام ایک ہی تھا یعنی اسلام۔ قرآن کسی نبی کے پیغام کو رد نہیں کرتا اور نہ دوسرے مذاہب کی کتابوں کو الہامی کتاب ماننے سے انکار کرتا ہے۔ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ پچھلے نبیوں کی تعلیم بدل ڈالی گئی ہے اور ان کی کتابوں میں اتنا ردو بدل ہو گیا ہے کہ نبیوں کی اصل تعلیم مسخ ہو گئی ہے۔ قرآن ان تمام نبیوں کی اور ان کی اصل تعلیمات کی تصدیق کرتا ہے۔

آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جن کے لیے ہم آئندہ رسول پاکؐ اور آنحضرتؐ کے الفاظ استعمال کریں گے۔ حضرت ابراہیمؑ کے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے ہیں۔ آپؐ نے حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت عیسیٰ ؑ کی تعلیم کو پھر سے زندہ کیا۔ گمراہ لوگوں نے ان کی تعلیم میں جو غلط باتیں شامل کر دی تھیں، ان کو دُور کیا اور اللہ کا پیغام اپنی صحیح اور اصلی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔

(1) ''رسالۂ دینیات'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۵۴ تا ۵۵
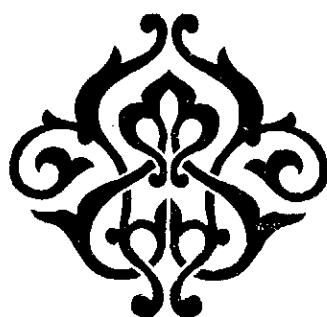
باب ۲

ظہورِ اسلام سے پہلے

ظہور اسلام سے پہلے، یعنی اس وقت سے پہلے، جب آخری نبی ﷺ کو نبوت ملی اور انھوں نے لوگوں کو اللہ کے حکم یعنی اسلام کی طرف بلانا شروع کیا، دُنیا بہت ترقی کر گئی تھی۔ اب لوگ غاروں اور جنگلوں کی بجائے شہروں میں رہتے تھے، جہاں بڑے بڑے مکانات ہوتے تھے اور طرح طرح کی سہولتیں حاصل ہوتی تھیں۔ کھیتی باڑی کرتے تھے اور تمام قسم کا غلہ جو آج ہم لوگ کھاتے ہیں، پیدا کرنا سیکھ گئے تھے۔ اُن کو سُوتی، اُونی اور ریشمی کپڑا بنانا آ گیا تھا۔ لوہے اور مختلف دھاتوں سے برتن اور ضرورت کی تمام چیزیں بنا سکتے تھے۔ سمندر پر سفر کرنے کے لیے بادبانی کشتیاں اور جہاز اور خشکی پر سفر کے لیے اونٹ، گھوڑے، ہاتھی، بیل اور دوسرے جانوروں کو اور ان کے ذریعہ کھینچی جانے والی گاڑیوں کو استعمال کرنا جانتے تھے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ انسان نے لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ بڑی بڑی کتابیں لکھی جاتی تھیں اور اگرچہ اس زمانہ میں چھاپے خانے کی سہولت نہیں تھی اور کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں، لیکن پھر بھی اس کثرت سے لکھی جاتی تھیں کہ بعض شہروں میں بڑے بڑے کتب خانے قائم ہو گئے تھے۔ مختصر یہ کہ انسان پتھر اور لوہے کے زمانے اور جہالت و وحشت کے دَور سے نکل کر علم اور تہذیب کے دَور میں داخل ہو گیا تھا۔

دنیا کے مختلف مذاہب

لیکن جو بات تعجب کی ہے وہ یہ ہے کہ علم اور تہذیب کی ترقی کے باوجود انسان توحید کی اس تعلیم کو بھول گیا تھا جو اللہ نے حضرت آدمؑ کو دی تھی۔ اللہ کو مانتے تو سب تھے لیکن انھوں نے ایک کی بجائے بہت سے خدا بنا لیے تھے اور پتھر کے بتوں کو خدا جان کر پوجنے لگے تھے۔ عرب کے مشرق میں عراق اور ایران کے ملک تھے جہاں ایرانی آباد تھے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے آگ کو پُوجنا شروع کر دیا تھا۔ ایران کے مشرق میں ہندوستان کا عظیم ملک واقع تھا جہاں کے لوگ تہذیب و تمدن اور علم و دانش میں بہت آگے تھے۔ وہ خود کو ایک الہامی

مذہب کا پیرو کہتے تھے اور یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ان کی مذہبی کتابیں جن کو ''وید'' کہا جاتا ہے خدا کا کلام ہیں لیکن اس کے باوجود ہندوؤں نے ایک اللہ کو چھوڑ کر بے شمار خدا بنا لیے تھے۔ ہر طاقتور چیز ان کے نزدیک خدا تھی۔

وسط ایشیا سے لے کر بحرالکاہل کے ساحل تک جو ملک پھیلے ہوئے تھے اور جن میں چین اور جاپان مشہور ہیں، اُن میں بُدھ مت کے پیرو آباد تھے۔ یہ مذہب ہندوستان ہی سے نکل کر ان ملکوں میں پھیلا تھا۔ بُت پرستی سے اس مذہب کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ظہورِ اسلام کے وقت بدھ مت کے ماننے والوں میں بھی بُت پرستی عام ہوگئی تھی اور انھوں نے اپنے مذہب کے بانی مہاتما بدھ کو پوجنا شروع کر دیا تھا۔ [1]

عرب کے شمال اور مغرب میں مسیحی یا عیسائی مذہب کا زور تھا۔ شام، مصر، ایشیائے کوچک، حبش اور جنوبی اور مغربی یورپ کے لوگ عام طور پر عیسائی تھے۔ وہ خود کو حضرت عیسیٰ ؑ کا پیرو کہتے تھے لیکن اُن کی بتائی ہوئی توحید کی تعلیم کو بُھلا کر حضرت عیسیٰ ؑ کو خدا اور خدا کا بیٹا کہنے لگے تھے اور حضرت عیسیٰ ؑ اور حضرت مریم کے بُت اور تصویریں تک بنانے لگے تھے۔

عیسائیوں کی طرح یہودی بھی الہامی مذہب کے علمبردار تھے۔ وہ خود کو حضرت موسیٰ ؑ کا پیرو کہتے تھے لیکن اُنھوں نے بھی حضرت موسیٰ ؑ اور ان کے بعد آنے والے پیغمبروں کی تعلیم کو یا تو بُھلا دیا تھا یا مسخ کر دیا تھا۔ اور حضرت عیسیٰ ؑ جیسے پیغمبر کو پھانسی تک دلانے کی کوشش کی۔ ان یہودیوں کا کوئی وطن نہیں تھا۔ بحیرۂ روم کے چاروں طرف کے ملکوں میں ان کی بستیاں موجود تھیں۔ عرب میں بھی کئی جگہ عیسائیوں کی طرح یہودیوں کی بستیاں بھی تھیں۔

تو یہ صورت حال تھی ظہورِ اسلام سے پہلے دنیا کی۔ لیکن ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تمام قوموں میں گرچہ بُت پرستی عام تھی لیکن وہ ایک آخری نبی کا انتظار بھی کر رہی تھیں جو ان کو نجات دلائے گا اور صحیح راستہ بتائے گا۔ [2] یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتابوں میں تو آخری نبی سے

---

(1) ملاحظہ کیجیے ''الجہاد فی الاسلام'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۳۷۸۔

(2) انجیل میں آخری نبی کی پیشین گوئی کے لیے ملاحظہ کیجیے ''تفہیم القرآن'' حصہ پنجم از سید ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۴۶۱۔ ۴۷۶ نیز ''بائیبل سے قرآن تک'' یہ کتاب مولانا رحمت اللہ کیرانوی ؒ کی کتاب ''اظہار الحق حصہ سوم'' کا اردو ترجمہ ہے اور اس میں انجیل اور الہامی کتابوں میں آخری نبی کے بارے میں پیش گوئیوں کا بہت تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔

متعلق پیش گوئیاں اور خوشخبریاں بہت واضح ہیں لیکن ایران کے آتش پرستوں اور ہندوستان کے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں تک میں بھی آخری نبی کے متعلق اشارے ملتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ابتداءً مذاہب کا سرچشمہ ایک تھا۔

عرب: قدیم تہذیبوں کا مرکز

عرب کا ملک، جہاں آخری نبیؐ پیدا ہوئے اور جہاں خدا کے پیغام ''اسلام'' کو از سرِ نو زندہ کیا گیا، تہذیب و ترقی کی دوڑ میں دنیا کے ان ملکوں سے بہت پیچھے تھا جن کا تذکرہ ابھی ہم پڑھ چکے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب عرب کے قدیم باشندوں نے عرب سے نکل کر بابل، شام اور مصر میں شاندار حکومتیں قائم کی تھیں اور تہذیب و تمدن کو ترقی دی تھی۔ بابل کا مشہور حکمراں حمورابی جو ایک قانون ساز کی حیثیت سے مشہور ہے، عربوں کے اسی قدیم دور سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس زمانے میں عربوں نے خاص عرب میں بھی حضرموت کے علاقے میں اور خلیج فارس سے متصل عرب کے مشرقی ساحل پر ایک شاندار تمدن کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن عربوں کے یہ کارنامے زمانۂ قبل از تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں اور آج ان کا حال معلوم کرنے کا واحد ذریعہ اُس دور کے آثارِ قدیمہ کی وہ کھدائی ہے جو دورِ جدید میں کی گئی ہے۔ عربوں کی تاریخ میں ان قوموں کو عرب بائدہ یعنی وہ عرب جو ناپید ہو گئے کہا جاتا ہے۔ عاد اور ثمود کی قومیں اور حضرت ہود اور حضرت صالحؑ جیسے رسول اسی دور سے تعلق رکھتے تھے۔

ظہورِ اسلام سے قریبی زمانہ میں یمن میں عربوں نے ایک شاندار تمدن کی بنیاد ڈالی تھی یہ دور سبا کی سلطنت کا تھا جو ۱۱۰۰ قبل مسیح سے ۳۰۰ء تک قائم رہی۔ [1] اس زمانہ میں زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کو فروغ ہوا۔ بعد کے زمانہ میں یہ تہذیب بھی ختم ہو گئی لیکن اس کا اتنا اثر ضرور باقی رہا کہ ظہورِ اسلام کے وقت یمن کا علاقہ پورے عرب میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کی اکثریت بت پرست تھی لیکن یہودی اور عیسائی بھی کافی تعداد میں تھے۔

---

(۱) سبا کے حالات کے لیے دیکھیے ''ارض القرآن'' از سید سلیمان ندوی اور ''تفہیم القرآن'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی، جلد چہارم صفحہ ۱۹۵۔۱۹۹

عہد جاہلیت

ظہورِ اسلام کے وقت یمن کو چھوڑ کر باقی عرب نیم وحشت کی حالت میں تھا۔ کوئی حکومت موجود نہیں تھی جو امن و امان قائم رکھ سکتی۔ سارا ملک قبیلوں میں تقسیم تھا اور ہر قبیلہ اپنی جگہ آزاد تھا اور من مانی کرتا تھا۔ یہ قبیلے آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ اگر ایک قبیلہ کا آدمی دوسرے قبیلے کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا تھا تو انتقام لینا ضروری سمجھا جاتا تھا اور اس کی وجہ سے لڑائیوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو برسوں جاری رہتا تھا اور ہزاروں انسان انتقام کی اس جنگ میں مارے جاتے تھے۔

ملک میں ڈاکے اور رہزنی عام تھی۔ لوگ اس زمانہ میں قافلے بنا کر سفر کیا کرتے تھے۔ لیکن ایک شہر سے دوسرے شہر تک سفر کرنا اتنا خطرناک ہوتا تھا کہ قافلے کے قافلے لوٹ لیے جاتے تھے۔ جو قبیلے لوٹ مار کو پیشہ بنائے ہوئے تھے وہ اس کو قابل فخر کام سمجھتے تھے۔ شراب اور جوا اسی طرح عام تھے جیسے آج مغربی ملکوں میں عام ہیں۔ بس اتنا فرق تھا کہ مغرب کے لوگ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے یہ کام شائستگی سے کرتے ہیں اور عرب کے لوگ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے بے ڈھنگے طریقے سے کرتے تھے۔ کسی آدمی کی جان لینا معمولی بات تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑتے تھے اور ایک دوسرے کو قتل کر دیتے تھے۔ لڑکی کا پیدا ہونا بہت برا سمجھا جاتا تھا اور اس کو بے عزتی کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ ایسے سنگدل لوگ بھی موجود تھے جو لڑکی کو پیدا ہوتے ہی زندہ زمین میں دفن کر دیتے تھے اور کوئی اُن سے اس ظلم کا حساب نہیں کر سکتا تھا۔

عرب میں تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ شہر مدینہ میں تو یہودیوں اور عیسائیوں میں پڑھے لکھے لوگ موجود تھے لیکن مکہ میں لکھنا پڑھنا جاننے والے لوگ سترہ سے زیادہ نہیں تھے۔

ہم پچھلے باب میں پڑھ چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے مل کر عرب میں اس جگہ جسے بعد میں مکہ کا نام دیا گیا خدا کی عبادت کے لیے پہلا گھر یا مسجد تعمیر کی تھی جسے خانہ کعبہ کہا جاتا ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ اس کے بعد مکہ ہی میں آباد ہو گئے۔ جب خانہ کعبہ بنا تھا تو اس جگہ کسی قسم کی آبادی نہیں تھی۔ لیکن کعبہ بننے کے بعد اس کے چاروں طرف لوگ آباد ہوتے چلے گئے اور اس طرح ایک شہر وجود میں آ گیا جسے لوگ مکہ کہنے لگے۔

حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مکہ اور عرب کے لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیلؑ کی تعلیم کو بھلاتے چلے گئے۔ پھر ایک شخص نے ایک بُت لاکر کعبہ میں رکھ دیا جس کو لوگ خدا سمجھنے لگے اور اس طرح بت پرستی شروع ہوگئی اور ایک وقت ایسا آ گیا کہ خانہ کعبہ میں جو ایک خدا کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا تین سو ساٹھ بُتوں کی پوجا ہونے لگی۔ ہر قبیلہ نے اپنا ایک بت تراش لیا تھا۔ مکہ میں ایک خدا کو ماننے والے اب بھی موجود تھے لیکن ظہور اسلام کے وقت ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔

عربوں کی بعض خوبیاں

ان تمام خرابیوں اور برائیوں کے باوجود عربوں میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ وہ بہادر تھے، نڈر تھے، فیاض تھے، عہد کے پابند تھے، حریت پسند تھے اور ان کی زندگی سادہ تھی۔ وہ دنیا کی دوسری پرانی اور مہذب قوموں کی طرح آرام طلب اور عیش پسند بھی نہیں تھے۔ ان میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہیں تھا لیکن ان کی زبان عربی دنیا کی مکمل ترین زبان تھی۔ قبل از اسلام کی عربی شاعری آج بھی دنیا کی بہترین شاعری میں شمار ہوتی ہے۔ خطابت یعنی تقریر کرنے کے فن میں عرب کسی کو اپنا مدِمقابل نہیں سمجھتے تھے بلکہ دوسری قوموں کو عجمی یعنی گونگا کہتے تھے۔ بلند خیالات کو ادا کرنے اور دلوں میں اثر پیدا کرنے کے لیے عربی سے زیادہ موزوں کوئی زبان نہیں تھی۔ ''اس زبان کے مختصر جملوں میں بڑے بڑے مضامین ادا ہو جاتے ہیں اور پھر اُن میں ایسا زور ہوتا ہے کہ دلوں میں تیر و نشتر کی طرح اثر کرتے ہیں۔ ایسی شیرینی ہوتی ہے کہ کانوں میں رس پڑتا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا نغمہ ہوتا ہے کہ آدمی بے اختیار جھومنے لگتا ہے۔ قرآن جیسی کتاب کے لیے ایسی ہی زبان کی ضرورت تھی۔''(1)

زبان کی اس خوبی کے علاوہ جغرافیائی نقطۂ نظر سے ایک بین الاقوامی پیغام کے لیے عرب سے زیادہ موزوں مقام دنیا میں اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ ملک ایشیا اور افریقہ کے عین وسط میں واقع ہے اور یورپ بھی یہاں سے بہت قریب ہے۔ خصوصاً اُس زمانہ میں یورپ کی متمدن قومیں زیادہ تر یورپ کے جنوبی حصہ میں آباد تھیں اور یہ حصہ عرب سے اتنا ہی قریب ہے جتنا ہندوستان

---

(1) رسالہ ''دینیات'' از سید ابُوالاعلیٰ مودودی باب نبوت، اور عنوان ''پیغمبری کی مختصر تاریخ''

اور پاکستان۔

یہ وہ حالات تھے کہ عرب کی سرزمین میں پیغمبر اسلام اور آخری نبیؐ پیدا ہوئے۔

اگلے باب میں ہم دنیا کی اس سب سے بڑی ہستیؐ اور بنی نوع انسان کے اس عظیم محسنؐ کا حال بیان کریں گے جسؐ کی اُمت میں ہونے کا دعویٰ ہم سب مسلمان کرتے ہیں۔ آپ کے حالات اور تعلیم سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد یہ بات بھی سمجھ میں آ جائے گی کہ قرآن کا یہ دعویٰ کہ وہ خدا کا کلام ہے اور نیک لوگوں کے لیے ہدایت کی کتاب ہے بالکل صحیح اور درست ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان
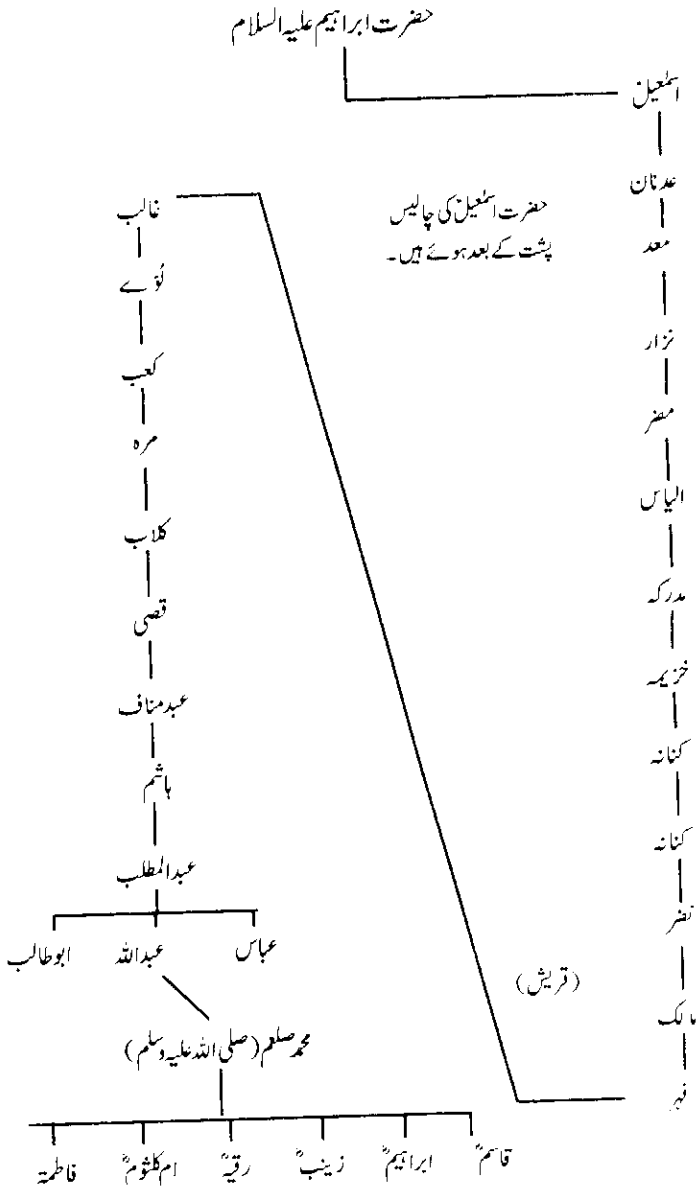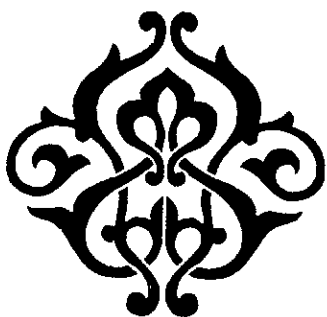
باب ۳

آخری نبیؐ ۔ (۱)

(مکہ کی زندگی)

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت اسماعیلؑ کے تقریباً ڈھائی ہزار سال بعد ۹ ۔ ربیع الاول ۵۳ قبل ہجری مطابق ۲۰ ۔ اپریل ۵۷۱ء کو شہر مکہ میں پیدا[1] ہوئے۔ دن پیر کا تھا۔ آپؐ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں تھے اور عرب کے مشہور قبیلے قریش سے آپؐ کا تعلق تھا۔

آنحضرتؐ یتیم پیدا ہوئے۔ یعنی آپؐ کی پیدائش سے پہلے ہی آپؐ کے والد حضرت عبداللہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد جب آپؐ چھ برس کے ہوئے تو والدہ حضرت آمنہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اب آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے آپؐ کی پرورش کی، لیکن دو سال بعد وہ بھی چل بسے۔ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ سال کی عمر ہی میں باپ، ماں اور دادا جیسے پیارے عزیزوں کی محبت سے محروم ہوگئے۔ آخر میں آپؐ کے چچا ابوطالب نے آپؐ کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور آپؐ ان ہی کی سرپرستی میں جوان ہوئے۔

اُس زمانہ میں عرب میں چونکہ پڑھنے اور لکھنے کا رواج نہیں تھا اس لیے آنحضرتؐ نے بھی کچھ نہیں پڑھا۔ قریش کا سب سے بڑا پیشہ تجارت اور کاروبار تھا اس لیے جب آپؐ بڑے ہوئے تو اپنے چچا کے ساتھ تجارتی سفروں پر جانے لگے، اور اس سلسلے میں شام اور یمن کے دُور دراز ملکوں کے چکر بھی لگائے۔

رسول پاکؐ شروع ہی سے ہر قسم کی بُری باتوں سے بچے رہے۔ نہ شراب پی اور نہ جوا کھیلا۔ بت پرستی بھی نہیں کی جس کا عرب میں عام رواج تھا۔ ہمیشہ سچ بولتے تھے جس کی وجہ سے لوگ آپؐ کو صادق یعنی سچا آدمی کہہ کر پکارتے تھے۔ ایمانداری کا یہ حال تھا کہ مکہ کے لوگ اپنے روپے، پیسے اور زیور وغیرہ آپؐ ہی کے پاس امانت کے طور پر رکھوا دیتے تھے۔ امانت رکھنے والے

(۱) آپؐ کی پیدائش سے متعلق مشہور عام روایت ۱۲ ربیع الاول کی ہے۔ میں نے وہ روایت لی ہے جو مولانا شبلی نے ''سیرت النبی'' میں اور قاضی سلیمان منصور پوری نے ''رحمۃ للعالمین'' میں لکھی ہے۔

کو امین کہا جاتا ہے۔ اس لیے آپ مکہ میں صادق کے علاوہ امین کے نام سے بھی مشہور تھے۔

اُس زمانہ میں مکہ میں ایک مالدار خاتون تھیں جن کا نام خدیجہؓ تھا۔ اُن کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا، اس لیے وہ اپنا تجارتی سامان دیانت دار لوگوں کے سپرد کر کے دوسرے ملکوں کو بھیجا کرتی تھیں۔ جب حضرت خدیجہؓ کو آنحضرتؐ کی دیانت داری کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے آپ کو بہت سا مالِ تجارت دے کر ملک شام کی طرف بھیجا۔ جب آپ سامان فروخت کر کے واپس آئے تو حضرت خدیجہؓ پر آپؐ کی ایمانداری کا ایسا اثر ہوا کہ انھوں نے شادی کا پیغام دے دیا۔ حضرت خدیجہ بڑی نیک خاتون تھیں اور اپنی اس نیکی کی وجہ سے طاہرہ یعنی پاک خاتون کہلاتی تھیں۔ آنحضرتؐ کی عمر اگرچہ ۲۵ سال کی تھی اور حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال یعنی آنحضرتؐ سے ۱۵ سال زیادہ، لیکن اس کے باوجود آپؐ نے اپنے چچا سے مشورے کے بعد حضرت خدیجہؓ سے شادی کر لی۔

نبوت کا آغاز

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، یہ وہ زمانہ تھا کہ جب شہر مکہ اور عرب کے لوگ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی تعلیم کو بھلا کر بت پرستی کرنے لگے تھے اور خانہ کعبہ، جو ایک خدا کی عبادت کے لیے بنایا گیا ایک ایسا بت خانہ بن گیا تھا جس میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ لوگ قتل و غارت، لوٹ مار، شراب نوشی، جوا اور طرح طرح کی بے حیائی اور بے شرمی کے کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ آنحضرتؐ ان تمام برائیوں سے بچتے تھے اور اپنا وقت اچھے کاموں میں صرف کرتے تھے۔ جب آپ بڑے ہوئے تو اپنا وقت غور و فکر اور عبادت کرنے میں صرف کرنے لگے۔ شادی کے بعد آپؐ مکہ کے قریب ایک پہاڑی پر چلے جاتے تھے اور وہاں ایک غار میں جس کا نام حرا ہے کئی کئی دن رہ کر اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ آخر اللہ نے ایک دن جب آپؐ غارِ حرا میں عبادت کر رہے تھے اپنے فرشتہ جبریلؑ کے ذریعہ آپؐ کو اللہ کا رسول اور نبی ہونے کی خوشخبری دی۔ (۱) حضرت جبریلؑ وہی فرشتے تھے جو رسول پاکؐ سے پہلے بھی تمام نبیوں کو اللہ کا

---

(۱) اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ قرآن کی پہلی آیت ہے جو نبوت ملنے کے تقریباً چھ ماہ بعد ماہ رمضان میں نازل ہوئی۔ ملاحظہ کیجیے "رحمۃ للعالمین" از قاضی محمد سلمان منصور پوری حصہ اوّل صفحہ ۵۔

پیغام پہنچاتے رہے تھے۔ یہ پیغام اسلام کا پیغام تھا۔ یعنی اللہ کو ایک ماننا اور اس کے حکم کے آگے سر جُھکا دینا، یہی اسلام کے معنی ہیں۔ مسلم یا مسلمان اس کو کہتے ہیں جو خدا کے حکم کے آگے اپنا سر جُھکا دے۔ نبوت ملنے کے وقت آپ کی عمر چالیس سال تھی۔

جب خدا نے بندوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو منتخب کرلیا تو آپؐ نے یہ پیغام دوسروں تک پہنچانے کا کام فوراً شروع کردیا۔ سب سے پہلے آپؐ نے اپنے گھر والوں اور دوستوں کو اسلام کا پیغام پہنچایا۔ اُن سے بتوں کی پُوجا چھوڑ کر ایک خدا کی پوجا کرنے کے لیے کہا۔ آپؐ کی بیوی حضرت خدیجہؓ، چچا زاد بھائی حضرت علیؓ ابن ابی طالب جن کی عمر ابھی صرف دس سال تھی، آپؐ کے دوست حضرت ابوبکرؓ اور آپؐ کے غلام حضرت زیدؓ کو آپؐ کی صداقت پر اتنا بھروسہ تھا کہ فوراً اسلام لے آئے۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جو آنحضرتؐ کی زندگی کے ظاہر اور باطن سے اچھی طرح واقف تھیں۔ انھوں نے اسلام قبول کر کے یہ بات ثابت کردی کہ اُن کو ہمارے نبیؐ اور ان کے پیغام کی سچائی پر پورا پورا ایمان تھا۔ آنحضرتؐ اسی طرح خاموشی سے تین سال تک تبلیغ کرتے رہے اور اس مدت میں تقریباً چالیس آدمیوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اس ابتدائی دَور میں اسلام قبول کرنے والوں میں حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت سعد بن وقاصؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ کے نام اس لحاظ سے نمایاں ہیں کہ بعد کے زمانے میں رسول خداؐ کے ان ساتھیوں نے جن کو صحابی کہا جاتا ہے اسلامی تاریخ میں بڑے کارنامے انجام دیے۔

کفار قریش کی مخالفت

تین سال تک خاموشی سے تبلیغ کرنے کے بعد آنحضرتؐ نے خدا کے حکم سے علی الاعلان تبلیغ شروع کردی۔ آپؐ نے ایک دن مکہ کے تمام لوگوں کو جمع کیا اور اُن سے پوچھا کہ تم مجھ کو سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا۔ سب لوگوں نے کہا ''آپ ایک سچے آدمی ہیں اور ہم نے آپ سے کبھی جھوٹ بات نہیں سنی'' آپ نے کہا کہ ''اگر ایسا ہے تو پھر میری بات مانو، ایک اللہ پر ایمان لاؤ اور بت پرستی چھوڑ دو''۔ لیکن بت پرستی تو عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ ان کو رسول اللہؐ کی یہ بات ناگوار گزری۔ انھوں نے آپؐ کو سچا ماننے کے باوجود آپؐ کی بات نہیں مانی اور بت پرستی چھوڑ کر

ایک اللہ کی طرف آنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے وہی بات کہی جو ہر قدامت پسند کہتا ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے طریقوں کو نہیں چھوڑیں گے۔ اس طرح انھوں نے اللہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ انکار کو عربی میں کفر کہتے ہیں اور انکار کرنے والے کو کافر۔ اس لیے وہ تمام لوگ جو اسلام نہیں لائے۔ کافر کہلائے۔ اس طرح مکہ کے لوگ دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے، جن میں ایک مسلمانوں کی تھی اور دوسری کافروں کی۔

اس کے بعد اسلام جیسے جیسے پھیلتا گیا اور ملت اسلامیہ میں شامل ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، کافروں کی پریشانیاں بھی بڑھتی گئیں۔ اب انھوں نے آنحضرتؐ کو اور مسلمانوں کو طرح طرح سے ستانا اور ان پر ظلم کرنا شروع کر دیا۔ اُس زمانہ میں ساری دنیا میں غلامی کا رواج تھا۔ یعنی سامان تجارت کی طرح آدمیوں کی بھی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ وہ مرد جن کو خرید لیا جاتا تھا غلام اور عورتیں لونڈی یا کنیز کہلاتی تھیں۔ اسلام قبول کرنے والوں میں غلام اور لونڈیاں بھی تھیں۔ یہ غلام چونکہ اپنے آقاؤں کے ہاتھوں میں بے بس ہوتے تھے اس لیے کافروں کے ظلم و ستم کا سب سے زیادہ نشانہ یہی لونڈی غلام ہوتے تھے۔ کافر آقا ان کو کوڑوں سے مارتے، چلچلاتی دھوپ میں کبھی زمین پر اور کبھی دہکتے انگاروں پر لٹا دیتے لیکن ان غلاموں کا ایمان اتنا پکا تھا کہ انھوں نے یہ سب تکلیفیں اٹھائیں مگر اسلام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ان ثابت قدم اور بہادر غلاموں میں حضرت بلالؓ حبشی اور حضرت عمارؓ بن یاسر کے نام بہت مشہور ہیں۔

مکہ کے کافروں کا ظلم جب بہت بڑھ گیا تو مسلمانوں کی ایک جماعت آنحضرتؐ کی ہدایت پر مکہ چھوڑ کر سمندر پار ایک دوسرے ملک میں چلی گئی جس کو حبش کہتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کا اسلام لانا

کافروں کی ان سختیوں کے باوجود اسلام کا قافلہ آگے ہی بڑھ رہا تھا اور حق و صداقت کے متلاشی خوف و ڈر کی اس فضا میں بھی اسلام کے دائرے میں داخل ہو رہے تھے۔

مصائب اور مشکلات کے اس دَور میں جب کوئی بااثر شخص اسلام کے دائرے میں داخل ہو جاتا تھا تو مایوسی میں امید کی ایک کرن پیدا ہو جاتی تھی۔ ایسی ہی ایک صورت ہجرت حبش کے بعد

اس وقت پیش آئی جب مکہ کے دو بہادر اور با اثر آدمی ایمان لائے، ان میں ایک رسول پاکؐ کے چچا حضرت حمزہؓ تھے اور دوسرے حضرت عمرؓ جو اُن دس صحابیوں میں سے ہیں جن کو عشرہ مبشرہ [1] کہا جاتا ہے۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو بڑی تقویت ملی اور اب وہ علی الاعلان اللہ کی عبادت کرنے لگے۔

اس دوران میں مکہ کے کافروں نے رسول پاکؐ پر مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے پہلے تو حضرت ابوطالب سے کہہ کر آپ کو اسلام کی تبلیغ سے روکنا چاہا۔ لیکن آپؐ نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر آفتاب اور دوسرے ہاتھ پر ماہتاب بھی لا کر رکھ دیں تو بھی اس فرض کو ادا کرنے سے باز نہ آؤں گا۔ یہاں تک کہ کامیاب ہو جاؤں یا اسی راہ میں میرا خاتمہ ہو جائے۔

اس کے بعد کافروں نے آپ کو طرح طرح کے لالچ دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے رسول پاکؐ سے کہا کہ اگر آپؐ شرک اور بُت پرستی کی مخالفت چھوڑ دیں تو ہم آپؐ کو مکہ کا سردار تسلیم کر لیں گے۔ اگر آپ کسی مالدار اور خوبصورت عورت سے شادی کرنا چاہیں تو ہم اس سے شادی کر دیں گے۔ اس کے علاوہ اگر آپؐ دولت کے خواہشمند ہیں تو آپؐ کو جتنی دولت درکار ہے اس کو بھی دینے کے لیے تیار ہیں۔

بنی ہاشم کا مقاطعہ

رسول پاکؐ کے لیے، جو ایک اعلیٰ مقصد کے لیے کام کر رہے تھے، اس قسم کے لالچ بے معنی تھے۔ چنانچہ قریش کے سردار مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ اس مایوسی نے ان کو اور زیادہ بے رحم اور سفاک بنا دیا۔ اب تک عام مسلمان کافروں کے ظلم کا شکار تھے لیکن اب انھوں نے خود آنحضرتؐ کی ذات کو نشانہ بنانا شروع کر دیا اور بالآخر ان کافروں نے ایک خوفناک فیصلہ کیا۔ کافروں نے آپؐ کے چچا جناب ابوطالب سے کہا کہ وہ رسول اللہؐ کو قتل کرنے کے لیے ان کے

---

[1] ان دس صحابیوں کے نام یہ ہیں:
۱۔ حضرت ابوبکرؓ۔ ۲۔ حضرت عمرؓ۔ ۳۔ حضرت عثمانؓ۔ ۴۔ حضرت علیؓ۔ ۵۔ حضرت ابوعبیدہؓ۔ ۶۔ حضرت زبیرؓ۔ ۷۔ حضرت طلحہؓ۔ ۸۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ۔ ۹۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور ۱۰۔ حضرت سعیدؓ بن زید جو حضرت عمرؓ کے بہنوئی تھے۔

سپرد کر دیں ورنہ اُن کا اور ان کے خاندان بنو ہاشم کا مقاطعہ یعنی بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔ ابو طالب اگر چہ اسلام نہیں لائے تھے لیکن وہ اپنے پیارے بھتیجے کو کافروں کے سپرد کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے اب کافروں نے خاندان بنو ہاشم سے ملنا جلنا اور ہر قسم کا تعلق ختم کر دیا۔ یہاں تک کہ کھانے پینے کی چیزیں بھی اُن تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ آنحضرتؐ اور اُن کے گھر والے مکہ کے قریب ایک پہاڑ کی گھاٹی میں جو بعد میں شعب ابی طالب کے نام سے مشہور ہوئی، پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ یہاں کھانا نہ ملنے کی وجہ سے یا تو فاقے کرنا پڑتے تھے یا درختوں کے پتے کھا کر پیٹ بھرنا پڑتا تھا۔ مصیبت کے یہ دن تقریباً تین سال جاری رہے۔ آخر مکہ کے چند نیک دل لوگوں کی کوششوں سے یہ مقاطعہ ختم ہوا اور آپؐ اور آپؐ کے گھر والے پھر اپنے گھروں میں واپس آئے۔

مکہ کے لوگ اب بھی آنحضرتؐ کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے۔ گلی کوچوں میں آپؐ کا مذاق اڑاتے اور گھر کے دروازے کے سامنے کانٹے بچھا دیتے۔ یہ کافر آپؐ کو پاگل اور جادوگر کہتے اور لوگوں کو آپؐ کی باتیں سننے سے منع کرتے۔

طائف کا سفر

مکہ کے لوگوں نے جب اپنے طرزِ عمل سے رسول پاکؐ کو مایوس کر دیا تو آپؐ مکہ کو چھوڑ کر شہر طائف چلے گئے جو مکہ سے چالیس میل دُور ایک پہاڑی مقام ہے۔ آپؐ نے وہاں کے لوگوں کو بھی سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن طائف کے لوگ مکہ والوں سے بھی زیادہ سنگ دل ثابت ہوئے۔ انھوں نے آپؐ کا مذاق اڑایا اور پتھر مار مار کر شہر سے نکال دیا۔ مجبوراً آپؐ کو مکہ واپس آنا پڑا۔

مکہ واپس آنے کے بعد جلد ہی آپؐ کے چچا ابو طالب اور آپؐ کی بیوی حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا۔ یہ دونوں رسول پاکؐ کا بہت بڑا سہارا تھے۔ ان کی وفات سے آپؐ کو اتنا صدمہ پہنچا کہ تاریخ اسلام میں یہ سال جس میں حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کا انتقال ہوا، عام الحزن یعنی غم کا سال کہلاتا ہے۔

مدینہ میں اسلام کی اشاعت

لیکن طائف سے واپسی کے بعد مسلمانوں کے دن جلد ہی پھر گئے۔ اللہ نے اپنے رسولؐ

اور ان کے ساتھیوں کی محنت اور قربانیوں کا صلہ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ مکہ سے ساڑھے تین سو میل شمال میں ایک شہر ہے جس کو اب مدینہ کہتے ہیں لیکن اُس زمانہ میں یثرب کہتے تھے۔ یہاں کے لوگ آج کی طرح اُس وقت بھی نرم دل اور خوش اخلاق تھے۔ اُس زمانے میں مدینہ میں بت پرستوں کے علاوہ یہودی بھی آباد تھے جو اللہ اور اُس کے نبیوں پر ایمان رکھتے تھے اور ایک نبی کے آنے کا انتظار کررہے تھے اور شہر کے عربوں سے بھی اس بات کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ مدینہ کے عربوں کو جب اطلاع ملی کہ مکہ میں ایک شخص نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو انھوں نے تصدیق کرنے کے لیے ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مکہ بھیجا۔ اس وفد کے لوگوں نے جب رسول پاکؐ سے ملاقات کی تو اُن کو آپؐ کے نبی ہونے کا یقین آ گیا اور انھوں نے آپس میں کہا کہ ''یہ وہی نبی ہیں جن کے بارے میں یہودی پیش گوئی کرتے رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اسلام قبول کرنے کے معاملہ میں ہم سے بازی لے جائیں۔ چنانچہ اس وفد کے لوگوں نے فوراً اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد اگلے دو سالوں میں مدینہ سے اور لوگ بھی آئے اور انھوں نے اسلام قبول کیا۔ مدینہ کے ان مسلمانوں سے رسول پاکؐ نے عہد لیا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، چوری نہیں کریں گے، زنا نہیں کریں گے، اپنے بچوں کو قتل نہیں کریں گے، کسی کے خلاف بہتان نہیں باندھیں گے اور رسول پاکؐ کی کسی معاملہ میں نافرمانی نہیں کریں گے۔ مدینہ کے ان مسلمانوں نے صلح اور جنگ دونوں صورتوں میں رسول پاکؐ کا ساتھ دینے کا عہد کیا۔ یہ عہد تاریخ میں بیعتِ عقبہ اول اور بیعت عقبہ ثانی کہلاتے ہیں۔

اس کے بعد مدینہ میں اسلام تیزی سے پھیلنا شروع ہوگیا اور اس طرح جو سعادت مکہ اور طائف کے لوگوں کو حاصل نہ ہوسکی وہ مدینہ کے لوگوں نے حاصل کرلی۔ رسول پاکؐ نے مدینہ کے لوگوں کو اسلام کی تعلیم دینے کے لیے ایک صحابی حضرت مصعب بن عمیرؓ کو مکہ سے روانہ کیا جن کی کوششوں سے شہر کے بیشتر لوگوں نے اسلام بھی قبول کرلیا اور اسلامی تعلیمات سے واقفیت بھی حاصل کرلی۔

مدینہ میں اسلام پھیلنے کے بعد مسلمانوں کو ایک ایسی جگہ مل گئی جہاں مسلمان کافروں کے ظلم سے پناہ لے سکتے تھے اور اللہ کے احکام پر آزادی سے عمل کرسکتے تھے۔ مدینہ کے مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اپنے ساتھ مدینہ لے جانا چاہتے تھے لیکن آپ نے اس معاملہ

میں اللہ کے حکم کا انتظار کیا۔ اس دوران میں مکہ کے مسلمانوں کو مدینہ چلے جانے کی ہدایت کی۔ چنانچہ مکہ کے تقریباً تمام مسلمان ایک ایک کر کے مدینہ چلے گئے۔ صرف رسول پاکؐ، آپؐ کے دوست حضرت ابوبکرؓ دو چار مسلمان جن میں آپؐ کے چچازاد بھائی حضرت علیؓ شامل تھے مکہ میں رہ گئے۔

ہجرت مدینہ

جب تمام مسلمان مدینہ چلے گئے تو اللہ کی طرف سے آنحضرتؐ کو بھی مدینہ چلے جانے کا حکم ملا۔ کافروں کو جب اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے آپؐ کو جان سے مار ڈالنے کا فیصلہ کیا اور ایک رات کو آپؐ کے گھر کے دروازہ پر تلواریں لے کر جمع ہو گئے۔ اُن کا منصوبہ تھا کہ جب آنحضرتؐ سو جائیں گے تو گھر میں گھس کر ان کو قتل کر دیں گے۔ حضرت علیؓ بھی جن کی عمر اس وقت بائیس سال تھی، آپؐ کے ساتھ گھر ہی میں تھے۔

ہم پڑھ چکے ہیں کہ مکہ کے لوگ اپنی امانتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رکھواتے تھے۔ یہ امانتیں اس وقت بھی آپؐ کے پاس تھیں۔ آنحضرت نے یہ امانتیں حضرت علیؓ کے سپرد کر کے ان کو ہدایت کی کہ آپؐ کے مدینہ جانے کے بعد وہ اُن کو اُن کے مالکوں کو واپس کر کے مدینہ آ جائیں۔ اس کے بعد آپؐ نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سُلا دیا اور خود گھر سے باہر نکل گئے۔ باہر کافروں کو اونگھ آ گئی تھی جس کی وجہ سے اُن کو آپؐ کے باہر نکلنے کی مطلق خبر نہیں ہوئی۔ گھر سے نکلنے کے بعد آپؐ سب سے پہلے اپنے دوست حضرت ابوبکرؓ کے گھر گئے اور ان کو ساتھ لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کافروں کی آنکھ جب کھلی تو وہ گھر میں داخل ہو گئے۔ لیکن بستر پر آنحضرتؐ کی جگہ حضرت علیؓ کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

مکہ کے کافروں کو اپنا منصوبہ ناکام رہ جانے کا بڑا افسوس ہوا۔ انھوں نے آپؐ کا پیچھا کرنے کی کوشش کی اور یہ اعلان بھی کر دیا کہ جو شخص رسول پاکؐ اور حضرت ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا اس کو ایک سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے۔ لیکن کافروں کے دُوسرے منصوبوں کی طرح یہ کوشش بھی ناکام ثابت ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ تین دن تک ایک غار میں جو غارِ ثور کہلاتا تھا اور مکہ سے صرف تین میل دُور تھا، تین دن تک چھپے

رہنے کے بعد مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

رسول پاکؐ کے روانہ ہونے کی اطلاع مدینہ کے لوگوں کو پہلے سے ہوگئی تھی اس لیے وہ آپ کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ رسول پاکؐ کئی دن کے سفر کے بعد جب مدینہ پہنچے تو لوگوں نے شہر سے باہر نکل کر آپؐ کا پُرجوش استقبال کیا۔ فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ عورتیں آپؐ کو دیکھنے کے لیے گھروں کی چھتوں پر پہنچ گئیں اور چھوٹی بچیوں نے گیت گا گا کر آپؐ کا خیر مقدم کیا۔ بعد میں حضرت علیؓ بھی مدینہ پہنچ گئے۔ مدینہ جو اب تک یثرب کہلاتا تھا۔ رسول پاکؐ کے آ جانے کے بعد اس کا نام مدینۃ النبی یعنی نبی کا شہر ہو گیا۔ لفظ مدینہ اسی مدینۃ النبیؐ کی مختصر شکل ہے۔
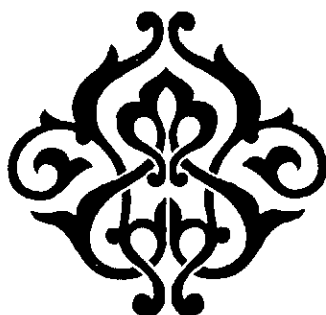
باب ۴

آخری نبیؐ۔(۲)

(مدینہ کی زِندگی)

رسول پاکؐ اور مسلمانوں کے مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے جانے کے واقعہ کو ''ہجرت'' کہا جاتا ہے۔ یہ ہجرت اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ اور ایک اہم موڑ ہے۔ اب مسلمانوں کو مدینہ میں ایک پناہ گاہ مل گئی اور ان کی مظلومیت، مصیبت اور بے بسی کے دن ختم ہو گئے۔ اب مسلمان آزادی کے ساتھ اللہ کی عبادت کر سکتے تھے اور اُس کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال سکتے تھے۔ وہ مسلمان جو اس سے پہلے ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے اب وہ بھی مدینہ آ گئے جو اب دارالاسلام بن چکا تھا۔

مسجد نبویؐ کی تعمیر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچنے کے بعد سب سے پہلے دو اہم کام کیے۔ پہلے ایک مسجد کی بنیاد ڈالی گئی۔ یہ مسجد جو آج دنیا کی عظیم الشان عبادت گاہوں میں شمار ہوتی ہے اس وقت لکڑی اور پھوس وغیرہ کی بنی ہوئی ایک معمولی عمارت تھی جس کا فرش بھی پختہ نہیں تھا۔ شہر کی طرح یہ مسجد بھی آخری نبیؐ کی نسبت سے مسجد نبویؐ کہلاتی ہے۔ یہ مسجد صرف عبادت کے لیے مخصوص نہیں تھی بلکہ مدینہ کی شہری زندگی کا ایک اہم مرکز تھی۔ یہاں مسلمانوں کو اسلامی احکام سکھائے جاتے تھے، رسول پاکؐ اُن کے آپس کے جھگڑوں کو طے کرتے تھے اور مسلمانوں پر اثر انداز ہونے والے امور کے بارے میں مسلمانوں سے صلاح مشورہ کرتے تھے۔ نماز کی اطلاع دینے کے لیے اذان دینے کا طریقہ بھی اسی زمانہ میں شروع ہوا اور یہ کام حضرت بلال حبشیؓ کے سپرد کیا گیا، جنھوں نے اسلام کی خاطر بڑی قربانیاں دی تھیں اور جن کی آواز اتنی دلکش تھی کہ جب وہ اذان دیتے تھے تو لوگ سننے کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔

اخوت کا نظام

دوسرا اہم کام جو مدینہ پہنچ کر کیا گیا وہ ''اخوت'' یعنی بھائی چارہ کا نظام تھا۔ مکہ سے جو مسلمان مدینہ آئے ان کو ''مہاجر'' کا نام دیا گیا یعنی وہ لوگ جنھوں نے ہجرت کی۔ اسی طرح مدینہ کے مسلمانوں کو ''انصار'' کا نام دیا گیا یعنی وہ لوگ جنھوں نے مدد کی۔ مہاجر چونکہ کافروں سے چھپ کر نکلے تھے اس لیے اپنے ساتھ کچھ نہ لا سکے تھے۔ اپنا گھر اور اُس کی ہر چیز مکہ ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مہاجر کو ایک انصار کے سپرد کر دیا اور کہا یہ تمھارا بھائی ہے۔ انصار نے بھی ان کو اپنے حقیقی بھائیوں کی طرح سمجھا اور اپنی جائداد تک میں ان کو شریک کر لیا۔ اخوت کا یہ نظام ایک انقلابی قدم تھا۔ قبائلی تعصب کے اُس زمانے میں جب ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کو رعایت دینے کے لیے تیار نہ تھا، اخوت کے نظام نے نہ صرف مکہ اور مدینہ کے لوگوں کو شیر و شکر کر دیا بلکہ بے گھر اور اُجڑے ہوئے لوگوں کا مسئلہ بھی حل کر دیا۔

مدینہ پہنچنے کے بعد رسول پاکؐ نے تیسرا اہم قدم یہ اٹھایا کہ مدینہ کے مسلمانوں، یہودیوں اور مشرکوں پر مشتمل ایک سیاسی نظام کی بنیاد ڈالی جس کو ہم مدینہ کی شہری مملکت یا اسلامی ریاست بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ایک تحریری معاہدہ بھی کیا گیا جس کو دنیا کا پہلا تحریری دستور[1] کہا جاتا ہے۔ اس معاہدہ یا دستور کے تحت یہودیوں اور مدینہ کے مشرکوں کے ساتھ سیاسی اتحاد قائم کیا گیا تھا جس میں بالادستی اسلام اور مسلمانوں کو حاصل تھی۔ جدید اصطلاح میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مدینہ کی اسلامی ریاست میں غیر مسلم گروہوں کو اندرونی خودمختاری حاصل تھی۔

مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کامیابیاں اور اسلام کی مضبوطی مکہ کے کافروں کو سخت ناگوار گزری اور انھوں نے فوجی کاروائی کے ذریعہ مسلمانوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد سے انھوں نے مدینہ پر تین مرتبہ چڑھائی کی، لیکن کثرت تعداد کے باوجود ہر مرتبہ ناکام رہے۔[2]

---

(۱) اس دستور کی تفصیل کے لیے دیکھیے ''عہد نبویؐ کا نظام حکمرانی'' از ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی۔

(۲) عہد رسالت کی لڑائی کا فنی جنگ کے نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے کے لیے ملاحظہ کیجیے ''عہد نبویؐ کے میدان جنگ'' از ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی۔

مدینہ پر قریش کے حملے

ان لڑائیوں میں پہلی ''غزوۂ بدر'' کہلاتی ہے۔ کیونکہ یہ جنگ مدینہ کے شمال میں اسی میل دور بدر کے مقام پر ہوئی تھی۔ اس جنگ میں صرف تین سو تیرہ مسلمانوں نے ایک ہزار ایک سو کافروں کو شکست دی۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن اور کافروں کا سردار ابوجہل اس جنگ میں مارا گیا۔

دوسری لڑائی ''غزوۂ اُحد'' کہلاتی ہے۔ اس میں سات سو مسلمانوں نے تین ہزار کافروں کا مقابلہ کیا۔ اس مرتبہ کافروں کا سردار ابوسفیان تھا۔ اس جنگ میں رسول پاکؐ کے چچا حضرت حمزہؓ شہید ہوگئے اور رسول پاکؐ کو بھی زخم آئے۔ لیکن کافر مدینہ پر حملہ کرنے کی ہمت نہ کر سکے اور واپس چلے گئے۔ اُحد مدینہ کے شمال میں دو میل دور ایک پہاڑ کا نام ہے جس کے دامن میں یہ جنگ ہوئی تھی۔

تیسری بڑی لڑائی غزوۂ خندق یا غزوۂ اَحزاب کہلاتی ہے۔ اس موقع پر مکہ کے کافروں نے عرب کے کئی قبیلوں کی مدد اور یہودیوں کے تعاون سے مدینہ کا محاصرہ کرلیا تھا اور شہر کو بچانے کے لیے مسلمانوں نے خندق کھودلی تھی۔ دفاع کے لیے خندق کھودنے کا طریقہ عربوں نے ایک ایرانی صحابی حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ پر پہلی مرتبہ اسی جنگ میں اختیار کیا۔ اس موقع پر بھی کافروں کا سردار ابوسفیان تھا۔

غزوۂ احزاب کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کرنے کا ارادہ کیا۔ عرب میں پرانے زمانہ سے یہ رواج چلا آتا تھا کہ حج کے زمانہ میں لڑائیاں بند کردی جاتی تھیں اور عرب کے ہر حصہ کے لوگ بغیر کسی پابندی کے حج کر سکتے تھے۔ لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار چار سو مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے حُدَیبیہ کے مقام پر آپ کو اطلاع ملی کہ کافر جنگ کی تیاری کر رہے ہیں اور وہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کو یقین دلایا کہ لڑنے کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ حج کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن کافر اپنی ضد پر اڑے رہے اور مسلمانوں کو حج نہیں کرنے دیا۔ آخرکار مکہ کے کافروں اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا جو صلح حُدیبیہ کہلاتا ہے۔ اس معاہدہ کے تحت

یہ طے پایا کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں اور اگلے سال حج کے لیے آئیں۔ معاہدہ کی بعض شرطیں ایسی بھی تھیں جو بظاہر مسلمانوں کے لیے نقصان دہ تھیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امن وصُلح اور اُس کے دُور رس نتائج کی خاطر یہ شرطیں منظور کر لی تھیں۔ معاہدہ ہو جانے کے بعد مسلمان مدینہ واپس آ گئے۔

حضرت خالد کا قبول اسلام

صلح حدیبیہ اگرچہ دب کر ہوئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کو فتح سے تعبیر کیا ہے اور نتیجہ کے اعتبار سے یہ واقعی فتح ثابت ہوئی۔ صلح سے پہلے مسلمان کافروں سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ اب صُلح کے بعد دونوں میں میل جول شروع ہو گیا۔ مسلمانوں کے اخلاق اور نیک عمل سے متاثر ہو کر کافر کثرت سے مسلمان ہونا شروع ہو گئے۔ چنانچہ اگلے دو سال میں جس کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے اتنے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں اسلام لانے والوں میں حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عمروؓ بن عاص کے نام سب سے نمایاں ہیں۔ یہ دونوں بڑے اچھے سپہ سالار تھے اور انھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد حیرت انگیز جنگی کارنامے انجام دیئے اور فتوحات حاصل کیں۔

اسلام کا پیغام کسی ایک قوم یا علاقے کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی پیغام ہے اور پوری بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ جب مدینہ اور عرب کے مختلف حصوں میں اسلام کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایران، روم، مصر اور حبش کے بادشاہوں کو خطوط لکھے اور اُن کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ حبش کے بادشاہ نجاشی نے خط ملنے پر اسلام قبول کر لیا، روم کے بادشاہ ہرقل اور مصر کے رومی گورنر مقوقس نے اسلام تو قبول نہیں کیا لیکن آپ کے بھیجے ہوئے قاصدوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ ہرقل کو آپؐ کے نبی ہونے کا یقین ہو گیا تھا اور وہ دل میں مسلمان ہو گیا تھا، لیکن عیسائی آبادی کے ڈر سے اپنے اسلام کا اعلان نہ کر سکا۔ (1) اس کے برخلاف ایران کا بادشاہ خُسرو پرویز بڑا مغرور ثابت ہوا۔ اس

---

(1) آنحضرت کا خط جب ہرقل کو ملا اُس وقت وہ شام آیا ہوا تھا۔ مکہ کے کافروں کے سردار ابوسفیان جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے شہر میں موجود تھے۔ ہرقل نے ان کو بلا کر آنحضرتؐ کی صداقت کے بارے میں جو گفتگو کی اس کے لیے ملاحظہ کیجیے ''خطباتِ مدراس'' از سید سلیمان ندوی، چوتھا خطبہ ص ۸۷ و ص ۹۰ مطبوعہ ۹۴ء اعظم گڑھ۔

نے آپ کے بھیجے ہوئے خط کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپؐ نے فرمایا کہ خسرو کی سلطنت بھی اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ ہم اگلے صفحات میں پڑھیں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی کس طرح حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

یہودیوں کی سازشیں

خیبر کی فتح کا واقعہ بھی صلح حدیبیہ کے بعد پیش آیا۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ اسلام سے پہلے مدینہ میں مشرک عربوں کے علاوہ یہودی قبیلے بھی آباد تھے۔ یہ یہودی اگرچہ ایک نبی کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے لیکن وہ یہ اُمید کرتے تھے کہ آخری نبی یہودیوں میں ہوگا۔ جب ایسا نہیں ہوا تو سوائے چند نیک دل یہودیوں کے باقی آبادی نے تمام نشانیوں کے باوجود آپؐ کو نبی ماننے سے انکار کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر اگرچہ یہودیوں سے ایک معاہدہ کر لیا تھا اور ان کو اپنا حلیف بنا لیا تھا لیکن مدینہ کے یہودی در پردہ اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کرتے رہے۔ انھوں نے مکہ کے کافروں سے ساز باز کی اور رسول پاکؐ کو شہید کرنے کی کوشش بھی کی۔ معاہدہ کی اس طرح خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے خلاف کاروائی کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہودیوں کی ایک تعداد قتل کر دی گئی اور باقی کو مدینہ سے نکال دیا گیا۔ اب یہ یہودی قبیلے مدینہ سے تقریباً ایک سو میل شمال میں خیبر کے نخلستانوں میں آباد ہو گئے جہاں کئی یہودی قبیلے پہلے سے آباد تھے اور انھوں نے بڑے بڑے قلعے بنا رکھے تھے۔

یہودیوں نے مدینہ سے نکلنے کے بعد بھی مسلمانوں کی مخالفت نہیں چھوڑی اور مکہ کے کافروں سے مل کر مسلمانوں کے خلاف بدستور سازشیں کرتے رہے۔ چنانچہ خندق کی لڑائی کے لیے عرب کے کافروں کو خیبر کے ان ہی یہودیوں نے تیار کیا تھا۔ یہودیوں کے اس خطرے کو دور کرنے کے لیے صلح حدیبیہ کے ایک سال بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں کے خلاف کاروائی کی اور اس علاقے کو مدینہ کی اسلامی مملکت میں شامل کر لیا۔ خیبر کی اس لڑائی میں حضرت علیؓ نے یہودیوں کے سب سے بڑے بہادر اور سورما ''مرحب'' کو قتل کر کے اور ایک مضبوط قلعہ کو فتح کر کے بڑا نام پیدا کیا۔

فتح مکہ

صلح حدیبیہ کے بعد ان مسلسل کامیابیوں کے نتیجے میں مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور وہ اس قابل ہو گئے کہ مکہ کے کافروں سے دبنے کی بجائے ان کے خلاف کاروائی کر سکیں۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے دو سال بعد جب مکہ کے لوگوں نے مسلمانوں سے کیا ہوا معاہدہ منسوخ کر دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار مسلمانوں کو لے کر مکہ فتح کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ مسلمانوں کو اتنی بڑی تعداد میں دیکھ کر کافروں کے ہوش اڑ گئے اور انھوں نے شہر کو بغیر مقابلے کے مسلمانوں کے سپرد کر دیا۔ اس طرح رسول پاکؐ اور وہ صحابہؓ جن کو آٹھ سال پہلے مکہ چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا تھا فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ میں داخل ہو کر اُس کو بتوں سے صاف کیا اور اسے پھر ایک اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص کر کے حضرت ابراہیمؑ کی روایت کو زندہ کر دیا۔

فتح مکہ کے بعد آپؐ چاہتے تو ان کافروں کو سخت سزائیں دے سکتے تھے جنھوں نے آپؐ کو اور مسلمانوں کو طرح طرح سے ستایا تھا۔ لیکن رسول پاکؐ نے کسی کو کوئی سزا نہیں دی اور عام معافی کا اعلان کر دیا حتیٰ کہ اس حبشی کو بھی معاف کر دیا جس نے آپؐ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اُحد کی جنگ میں شہید کر دیا تھا۔ اور اپنے سب سے بڑے دشمن ابوسفیان اور ان کی بیوی ہندہ کو بھی معاف کر دیا۔ یہ ہندہ وہ عورت تھی جس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کو چیر پھاڑ کر ان کا کلیجہ اپنے دانتوں سے چبایا تھا۔

مکہ کی یہ پُرامن فتح نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ تاریخ عالم کا ایک زریں باب ہے۔ تاریخ نے اس سے پہلے کبھی کسی ایسے فاتح کو نہیں دیکھا تھا جو دشمنوں پر فتح حاصل ہونے کے بعد ان کو اس طرح معاف کر دے اور ان کے کیے ہوئے ظلم و ستم کی سزا نہ دے۔ آپؐ کے اس حُسنِ سلوک کا نتیجہ یہ نکلا کہ قریش کے سردار ابوسفیان اور اس کی بیوی ہندہ اسلام کی صداقت کے آگے سر جھکانے پر مجبور ہو گئے اور دونوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ہندہ مسلمان ہونے کے بعد کہا کرتی تھی کہ مسلمان ہونے سے پہلے محمدؐ سے زیادہ کسی سے نفرت نہیں تھی اور اب محمدؐ سے زیادہ محبوب میرے لیے کوئی نہیں۔

رسول پاکؐ مکہ میں کچھ دن رہنے اور ضروری کاروائیاں کرنے کے بعد مدینہ واپس

آ گئے۔ آپؐ نے مکہ میں پھر رہائش اختیار نہیں کی، کیونکہ آپؐ مدینہ کے انصار سے یہ عہد کر چکے تھے کہ وہ انصار کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔

مکہ پر مسلمانوں کا قبضہ اسلام کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ عرب کے لوگ قریش کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور وہ قریش کے کافروں اور مسلمانوں کی کشمکش کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے، جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمان اس جنگ میں غالب آ گئے اور مکہ کے قریش ہار گئے تو ان کو اسلام کی صداقت کا یقین آ گیا۔ عرب کے ہر حصے سے قبیلوں کے سردار اور عوام و خواص مدینہ آ آ کر اسلام قبول کرنے لگے اور دو سال کے عرصہ میں سارا عرب مسلمان ہو گیا۔ ۲۳ سال پہلے سارا ملک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن تھا یا اب آپ عرب جیسے بڑے ملک کے حکمران تھے، جو رقبہ میں پاکستان سے کئی گناہ بڑا اور ہندوستان کے برابر ہے۔

حجۃ الوداع

۱۰ ہجری میں یعنی فتح مکہ کے دو سال بعد اور مدینہ آنے کے دس سال بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کرنے کا ارادہ کیا۔ مسلمانوں کو جب آپؐ کے اس ارادے کا پتہ چلا تو وہ عرب کے ہر حصے سے مدینہ پہنچنا شروع ہو گئے تا کہ رسول خداؐ کے ساتھ حج کرنے کی سعادت حاصل کر سکیں۔ اندازہ ہے کہ اس موقع پر ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں نے حج کیا۔

حج کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تقریر کی جو خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ یہ خطبہ انسانی حقوق کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ:

''آج عہد جاہلیت کے تمام دستور اور طور طریقے ختم کر دیئے گئے۔ خدا ایک ہے اور تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور وہ سب برابر ہیں۔ عربی کو عجمی اور عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ اگر کسی کو فضیلت ہے تو نیک کام کی وجہ سے ہے۔ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں''

اس خطبہ میں رسول پاکؐ نے انتقام کے طریقے کو، جس کا عہد جاہلیت میں رواج تھا اور جس کی وجہ سے نسلاً بعد نسلِ خاندانوں میں دشمنی چلی جاتی تھی اور سودی کاروبار کو سختی سے منع کیا۔ عورتوں اور غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید کی۔ آپؐ نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ

وہ اللہ کی کتاب یعنی قرآن مجید کو مضبوطی سے پکڑے رہیں تا کہ گمراہ نہ ہوں۔

آخر میں آپؐ نے مجمع کو مخاطب کر کے پوچھا:

''تم سے اللہ کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟''

مسلمانوں نے ایک آواز سے کہا:

''ہم کہیں گے کہ آپؐ نے خدا کا پیغام ہم تک پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا''

اس پر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا:

''اے خدا گواہ رہنا، اے خدا گواہ رہنا، اے خدا گواہ رہنا''

ٹھیک اس وقت جب آپؐ یہ الفاظ کہہ رہے تھے یہ آیت نازل ہوئی:

الیوم اکملتُ لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔

یعنی آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمھارے لیے دین اسلام کا انتخاب کر لیا۔

وفات

اس میں شک نہیں کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اپنا فرض ادا کر چکے تھے اور اسلام کا پیغام مکمل ہو چکا تھا۔ آپؐ نے یہ فرض ناسازگار حالات میں ادا کیا اور ہر قسم کی مصیبتوں اور مشکلات کا مقابلہ کیا۔ ۲۳ سال پہلے یا تو وہ وقت تھا کہ لوگ آپؐ کی بات نہیں سنتے تھے اور آپؐ کی جان کے دشمن ہو گئے تھے یا اب سارے عرب کے لیے آپؐ کا ایک ایک لفظ حکم کی حیثیت رکھتا تھا اور ہر شخص آپؐ پر اپنی جان قربان کر دینے کے لیے تیار تھا۔ یا تو ۲۳ سال پہلے عرب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہتے تھے اور ہر طرف بدامنی، قتل و غارت اور لوٹ مار عام تھی یا اب وہ اپنے تمام اختلافات بھلا کر شیر و شکر ہو چکے تھے۔ قتل، لوٹ مار اور بدامنی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ بت پرستی کی جگہ توحید نے لے لی تھی۔ خاندان اور قبیلہ پر فخر و غرور، نسل پرستی اور وطن پرستی کی جگہ انسانی اخوت نے لے لی تھی۔ یہ نئی ''ملت اسلامیہ'' انسانی اخوت کا ایک مثالی نمونہ تھی۔

یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا جو عرب کی سرزمین میں آیا تھا۔ اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں

نہیں ملے گی۔

حج کرنے کے بعد رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس آ گئے اور تقریباً تین ماہ بعد آپ نے وفات پائی۔ مسجد نبویؐ کے ساتھ جس کمرے میں آپؐ رہتے تھے اسی میں دفن کیے گئے۔ یہ ہجرت کا گیارھواں سال تھا، ربیع الاول کی ۱۲ تاریخ اور دن پیر کا تھا۔ آپؐ کی عمر اس وقت ۶۳ سال تھی۔

سیرت نبویؐ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال تک اسلام کی تبلیغ کی، تیرہ سال مکہ میں اور دس سال مدینہ میں۔ مکہ میں آپؐ کو قدم قدم پر تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن آپؐ نے بے مثال ثابت قدمی سے ان تمام مشکلات کا مقابلہ کیا۔ اپنی جان خطرہ میں ڈال دی لیکن باطل کے آگے سر نہیں جھکایا اور اپنی دعوت جاری رکھی۔ مدینہ پہنچنے کے بعد جب مصیبتوں کا زمانہ ختم ہو گیا اور وہ وقت بھی آ گیا جب آپؐ پورے عرب کے حکمران بن گئے تو بھی آپؐ کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اب اگر آپؐ چاہتے تو ایک بادشاہ کی طرح زندگی گزار سکتے تھے لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا۔ مدینہ پہنچ کر بھی عام مسلمانوں کی طرح سادہ زندگی گزاری۔ نہ محل بنایا نہ نوکر غلام رکھے۔ آخر وقت تک آپؐ ایک ایسے مکان میں رہتے تھے جو ایک جھونپڑے سے زیادہ نہیں تھا۔ زمین پر سو جاتے تھے یا ایسی چارپائی پر جس پر بعض اوقات بستر تک نہیں ہوتا تھا۔ آپ کا سارا وقت یا تو اللہ کی عبادت میں صرف ہوتا یا لوگوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں۔ دن میں زیادہ تر روزے سے رہتے اور رات کا بڑا حصہ عبادت میں گزرتا۔ رات میں نماز کے لیے مسلسل کھڑے رہنے سے پاؤں تک سوج جاتے تھے۔ (۱)

(۱) بعض غیر مسلم سمجھتے ہیں کہ رسول پاکؐ مدینہ آ کر بادشاہ ہو گئے تھے اور یہ بات نبوت کی شان کے خلاف ہے۔ اُس زمانہ میں بھی بعض لوگوں کا یہی خیال تھا۔ چنانچہ یمن کے ایک عیسائی سردار حاتم طائی (جس کی سخاوت کے قصے مشہور ہیں) کے صاحبزادے حضرت عدیؓ کا بھی یہی حال تھا۔ لیکن جب وہ اپنی بہن کے کہنے سے رسول پاکؐ کی خدمت میں مدینہ پہنچے تو آپؐ کی سادگی اور اخلاق کو دیکھ کر آپؐ کی نبوت پر ایمان لے آئے اور مسلمان ہو گئے۔ حضرت عدیؓ کو یقین ہو گیا تھا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ عرب کے حکمران ہیں لیکن آپ کی زندگی اور اخلاق بادشاہوں جیسا نہیں ہے بلکہ نبیوں جیسا ہے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن مجید کا عملی نمونہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی زندگی کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے یعنی زندگی گزارنے کا سب سے اچھا نمونہ۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی زندگی کا کوئی پہلو چھپا ہوا نہیں تھا۔ بیویوں تک کو ہدایت تھی کہ آپؐ کے ظاہر اور پوشیدہ ہر فعل سے مسلمانوں کو باخبر رکھیں تاکہ وہ اپنی زندگی بھی اسی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے اور سچے مسلمان ہر زمانہ میں اور ہر دور میں آپؐ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات تاریخ عالم میں کسی دوسرے انسان کو نصیب نہیں ہو سکی۔ یہ آپؐ کی زندگی کا ایسا پہلو ہے جس سے نہ صرف آپؐ کی عظمت ظاہر ہوتی ہے بلکہ صداقت بھی۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کو ایسا کام کرنے کا حکم نہیں دیا جس کو آپ خود نہ کرتے ہوں۔ پہلے آپؐ خود عمل کرتے تھے اس کے بعد دوسرے کو عمل کرنے کی ہدایت کرتے تھے۔ طبیعت میں بے انتہا رحمدلی تھی۔ جنگوں میں حصہ لیا لیکن اپنے ہاتھ سے کبھی کسی کو قتل نہیں کیا۔ خوش مزاج اور ہنس مکھ تھے۔ کبھی کسی پر غصہ نہیں ہوتے تھے۔ بچوں سے خاص طور پر بہت پیار کرتے تھے۔ آپؐ کے سامنے امیر اور غریب سب برابر تھے اور ایک غریب بڑھیا کی بات بھی اسی توجہ سے سنتے تھے جس توجہ سے بڑے بڑے سرداروں کی بات سنتے تھے۔

اہل وعیال

اسلام میں نیک عمل کے لیے دنیا ترک کرنا ضروری نہیں ہے جیسا کہ بدھ مت، عیسائیت اور ہندو مذہب میں ہے اور جس کی وجہ سے رہبانیت کو ترقی ہوئی۔ ایک راہب دنیا کی ذمہ داریوں سے بچتا ہے اور نیکی کی تلاش میں جنگلوں اور ویرانوں کا رُخ کرتا ہے۔ شادی کرنا اس کے نزدیک نفس پرستی کی ایک شکل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرز عمل کو غلط قرار دیا۔ آپؐ نے بتایا کہ نیک عمل اور دنیا کی زندگی کا ایک دوسرے سے قریبی تعلق ہے۔ اگر ہم دنیا کے کام اس طرح کریں کہ خدا کی رضا حاصل ہو تو وہ نیکی ہے اور اگر ہم یہی کام اس طرح کریں کہ خدا ناراض ہو تو وہ بدی ہے۔ شادی بیاہ اور خاندانی زندگی گزارنا ایک صحت مند معاشرہ کے لیے ضروری ہے اور بیوی اور بچوں کے فرائض ادا کرنا بھی نیکی ہے۔ چنانچہ آپؐ نے اپنی زندگی میں کئی شادیاں

کیں۔ جب تک حضرت خدیجہؓ زندہ رہیں تو آپؐ نے کوئی شادی نہیں کی۔ لیکن اُن کی وفات کے بعد مدینہ میں کئی شادیاں کیں جن میں حضرت عائشہؓ کے علاوہ باقی تمام بیوہ خواتین تھیں۔ آپ کی بیویوں کو امہات[1] المومنین یعنی مسلمانوں کی مائیں قرار دیا گیا ہے۔ بعض غیر مسلم موزخین نے اتنی شادیاں کرنے پر طرح طرح کے اعتراض کیے ہیں اور آپؐ کے اس فعل کو نعوذ باللہ نفس پرستی اور عیاشی سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن یہ اعتراضات ان مورخین کی تنگ نظری اور بدنیتی کو ظاہر کرتے ہیں۔ موجودہ دَور سے پہلے ایک سے زیادہ شادی کرنے کو کبھی عیب نہیں سمجھا گیا اور اسلام میں ایک سے زیادہ شادی کی اجازت دی گئی ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مصلحتوں کے تحت ایک سے زیادہ شادیاں کی تھیں۔ ایک انسان جو دن کو روزے رکھتا ہو اور رات کا بیشتر حصہ عبادت میں گزارتا ہو، جو شراب اور کباب سے پرہیز کرتا ہو، جس کی زندگی میں موسیقی اور رقص وسرود کو دخل نہ ہو اور جس کی غذا روکھے سوکھے کھانوں پر مشتمل ہو، اُس پر نفس پرستی کا الزام لگانا حق وصداقت کا خون کرنا ہے۔

امہات المومنین میں حضرت خدیجہؓ کے بعد سب سے زیادہ شہرت حضرت عائشہؓ کو حاصل ہوئی۔ وہ علمی حیثیت سے بہت بلند مرتبہ رکھتی تھیں اور رسول پاکؐ کی زندگی کے حالات اور آپؐ کی احادیث کا بہت بڑا حصہ ہمیں حضرت عائشہؓ کے ذریعہ ہی پہنچا ہے۔ آپؓ کی وفات ۵۷ھ میں ہوئی۔

ان ازواج مطہرات کے علاوہ ایک حضرت ماریہ قبطیہؓ تھیں۔ جن کو والی مصر نے بطور لونڈی آپؐ کی خدمت میں بھیجا تھا۔

---

(۱) امہات المومنین کے نام یہ ہیں:

۱۔ حضرت خدیجہؓ۔ ۲۔ حضرت سوداؓ۔ ۳۔ حضرت عائشہؓ۔ ۴۔ حضرت حفصہؓ جو حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھیں اور ۴۵ھ میں وفات پائی۔ ۵۔ حضرت زینبؓ جو فقیروں اور مسکینوں کی مدد کرنے کی وجہ سے ام المساکین کہلاتی ہیں۔ شادی کے دو تین ماہ بعد ہی ۳ھ میں انتقال ہو گیا۔ ۶۔ حضرت ام سلمہؓ متوفی ۶۱ھ۔ ۷۔ حضرت زینبؓ بنت جحش متوفی ۲۰ھ۔ ۸۔ حضرت جویریہؓ متوفی ۵۰ھ۔ ۹۔ حضرت ام حبیبہؓ متوفی ۴۴ھ۔ ۱۰ حضرت میمونہؓ متوفی ۵۱ھ۔ ۱۱۔ حضرت صفیہؓ متوفی ۵۰ھ۔

رسول پاکؐ چار لڑکیوں (۱) اور دو بیٹوں کے باپ تھے۔ چاروں لڑکیاں حضرت خدیجہؓ سے پیدا ہوئیں۔ ایک صاحبزادے قاسم نبوت سے پہلے پیدا ہوئے لیکن بچپن میں انتقال کر گئے۔ دوسرے صاحبزادے ابراہیم ۸ ہجری میں ماریہ قبطیہؓ سے پیدا ہوئے لیکن ان کا بھی سوا دو مہینے کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

قرآن مجید

اسلامی تعلیمات کا پہلا اور سب سے بڑا ماخذ قرآن مجید ہے جو قیامت تک مسلمانوں کے لیے کتاب ہدایت ہے۔ یہ اللہ کا کلام ہے جو حضرت جبریلؑ کے ذریعہ اور وحی کی شکل میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ قرآن کا انداز بیان رسول پاکؐ کے خطبوں اور احادیث سے بالکل مختلف ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن، رسول پاکؐ کا کلام نہیں جیسا کہ بعض غیر مسلم سمجھتے ہیں۔ قرآن کا انداز کلام اپنی مثال آپ ہے اور قرآن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ کوئی انسان ایک آیت بھی ایسی نہیں لکھ سکتا جو قرآن کے طرز بیان کا مقابلہ کر سکے۔ قرآن نے یہ چیلنج ان عربوں کو دیا تھا جو اپنی زبان دانی کے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن بڑے سے بڑا زبان دان عرب بھی اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکا۔ رسول پاکؐ جب کفار مکہ کے سامنے قرآنی آیات پڑھتے تھے تو وہ اتنی اثر انگیز ہوتی تھیں کہ لوگ مسحور ہو جاتے تھے اور ان آیات کو

(۱) آپؐ کی صاحبزادیوں کے نام یہ ہیں:
۱۔ حضرت زینبؓ۔ سب سے بڑی صاحبزادی تھیں۔ حضورؐ کی زندگی ہی میں ۸ ہجری میں انتقال ہو گیا۔ اُن کی شادی خالہ زاد بھائی ابوالعاص سے ہوئی تھی۔
۲۔ حضرت رقیہؓ: آپؐ کا ۲ ہجری میں انتقال ہوا۔
۳۔ حضرت ام کلثومؓ: حضرت رقیہؓ سے چھوٹی تھیں۔ ۹ ہجری میں انتقال ہوا۔ حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ دونوں کی شادی یکے بعد دیگرے حضرت عثمانؓ سے ہوئی تھی۔
۴۔ حضرت فاطمہؓ۔ رسول پاکؐ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ چونکہ سب سے چھوٹی تھیں اور اُن کے علاوہ سب اولادیں آنحضرتؐ کی زندگی میں انتقال کر گئی تھیں اس لیے آپ حضرت فاطمہؓ سے بہت محبت کرتے تھے۔ حضرت فاطمہؓ کی شادی حضرت علیؓ سے ہوئی جو رسول پاکؐ کے چچا زاد بھائی تھے۔ رسول پاکؐ کے چھ ماہ بعد حضرت فاطمہؓ کا بھی انتقال ہو گیا۔
حضرت رقیہؓ کے اولاد نہیں ہوئی۔ حضرت زینبؓ اور حضرت ام کلثومؓ کے اولاد ہوئی لیکن یا تو بچپن میں چل بسی یا ان کی نسل نہیں چلی۔ حضرت فاطمہؓ کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔ ان میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ آپؐ کے وہ خوش قسمت صاحبزادے ہیں جن کی نسل آج تک چلی آ رہی ہے۔

سحر اور جادو سمجھتے تھے۔ آج بھی قرآن، عربی جاننے والوں کے لیے وہی اثر رکھتا ہے، اور پڑھنے اور سننے والے کو "یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل و فکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب و جگر تک ترتی چلی جارہی ہے"[1]

قرآن مجید کی پہلی آیت غارِ حرا میں اُتری تھی اور آخری حجۃ الوداع کے بعد۔ آج قرآن مجید جس شکل میں ہے یہ ٹھیک وہی شکل ہے جو رسول پاکؐ کے زمانہ میں تھی۔ اگرچہ قرآن اس وقت کتابی شکل میں مرتب نہیں ہوا تھا لیکن اس کی سورتوں کی ترتیب یہی تھی اور بے شمار انسانوں نے رسول پاکؐ کی زندگی ہی میں پورے قرآن کو حفظ کر لیا تھا۔

سنتِ رسولؐ

اسلامی تعلیمات اور اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ سنت رسول صلی اللہ علیہ [illegible] رسول پاکؐ کی ہدایات اور عمل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ قرآنی تعلیمات کا مکمل نمونہ [illegible] اور وہ دوسروں کو ہدایت کرنے سے پہلے خود قرآنی احکام پر عمل کر کے دکھاتے [illegible] نے آپؐ کی ذات کو مسلمانوں کے لیے اُسوۂ حسنہ یعنی سب سے اچھا نمونہ قرار دیا ہے [illegible] میں جگہ جگہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے [illegible] کا حکم مانیں اور اگر کسی بات پر اختلاف ہو تو وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کریں۔

رسول پاکؐ کی احادیث کا کوئی مکمل مجموعہ آپؐ کی زندگی میں مرتب نہیں ہوا تھا [illegible] کہ نہ تو اس زمانے میں کتابیں لکھنے کا رواج تھا اور نہ مسلمان اس کی ضرورت محسوس [illegible] چونکہ رسولؐ کی ذات ہر وقت ان کے درمیان رہتی تھی اس کے باوجود آپؐ کی موجودگی میں کئی صحابہؓ نے کئی مختصر مجموعے لکھ رکھے تھے۔ لیکن چونکہ احادیث قرآنی تعلیم [illegible] کی تشریح و توضیح کا سب سے مستند ذریعہ ہیں اور اسلامی تعلیمات کتاب و سنت کی روشنی ہی میں پوری طرح سمجھی جا سکتی ہیں، اس لیے جیسا کہ ہم آگے پڑھیں گے، بعد میں احادیث کو کتابی شکل میں مرتب کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی اور اُن کے کئی مستند مجموعے تیار کیے گئے۔

---

(1) قرآن مجید کے انداز بیان کی خصوصیات کے لیے دیکھیے مقدمہ تفہیم القرآن جلد اول از [illegible]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اہم واقعات

(مکہ کی زندگی)

سنہ ۵۳ قبل از ہجرت ۹۔ ربیع الاول مطابق ۲۰۔ اپریل ۵۷۱ء پیدائش۔

سنہ ۲۸ قبل از ہجرت حضرت خدیجہؓ سے شادی۔

سنہ ۱ بعثت یا سنہ ۱۳ قبل از ہجرت۔ ۹۔ ربیع الاول مطابق ۱۲۔ فروری ۶۱۰۔ نبوت کا ملنا اور فجر اور عصر کی نماز کا فرض ہونا۔

۶۱۰ء۔ ا بعثت ۱۸۔ رمضان مطابق ۱۷۔ اگست ۶۱۰ء آغاز نزول قرآن۔

سنہ ۵ بعثت۔ رجب ہجرت حبشہ۔

سنہ ۶ بعثت۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا قبول اسلام۔

سنہ ۷ بعثت۔ بنی ہاشم کا مقاطعہ اور شعب ابی طالب میں نظر بندی۔

مقاطعہ کا آغاز یکم محرم کو ہوا اور ۹ سنہ بعثت کے آخر یا سنہ ۱۰ بعثت کے شروع میں خاتمہ ہوا۔

سنہ ۱۰ بعثت۔ سفر طائف، حضرت ابوطالبؓ اور حضرت خدیجہؓ کی وفات اس سال ۲۷۔ رجب کو معراج ہوئی اور پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں۔

سنہ ۱۲ بعثت۔ بیعت عقبہ اولیٰ ذی الحجہ۔

سنہ ۱۳ بعثت۔ بیعت عقبہ ثانی۔ ذی الحجہ۔

۶۲۲ء/ ۱۴ بعثت۔ ہجرت مدینہ ۲۷۔ صفر کو مکہ سے روانگی۔

یکم ربیع الاول مطابق ۱۶۔ ستمبر ۶۲۲ء غار ثور سے روانگی۔ ۸۔ ربیع الاول (۲۳۔ ستمبر ۶۲۲ء) قبا میں آمد۔

۶۲۲/اھ ۱۲۔ ربیع الاول کو مدینہ میں داخلہ۔

مدینہ کی زندگی

۶۲۲ء/۱ھ ربیع الاول مسجد نبویؐ کی بنیاد۔ دستوری معاہدہ۔

۶۲۳۔ ۶۲۴ء/۲ھ: اذان کا آغاز۔ زکوٰۃ کا فرض ہونا۔ بیت المقدس کی بجائے کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ۱۵۔ شعبان۔ روزوں کا فرض ہونا یکم رمضان۔ غزوۂ بدر ۱۸۔ رمضان۔

۶۲۴ء/۳ھ غزوۂ احد ۶۔ شوال۔ وراثت کے قانون کا نفاذ۔

۶۲۵/۴ھ: غزوۂ بنونضیر، ربیع الاول۔ پردہ کا حکم، ذیقعدہ۔ حرمت شراب۔

۶۲۷/۵ھ: بعض فوجداری قوانین کا نفاذ اور پردے کے مزید احکام غزوۂ احزاب، شوال بنوقریظہ ۷۔ یقعدہ۔ بنوقریظہ کی سرکوبی، ذی الحجہ۔

۶۲۸/۶ھ صلح حدیبیہ، ذیقعدہ۔ حضرت خالدؓ اور عمروؓ بن عاص کا اسلام لانا۔

۶۲۸/۷ھ سلاطین کے نام خطوط، یکم محرم۔ غزوۂ خیبر، محرم۔ نکاح و طلاق کے تفصیلی قوانین۔ موتہ کی جنگ۔

۶۲۹/۸ھ فتح مکہ۔ ۱۰ رمضان کو مدینہ سے روانگی اور ۲۰۔ رمضان کو مکہ میں داخلہ۔ سود پر پابندی۔ غزوہ حنین و طائف، شوال۔

۶۳۰/۹ھ: غزوہ تبوک، رجب۔ حج کا فرض ہونا۔

۶۳۱/۱۰ھ: خطبہ حجۃ الوداع ۹۔ ذی الحجہ۔

۶۳۲/۱۱ھ: مرض وفات کا آغاز، اواخر ماہ صفر۔ مسجد نبوی میں آخری نماز باجماعت وفات سے پانچ روز قبل ادا کی۔ وفات ۱۲۔ ربیع الاول بروز پیر، وقت چاشت۔ تدفین ۱۳۔ ربیع الاول اور ۱۴۔ ربیع الاول کی درمیانی شب میں۔
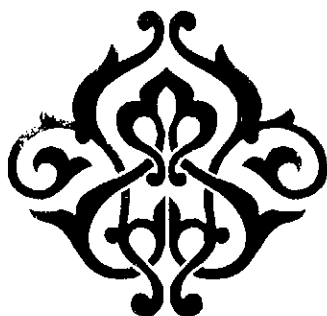
باب ۵

مدینہ: ریاست اور معاشرہ

ہجرت مدینہ کے بعد اگرچہ رسول پاکؐ کی زندگی کا ایک بڑا حصہ کافروں کے ساتھ لڑائیوں میں گزرا، لیکن یہ سمجھنا صحیح نہیں ہوگا کہ مدینہ کے یہ دس سال محض جنگ و جدال کی نظر ہو گئے۔ عہد رسالتؐ میں جنگوں کی تعداد کو دیکھ کر عام طور پر آدمی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ان جنگوں میں بہت خونریزی ہوئی ہوگی۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ عہد رسالتؐ میں دس سال کی مدت میں جس قدر جنگیں ہوئیں ان میں دونوں طرف سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد بارہ سو سے زیادہ نہیں۔ یعنی ایک سال میں اوسطاً ایک سو بیس افراد ہلاک ہوئے۔ اس محدود جانی نقصان کے نتیجے میں عرب جیسا ملک جو وسعت میں ہندوستان کے برابر ہے مسلمانوں کو مل گیا۔ کیا اتنے کم جانی نقصان کے مقابلے میں دُنیا کی کوئی قوم اتنا بڑا انقلاب لائی ہے؟

دس سال کی اس مدت میں میدان جنگ سے دُور مدینہ کی پُرامن فضا میں رسول پاکؐ کی رہنمائی میں ایک نیا معاشرہ وجود میں آیا تھا جو انسان اور اس کی زندگی سے متعلق ایک حقیقت پسندانہ اور صحت بخش تصور پر مبنی تھا۔ اس تصور نے پُرانے نظریات کو بدل ڈالا اور ایک نئے سماجی اور سیاسی ڈھانچے کی بنیاد ڈال دی۔

اسلام کا تصورِ کائنات

انسان اور کائنات سے متعلق اسلامی تصور کی بنیاد عقیدہ توحید[1] پر ہے۔ چنانچہ اسلام کے ان پانچ بنیادی عقائد میں جو ارکانِ اسلام کہلاتے ہیں، پہلا رکن کلمۂ توحید ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

یہی وہ کلمہ ہے جس کے پڑھنے کے بعد ایک انسان اسلام کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے۔ اس کلمہ میں آدمی اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ یہ کائنات خود بخود پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس کا خالق اللہ

(۱) اسلامی عقائد کے لیے دیکھیے رسالہ ''دینیات'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ''خطبات'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

ہے۔ وہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ قرآن کی ایک سورت میں اللہ کے اس تصور کو بڑے جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے:

قل هو الله احدo الله الصّمدo لم يلد ولم يولدo ولم يكن له كفوًا احدo

یعنی ''اللہ ایک ہے، وہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اُس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد، اور کوئی اس کا ہمسر نہیں''

کلمہ کا دوسرا حصہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے متعلق ہے۔ اللہ تک پہنچنے کا صحیح راستہ وہی ہے جو اللہ کے رسولوں نے بتایا۔ انسان کسی اور ذریعہ سے اللہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ دوسرے تمام ذریعے خیالی اور ناقص ہیں، یقینی نہیں ہیں۔ محمدؐ، اللہ کے رسول ہیں اور رسولوں کے اس سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ ان کی ذات پر نبوت کا خاتمہ ہوگیا اس لیے اُن کی بتائی ہوئی شریعت رہتی دنیا تک واحد دستورِ زندگی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

محمد صلی اللہ علی وسلم کی نبوت کی صداقت کا ثبوت خود ان کی ذات ہے۔ آپؐ کی زندگی آئینہ کی طرح پوری تفصیلات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے۔ آپؐ کی سچائی، دیانت اور ایمانداری کا آپؐ کے دشمنوں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ آپؐ کی ساری زندگی دُنیاوی اغراض سے خالی رہی ہے۔ ایسا سچا اور بے غرض آدمی جب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ موجود ہے، مجھ سے کلام کرتا ہے اور اُس نے مجھے نبی مقرر کیا ہے، تو پھر ایک دیانت دار انسان آپؐ کے اس دعویٰ کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول پاکؐ کی زندگی میں یہی ہوا۔ لوگ آپؐ کی پاک زندگی اور سچائی کو دیکھ کر ایمان لاتے تھے اور آج بھی آپؐ کی زندگی بے شمار لوگوں کے لیے اسلام تک پہنچنے اور اللہ کو پہچاننے کا بڑا ذریعہ ہے۔ آپؐ کی ذات اللہ تعالیٰ کے وجود کی ایک عینی شہادت ہے جس پر ایک مسلمان ایمان لاتا ہے۔[1]

اسلام کے عقیدۂ توحید کا ایک لازمی حصہ یہ بھی ہے کہ اللہ کی ذات، انسان کی زندگی سے بے تعلق نہیں۔ اس نے انسان اور کائنات کو ایک خاص مقصد اور ارادے سے پیدا کیا ہے۔ وہ

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''نبوتِ محمدی کا عقلی ثبوت'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ یہ مضمون مولانا کی کتاب تفہیمات حصہ اول صفحہ ۲۳۸۔۲۵۵ مطبوعہ ۱۹۶۸ء کے علاوہ کتابچہ کی شکل میں بھی شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ''دینیات'' از سید ابُوالاعلیٰ مودُودی صفحہ ۵۷۔۷۵ کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔ جس میں نبوت محمدی کا ثبوت پیش کیا گیا ہے۔

ہماری تقدیر کا مالک ہے اور ہم سے ہمارے عمل کا حساب طلب کرے گا۔ دنیا اور اس کی زندگی عارضی ہے لیکن انسان کی زندگی مرنے کے بعد ختم نہیں ہوگی۔ ہم ایک بار پھر زندہ ہوں گے اور یہ نئی زندگی اس عمل کے مطابق ہوگی جو ہم نے اپنی موجودہ زندگی میں انجام دیئے۔ گویا یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ ہم یہاں جو چیز بوئیں گے آخرت میں اسی کی فصل کاٹیں گے۔ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ اسلام کے ان عقائد کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے:

اٰمنت باللہِ وَملٰئِکتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللہِ تعالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْت۔

یعنی ''میں ایمان لاتا ہوں اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر اور یہ کہ تقدیر کا اچھا اور برا ہونا اللہ کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد پھر زندہ ہونے پر''

توحید کا عقیدہ شرک کی ضد ہے اور شرک اسلام میں سب سے بڑی گمراہی ہے، اتنی ہی بڑی گمراہی جتنی بڑی الحاد اور بے دینی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق شرک صرف عبادت اور پوجا پاٹ میں غیر اللہ کو شریک کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اللہ کے احکام کو چھوڑ کر کسی اور کا حکم ماننا بھی شرک ہی کی ایک قسم ہے۔ قرآن میں اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

۱۔فرمانروائی اور اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی (دین) ہے'' (سورہ یوسف:۴۰)

۲۔''جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں'' (سورۂ مائدہ:۴۴)

جدید سیاسی اصطلاح میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں اقتدار اعلیٰ یا حاکمیت صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اسلام میں یہ ممکن نہیں کہ انسان زبان سے تو اللہ پر ایمان لائے لیکن زندگی کے معاملات غیر الٰہی قانون کے مطابق طے کرے۔

ارکان اسلام

ارکان اسلام کے باقی چار رکن عبادات سے متعلق ہیں۔ ان کا مقصد بھی انسان کو اللہ تعالیٰ سے قریب تر لانا اور اس قربت کے ذریعے اپنی ذات کی اور اپنے معاشرے کی اصلاح کرنا ہے۔

یہ چار ارکان حسب ذیل ہیں:

۱۔ نماز: جو دن میں پانچ مرتبہ پڑھی جاتی ہے یعنی فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء۔ یہ اس لیے کہ جب آدمی دُنیا کے کاموں میں مصروف ہو تو اللہ کو نہ بھلا سکے اور اس کے ذہن میں یہ خیال موجود رہے کہ اللہ اس کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے۔ اس طرح ایک مسلمان ان لوگوں کی نسبت، بُرائیوں سے زیادہ بچ سکتا ہے جو اٹھتے بیٹھتے اللہ کو یاد نہیں کرتے۔

۲۔ روزے رکھنا: روزے سال میں ایک مرتبہ رمضان کے مہینے میں رکھے جاتے ہیں۔ اس کا مقصد صبر وضبط کی عادت ڈالنے کے علاوہ اپنے نفس کی اصلاح بھی ہے۔ یہ ایک ایسی مشق ہے جس کے ذریعہ روزہ دار ایک ماہ تک بُری باتوں سے بچنے اور اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر یہ کوشش خلوص پر مبنی ہو تو روزہ دار کی باقی گیارہ ماہ کی زندگی بھی بہتر ہو سکتی ہے۔

۳۔ زکوۃ: یعنی وہ لوگ جو دولت مند ہیں اپنی جمع شدہ دولت کا چالیسواں حصہ ہر سال علیحدہ کر دیں تاکہ اس رقم سے غریب اور ضرورت مند مسلمانوں کی مدد کی جا سکے۔ زکوۃ نکالنا کسی قسم کا احسان نہیں ہے بلکہ دولت مندوں پر معاشرہ کے غریب افراد کا حق ہے۔ یہ کوئی دنیوی ٹیکس بھی نہیں ہے بلکہ عبادت ہے اور تزکیہ نفس کا ذریعہ بھی۔

۴۔ حج: یعنی جن لوگوں کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ مکہ معظمہ جا سکیں تو ان پر زندگی میں ایک مرتبہ حج کرنا ضروری ہے۔ یہ ایک ایسی اجتماعی عبادت ہے جس میں دنیا کے ہر حصہ اور ملک سے لوگ شرکت کرتے ہیں۔ رنگ ونسل کا فرق مٹ جاتا ہے اور بین الاقوامی جذبے اور انسانی اخوت کو فروغ ملتا ہے۔

ہم نے اسلام کے ان عقائد کو اس لیے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ ان کو سمجھے بغیر اسلام کے پیغام کو اور مدینہ کے اسلامی معاشرے کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور یہی وہ عقائد ہیں جن کی بنیاد پر مدینہ کی اسلامی ریاست کا ڈھانچہ تیار کیا گیا۔

اللہ کی حاکمیت

عیسائیت یا دوسرے مذاہب کی طرح اسلام صرف پوجا پاٹ اور اخلاقی تعلیمات کا مذہب

نہیں۔ اسلام کے لیے قرآن میں "دین" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، جس کا مطلب مکمل طریقہ زندگی ہے۔ یعنی ایسا طریقہ جو زندگی کے صرف ایک حصہ سے متعلق نہ ہو بلکہ پوری زندگی ہو۔ وہ زندگی کی رُوح اور اس کو حرکت دینے والی قوت ہو۔ چنانچہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ سیاست، معاشرت اور معیشت، غرض انسانی زندگی کا ہر پہلو اسلامی احکام کے تابع ہے۔ اسلام میں سیاست اور مذہب کی تفریق نہیں۔ سیاست اور مذہب دونوں اسلامی احکام کے تابع ہیں یعنی جب ہم لفظ اسلام استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب پوجا پاٹ اور اخلاقی تعلیم پر مشتمل مذہب نہیں ہوتا بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات اور نظریہ زندگی مقصود ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

"اسلام اور حکومت دو جڑواں بھائی ہیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہوسکتا۔ پس اسلام کی مثال ایک عمارت کی ہے اور حکومت گویا اس کی نگہبان ہے۔ جس عمارت کی بنیاد نہ ہو وہ گر جاتی ہے اور جس کا نگہبان نہ ہو وہ لوٹ لیا جاتا ہے" (کنز العمال)[1]

عہدِ رسالت میں مدینہ میں جو سیاسی نظام قائم کیا گیا وہ بادشاہت نہیں تھی اور نہ ہی وہ عرب کا قدیم قبائلی نظام تھا۔ مدینہ کی ریاست کو اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کا پورا پورا شعور تھا۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اس ریاست کے سربراہ تھے۔ وہ بادشاہ، صدر یا امیر نہیں کہلائے کیونکہ وہ ان سب سے زیادہ عظیم مرتبہ پر فائز تھے۔ وہ نبی تھے اور ان کے ہر حکم کی اطاعت دینی فریضے کے طور پر کی جاتی تھی۔ وہ حکمران کے علاوہ مصلح بھی تھے اور معلم بھی۔ مدینہ کی اسلامی ریاست کا آج کل کی طرح کوئی تحریری دستور نہیں تھا اور نہ ہی وہ بہت سی سیاسی اصطلاحیں استعمال میں تھیں جو آج کل مروج ہیں۔ لیکن قرآن کے احکام، احادیث رسولؐ اور اس زمانہ کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے اس ریاست کا جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے۔[2]

مدینہ کی ریاست، ایک نظریاتی اور ہمہ گیر ریاست تھی۔ اس ریاست میں کسی شخص یا عوام کی حاکمیت کی بجائے اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کیا گیا تھا۔ ایک ہمہ گیر ریاست کی حیثیت سے اس کے

---

(۱) اسلامی ریاست از سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۱۲۰ اسلامک پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۶۲ء۔

(۲) اسلام کے سیاسی نظام کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے "اسلامی ریاست" از سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مختصر مطالعہ کے لیے کتابچہ "اسلام کا نظریہ سیاسی" از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

اختیارات کا دائرہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی تھا۔ سیاست، معیشت، اخلاق، تعلیم، صنعت و حرفت، زراعت اور معاشرتی امور سب اس کے دائرے میں تھے۔

اللہ کی حاکمیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مدینہ کی ریاست ایک ایسی مذہبی ریاست تھی جس کو مغربی اصطلاح میں تھیاکریسی کہا جاتا ہے۔ تھیاکریسی میں تمام اختیارات مذہبی پیشواؤں کے طبقہ کو حاصل ہوتے ہیں اور وہ اپنے بنائے ہوئے قوانین کو الٰہی قوانین قرار دیتے ہیں۔ لیکن اسلام میں کسی مذہبی طبقہ کو یہ اختیار حاصل نہیں۔ خدائی احکامات واضح اور صاف ہیں اور ان کی حیثیت رہنما اصولوں کی ہے۔ انسان کو اللہ کا نائب قرار دیا گیا ہے اور مسلمانوں کی جماعت کو مکمل حق دیا گیا ہے کہ وہ خُدائی ہدایات (جو قرآن مجید اور احادیث کی شکل میں موجود ہیں) کی پابندی کرتے ہوئے ریاست کے مکمل اختیارات سنبھال سکیں۔ اس لحاظ سے مدینہ کی اسلامی حکومت ایک طرح کی جمہوری حکومت تھی۔ اس میں عوام کی مرضی کو بھی دخل تھا اور وہ عوام کے مفاد کے لیے کام کرنے پر بھی مجبور تھی۔ عوام کے ان اختیارات کو عملی شکل دینے کے لیے رسول پاکؐ ایک نبی ہونے کے باوجود اُن سے مشورہ کرتے رہتے تھے اور آپؐ نے "مشورہ" کے اصول کو ایک اسلامی ریاست کے لیے لازمی شرط قرار دیا۔ موجودہ پارلیمنٹ اور مجالس قانون ساز اسی شوریٰ کی جدید شکل ہیں۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اوقات میں امیر اور رعایا کے فرائض اور ذمہ داریوں کی وضاحت کرتے رہتے تھے۔ آپؐ کی ان ہدایات میں سے ایک یہ تھی کہ اطاعت صرف معروف میں ہے منکر میں نہیں۔ یعنی مسلمان اپنے امیر کی اطاعت کے صرف اُس وقت تک پابند ہیں جب تک وہ اسلامی احکام کے مطابق حکومت کرے۔ بصورت دیگر وہ اطاعت سے انکار کر سکتے ہیں۔

اِنسانی اخوت

مدینہ کی ریاست چونکہ نظریاتی ریاست تھی اس لیے اس کی بنیاد رنگ و نسل اور وطنی قومیت پر نہیں تھی۔ اسلام میں ان تمام عصبیتوں کو جو انسان کو انسان سے جُدا کریں، ان کے درمیان امتیاز پیدا کریں اور رنگ، نسل اور وطن کی بنا پر انسانوں کے درمیان نفرت اور دشمنی پیدا کریں، ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ رسول پاکؐ نے صاف الفاظ میں اعلان کر دیا تھا کہ عرب، ایرانی، کالے اور گورے سب انسان برابر ہیں۔ وہ ایک ہی آدم کی اولاد ہیں جو مٹی

سے بنے تھے۔ لہٰذا ایک انسان کو دوسرے پر فضیلت نہیں اگر کسی کو فضیلت دی جا سکتی ہے تو وہ صرف نیک عمل کی وجہ سے۔

انسانی اخوت کا یہ پیغام اُس زمانہ میں ایک انقلابی آواز تھی، کیونکہ ایرانی خود کو عربوں سے اور عرب خود کو ایرانیوں سے بہتر سمجھتے تھے اور ایک دوسرے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسی طرح رومی اور یورپ کی دوسری گوری قومیں خود کو افریقہ کے کالے لوگوں سے بہتر سمجھتی تھیں اور کالے رنگ والی قوموں کو حقارت سے دیکھتی تھیں۔ اسلام کی یہ تعلیم آج بھی ایک انقلابی تعلیم ہے کیونکہ جدید دور کی قوم پرستی اور وطن پرستی نے بنی نوع انسان کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے اور حق و باطل کی تمیز ختم کر کے اقوام کو قومی تعصب کا شکار بنا دیا ہے۔ عرب میں عربوں کے علاوہ ایرانی، رومی اور حبشی باشندے بھی تھے، لیکن سب کے حقوق برابر تھے۔ رسول پاکؐ کی ہدایت تھی کہ اگر ''تم پر حبشی غلام بھی حاکم بنا دیا جائے تو اس کی اطاعت کرو''

قانون کی برتری

مدینہ کی ریاست میں قانون کو برتری حاصل تھی اور عدالت کے سامنے امیر اور غریب، طاقتور اور کمزور سب برابر تھے۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ رسول پاکؐ نے ایک موقع پر فرمایا کہ:

''اگر محمدؐ کی لڑکی فاطمہؓ بھی چوری کرے گی تو اس کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے''

مدینہ کی ریاست میں قانون کا بنیادی مآخذ اللہ اور رسولؐ کے احکام تھے۔ ساری مملکت میں انصاف کے لیے قاضی مقرر تھے جو اللہ اور رسولؐ کے احکام کی روشنی میں فیصلے کرتے تھے۔ ذاتی رائے صرف اس وقت استعمال کرتے تھے جب کتاب و سنت میں کوئی وضاحت نہیں ہوتی تھی۔

غیر مسلم قوموں کے لیے بنیادی حقوق کا تصور نیا ہے لیکن مسلمانوں کے لیے یہ تصور نیا نہیں۔ مدینہ کی اسلامی ریاست میں لوگوں کو وہ تمام حقوق حاصل تھے جو آج کی اصطلاح میں بنیادی حقوق [1] کہلاتے ہیں۔ جان اور مال کا تحفظ، خواتین کی عزت کا تحفظ، اظہار رائے کی

(1) دنیا میں بنیادی حقوق کی تاریخ اور تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے ''اسلامی ریاست'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی باب ۱۲ ''انسان کے بنیادی حقوق'' صفحہ ۵۴۷۔۵۷۱۔ یہی مضمون ''تفہیمات'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی حصہ سوم میں صفحہ ۲۴۸۔۲۶۸ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

آزادی، اجتماع کی آزادی، مذہبی آزادی، معذور اور کمزوروں کا تحفظ، معاشی تحفظ، اور بغیر کسی رکاوٹ کے ہر شخص کو انصاف طلب کرنے کا حق، وہ چیزیں ہیں جن کو بنیادی حقوق کہا جاتا ہے، اور یہ سب حقوق اسلامی ریاست کی رعایا کو حاصل تھے۔ غیر مسلموں کو بھی یہ تمام حقوق حاصل تھے۔ مسلمانوں پر صرف اتنی پابندی تھی کہ اسلام لانے کے بعد وہ اسلام سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔

عدل قائم کرنا، ظلم مٹانا، نیکی کو فروغ دینا اور برائی کو مٹانا، جس کو اسلامی اصطلاح میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا جاتا ہے، ریاست کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اس کے تحت قتل بہت بڑا جرم تھا اور زنا، شراب، جوئے اور سودی کاروبار پر پابندی تھی۔ تعزیرات کا ایک مکمل قانون نافذ تھا جس کے تحت مختلف جرائم پر سزا دی جاتی تھی۔ اقامت صلوٰۃ یعنی نماز باجماعت کا انتظام کرنا اور زکوٰۃ وصول کرنا بھی ریاست کے فرائض میں داخل تھے۔

جہاد فی سبیل اللہ

مدینہ کی ریاست میں ملک گیری، اقتدار، ذاتی شہرت یا قومی اور نسلی عصبیتوں کے لیے (یعنی ایک قوم کے غلبہ اور دوسری قوم کو محکوم بنانے کے لیے) جنگ کرنا ایک جرم تھا۔ جنگ صرف اپنے دفاع، ظلم و استحصال کے خاتمے اور اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر جائز تھی۔ اور ان اعلیٰ مقاصد کے لیے جنگ کرنے کو جہاد فی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔ جنگ کے دوران وحشت اور بہیمیت کے طریقوں کو ممنوع قرار دیا گیا اور جنگ سے متعلق انسانی جان کے تحفظ اور حرمت کے لیے ایسے قوانین بنائے گئے جو آج کے جدید ترین قوانین جنگ سے بہتر ہیں۔[1]

مدینہ کی ریاست رعایا کے معاشی تحفظ اور ان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کی ذمہ دار تھی۔ اس مقصد کے لیے کئی اصلاحات کی گئیں۔ زکوٰۃ کا نظام قائم کیا گیا جو جدید اصطلاح میں سوشل انشورنس کا نظام ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سوشل انشورنس ایک سودی کاروبار ہے لیکن زکوٰۃ کا نظام عبادت ہے۔ معاشی استحصال یعنی لوٹ کھسوٹ ختم کرنے اور دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے۔ کمائی کے لیے جائز اور ناجائز طریقوں میں فرق کیا گیا۔ سودی کاروبار کو ختم کیا گیا کیونکہ سودی کاروبار انسان کو لوٹنے کا ہر زمانہ میں سب سے بڑا ذریعہ رہا ہے۔

---

(1) ملاحظہ ہو "الجہاد فی الاسلام" از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

وراثت کا قانون نافذ کیا گیا تاکہ آدمی کے مرنے کے بعد اس کی دولت اور جائداد منصفانہ طریقہ پر اولاد اور مستحق رشتہ داروں میں تقسیم ہو جائے۔ اُس زمانہ میں دُنیا کے دوسرے ملکوں میں صرف بڑا لڑکا باپ کی جائداد کا مستحق ہوتا تھا اور دوسری اولاد محروم رہ جاتی تھی۔ اسلام نے نہ صرف اس ظلم کو ختم کیا بلکہ وراثت کی تقسیم کا ایک ایسا نظام قائم کیا جس کے تحت جمع شدہ دولت کئی حصوں میں تقسیم ہونے لگی۔ مدینہ میں جوا اور سٹہ ممنوع تھے اور احتکار[1] اور ذخیرہ اندوزی پر پابندی تھی۔

اخلاقی نگرانی

عام طور پر حکومتیں عوام کی اخلاقی نگرانی سے بے تعلق ہوتی ہیں۔ وہ ہر قسم کی معاشی سیاسی، سماجی اور تعلیمی اصلاحات نافذ کرتی ہیں لیکن رعایا کی اخلاقی اصلاح کی طرف خاص توجہ نہیں دیتی ہیں۔ لیکن مدینہ کی ریاست عوام کے اخلاق کی نگرانی بھی کرتی تھی۔ وہ ایسے حالات پیدا کرنا چاہتی تھی جن میں انسان اپنے اخلاقی فرائض بھی پہچانے۔ جھوٹ نہ بولے، بہتان نہ باندھے، چوری نہ کرے، جوا نہ کھیلے، شراب نہ پئے، جنسی بے راہروی میں مبتلا نہ ہو اور حیا و شرم کی زندگی گزارے۔ حیا کو اسلام میں نصف ایمان کہا گیا ہے۔ مسلم معاشرہ میں خاندان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس لیے ہر وہ چیز جو میاں بیوی کے تعلقات کو خراب کرے اور خاندانی رشتوں کو کمزور کرے اسلام میں ناپسندیدہ ہے۔ جنسی آزادی اور بے راہروی اسی لیے بہت بڑا جرم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ کی اسلامی ریاست میں رقص و سرود پر پابندی تھی۔ یہ چیزیں شراب کی طرح انسان کے اعلیٰ جذبات سے زیادہ ادنیٰ اور اسفل جذبات کو اُبھارتی ہیں اور تاریخ بتاتی ہے کہ رقص و سرود کا شراب اور عیاشی سے گہرا تعلق رہا ہے۔

مدینہ میں تصویر کشی بھی ممنوع تھی کیونکہ عیسائیت اور بُدھ مت کی طرح یہ بت پرستی کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ بدھ مت اور عیسائیت کا بت پرستی سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن یہ تصویر کشی اور بُت سازی کا فن ہی تھا جس نے ان مذاہب میں مہاتما بُدھ اور حضرت عیسیٰ ؑ کے مجسمے بنائے اور ان کو پوجنے کے لیے راہ ہموار کی۔

---

[1] احتکار کے معنی ہیں ضرورت کی اشیاء کو روک لینا اور بازار میں نہ لانا تاکہ قیمتیں چڑھ جائیں اور ان اشیاء کو زیادہ سے زیادہ قیمت پر فروخت کیا جاسکے۔

نظام غلامی کی اصلاح

مدینہ کی اسلامی ریاست میں غلامی کے نظام کی بھی اصلاح کی گئی۔ پرانے زمانہ میں ساری دنیا میں غلامی کا رواج تھا یعنی دوسرے تجارتی مال کی طرح انسان بھی فروخت کیے جاتے تھے۔ اس طرح جو مرد خریدے جاتے تھے وہ غلام کہلاتے تھے اور جو عورتیں خریدی جاتی تھیں ان کو لونڈی کہا جاتا تھا۔ ان لونڈی غلاموں پر ان کے مالک بڑا ظلم کرتے تھے اور ان کو کسی قسم کا حق نہ دیتے تھے۔ اسلام نے غلامی کو قانوناً ختم تو نہیں کیا لیکن اس نظام میں ایسی اصلاحات کیں کہ اس نظام کی شکل ہی بدل گئی۔ غلاموں کو گھر کے دوسرے افراد کے برابر درجہ دیا گیا۔ یہ حکم دیا گیا کہ مالک جو خود کھائے وہی غلام کو کھلائے، جو خود پہنے وہی غلام کو پہنائے۔ مختصر یہ کہ غلام کو خاندان کا رکن بنا دیا گیا۔ غلام کو ظلم کے خلاف اور حق تلفی کی صورت میں عدالت سے انصاف طلب کرنے کا حق بھی دیا گیا۔ اسی طرح غلاموں کی خرید و فروخت پر بھی کئی پابندیاں لگائی گئیں۔ اب غلام صرف جنگی قیدی ہی بنائے جا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ لونڈی، غلام کو آزاد کرنا بہت بڑا ثواب بتایا گیا۔[1]

عورتوں کے حقوق

اسلام نے عورتوں کو بھی وہ حقوق دیئے[2] جو اس سے پہلے دنیا میں کسی ملک کی عورتوں کو حاصل نہیں تھے۔ پہلے باپ یا کسی عزیز کی وراثت میں لڑکیوں کو حصہ نہیں ملتا تھا۔ اسلام نے وراثت میں لڑکیوں کا حصہ مقرر کیا۔ عورتوں کو کمانے کا حق دے کر ان کو معاشی آزادی دی۔ عورتوں کو عام طور پر ذلیل سمجھا جاتا تھا لیکن اسلام نے بتایا کہ ایک انسان کی حیثیت سے عورت اور مرد دونوں برابر ہیں اور ان میں کوئی ذلیل اور شریف نہیں ہو سکتا۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ ماؤں کے پیروں کے نیچے جنت ہے۔ قرآن نے عورتوں کو مردوں کا اور مردوں کو عورتوں کا لباس قرار دیا ہے۔ بہت سے ملکوں میں بیوہ شادی نہیں کر سکتی تھی، اسلام نے بیوہ کو شادی کا حق دیا۔ کئی ملکوں میں عورتوں کو طلاق کا حق حاصل نہیں تھا اسلام نے عورتوں کو طلاق لینے

---

(۱) ملاحظہ کیجیے "اسلام میں غلامی کی حقیقت" از سعید احمد اکبر آبادی۔ ندوۃ المصنفین دہلی۔

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے "عورت اسلامی معاشرہ میں" از سید جلال الدین انصر عمری مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز، لاہور

کا حق دیا۔ [۱]

ان تمام حقوق کے ساتھ اسلام میں عورتوں اور مردوں کے لیے کچھ حدود بھی مقرر کیے گئے ہیں۔عورت کو گھر کے کاموں کا اور مرد کو باہر کے کاموں کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ خاندان کی سربراہی مرد کے سپرد ہے۔ضرورت کے تحت عورت اور مرد ایک دوسرے کے دائرہ عمل میں داخل تو ہو سکتے ہیں لیکن ایسا کرنا لازمی نہیں۔عورتوں کو مردوں کی اور مردوں کو عورتوں کی مشابہت پیدا کرنے سے روکا گیا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان آزادانہ میل جول پر پابندی لگائی گئی ہے تا کہ مسلم معاشرے میں وہ بے حیائی اور بے شرمی نہ پھیل سکے جو اسلام سے پہلے عربوں، یونانیوں، رومیوں اور دوسری قوموں میں پھیل گئی تھی اور آج کل مغربی ملکوں میں عام ہے۔ [۲] پردہ کا حقیقی مقصد مردوں اور عورتوں کے اسی آزادانہ میل جول کو روکنا ہے۔اسلام میں شادی کے لیے لڑکی کی رضا مندی حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ باہمی رضامندی کی شادی خاندانی استحکام کا باعث ہوتی ہے۔لڑکی ہونے والے شوہر کو دیکھ بھی سکتی ہے لیکن اسلام میں شادی کے لیے یہ لازمی نہیں ہے کہ پہلے محبت کی جائے جیسا کہ آج کل مغربی ملکوں میں رواج ہے۔

جسم کی عریانی کا جنسی بے راہ روی سے گہرا تعلق ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک قوم لباس کے معاملہ میں جتنی عریاں ہوتی ہے جنسی معاملات میں بھی اتنی ہی بے راہرو ہوتی ہے۔ اسلام میں لباس کے معاملے میں بھی حیا اور شرم کا ایک معیار ہے جس کو ستر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ مدینہ کی ریاست میں مردوں اور عورتوں کے لیے ایسا لباس مقرر کیا گیا تھا جو اس معیار کے مطابق تھا۔

ہر ملک کے دولت مند اور صاحب اقتدار لوگ اُس زمانے میں ایک وقت میں کئی کئی شادیاں کرتے تھے اور تعداد پر کوئی پابندی نہیں تھی۔موجودہ دَور میں اگرچہ ایک سے زیادہ شادی نہیں کی جاتی لیکن جنسی تعلقات پر کوئی پابندی نہیں۔ چنانچہ موجودہ دَور کے دولت مند عام طور پر غیر عورتوں سے ناجائز تعلقات رکھتے ہیں۔اسلام نے اس جنسی مسئلہ کو اس طرح حل کیا ہے کہ ناجائز تعلقات کو بدترین گناہ قرار دیا ہے اور مرد کی فطرت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کو چار بیویوں کی

---

(۱) اسلام کے عائلی قوانین کے لیے ملاحظہ کیجیے ''حقوق الزوجین'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب ''پردہ'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

حد تک شادی کی اجازت دی گئی ہے، لیکن بیویوں کے درمیان انصاف کو لازمی قرار دیا ہے۔

یہ وہ ضابطے اور قوانین ہیں جن کو مدینہ کی ریاست میں نافذ کیا گیا تھا اور جن کو جدید اصطلاح میں عائلی قوانین کہا جاتا ہے۔

عربوں کی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں

یہ تھا مدینہ کا نیا معاشرہ اور نئی تہذیب۔ یہ واقعی ایک مثالی معاشرہ تھا جس کی بنی نوع انسان کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ یہ معاشرہ ظلم و جبر سے پاک تھا، اس کی بنیاد کسی سے نفرت پر نہیں بلکہ باہمی محبت پر تھی۔ اس میں رنگ و نسل، قوم و وطن اور آقا و غلام کا امتیاز نہیں تھا۔ اس دور کے مسلمانوں میں وہ تمام اخلاقی خوبیاں موجود تھیں جن کو ہر دور اور زمانے میں اچھا سمجھا گیا ہے۔ عہد رسالتؐ کے مسلمان ان تمام برائیوں سے جن کو سب بُرا سمجھتے ہیں، اس حد تک دُور تھے جس حد تک کہ ایک انسان کے لیے ممکن ہوسکتا ہے اور انھوں نے وہ تمام خوبیاں اپنالی تھیں جن کو عالمگیر سچائیاں کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

''سب سے اچھا زمانہ میرا ہے، اس کے بعد ان لوگوں کا جو میرے بعد آئیں گے اور پھر ان لوگوں کا جو اُن کے بعد آئیں گے''

مدینہ میں جو اصلاحات کی گئیں ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند سالوں میں عربوں کی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ چوری، ڈکیتی ختم ہوگئی، راستے محفوظ ہوگئے۔ اب عرب کے ہر حصے میں مسافر تنہا سفر کرسکتا تھا اور کوئی اس کو ٹوک نہیں سکتا تھا۔ لوگوں نے شراب' جوئے اور بے شرمی اور بے حیائی کے کاموں سے توبہ کرلی۔ وہ عرب جو ذرا ذرا سی بات پر انسان کو قتل کر دیتے تھے وہ اب انسان کی جان کا احترام کرنے لگے۔ جھوٹ، غیبت، دغا، فریب اور وعدہ خلافی کی جگہ صداقت، وفاداری اور اخلاق نے لے لی۔ تجارت اور کاروبار سے سُودی لین دین ختم ہوگیا۔

اسلام کی یہ تعلیمات جن کو مدینہ میں عملی شکل دی گئی، وقتی نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت دائمی ہے۔ اُن سے ہر زمانے اور ہر دَور میں رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ جس طرح صداقت، دیانت داری، انصاف، اخلاص، سخاوت، شجاعت اور وہ تمام اچھی باتیں، جن کو عالمگیر سچائی کہا جاتا ہے کبھی پُرانی نہیں ہوسکتیں اسی طرح اسلامی تعلیمات کبھی پُرانی نہیں ہوسکتیں۔

اسلام دین فطرت ہے، اس لیے اس میں کوئی بات ایسی نہیں جو انسان کے فطری تقاضوں کے خلاف ہو۔ اللہ کا وجود ایک حقیقت ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہی صورت آخرت اور روز جزا کی ہے۔ ان میں کوئی بات انسان کی زندگی میں پُرانی ہونے والی نہیں۔ اسی طرح کاروبار میں سُود سے بچنا، کھانے پینے میں حلال وحرام کی تمیز، شراب اور جوئے سے پرہیز کرنا، زنا، بدکاری، فحش اور گندی باتوں سے بچنا، عورتوں اور مردوں کے درمیان آزادانہ میل جول میں احتیاط، اسلام کا نظام وراثت اور نظام زکوٰۃ اور دوسری اخلاقی تعلیمات جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے، فی الحقیقت عالمگیر سچائیاں ہی ہیں اور ان میں کوئی چیز بھی پُرانی ہونے والی نہیں۔ جو چیزیں پرانی ہونے والی ہیں اسلام نے ان کو دین کا حصہ نہیں بنایا اور اُن کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار عام مسلمانوں کو دیا ہے۔

اسلام نے جو پابندیاں مسلمانوں پر لگائی ہیں ان کو قرآن میں حدُود اللہ کہا گیا ہے اور ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان اپنی خواہشوں کی پیروی میں اور اپنی عقل و دانش کے گھمنڈ میں اعتدال کی حد سے نہ بڑھ جائے اور گمراہ ہو کر دائیں بائیں کسی کھڈ میں نہ گر جائے، بلکہ اس راستے پر چلے جس کو اسلامی اصطلاح میں صراط مستقیم کہا گیا ہے اور جو انسان کی نجات کا راستہ ہے۔ یہ حُدود، قید نہیں ہیں بلکہ محض حفاظتی دیواریں ہیں۔ ان پابندیوں کے بعد ایک مسلمان پُوری طرح آزاد ہے کہ وہ اپنی عقل، صلاحیت اور ہمت سے کام لے کر جس طرح چاہے اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔ اس کی ترقی کا انحصار اپنی انہی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں پر ہوگا۔

مسلمانوں نے اسلام کی تعلیمات پر ہر دَور میں عمل کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد میں ان کو کامیابیاں بھی ہوئیں اور ناکامیاں بھی۔ لیکن جب بھی ان کو کامیابی ہوئی ان کی حکومت کے تحت لوگوں کو سُکھ اور آرام ملا اور جب بھی ان کو ناکامی ہوئی تو دکھ اور مصیبت کے دروازے کھل گئے۔ ہم اگلے صفحات میں دیکھیں گے کہ اسلامی تاریخ میں مسلمان جس حد تک اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے میں ناکام ہوئے اس حد تک خرابیاں پیدا ہوئیں اور جتنا زیادہ ان تعلیمات پر عمل کیا اتنے ہی زیادہ فائدے پہنچے۔

مسلمانوں کی اس جدوجہد کی داستان اب ہم اگلے صفحات میں پڑھیں گے۔

مزید مُطالعہ کے لیے کتابیں

۱۔ تاریخ اسلام حصہ اول: از شاہ معین الدین احمد ندوی (مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ہندوستان) مختصر مطالعہ کے لیے۔

۲۔ سیرت النبیؐ حصہ اول اور دوم: از شبلی نعمانی۔ تفصیلی مطالعہ کے لیے۔

۳۔ رحمۃ للعالمینؐ: از قاضی سلیمان سلمان منصور پوری حصہ اول۔ تفصیلی مطالعہ کے لیے۔

۴۔ خطبات مدراس: از سید سلیمان ندوی۔ سیرت رسولؐ کے مختلف پہلوؤں کے مطالعہ کے لیے بہترین کتاب ہے۔

۵۔ تذکار محمدؐ: مرتبہ حکیم سعید۔ سیرت نبویؐ کے مختلف پہلوؤں پر سترہ اہل علم حضرات کے مقالوں کا مجموعہ ہے۔

۶۔ عہد نبویؐ کا نظام حکمرانی: از ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی۔ عہد رسالت کے سیاسی اور اجتماعی نظام پر بہترین کتاب ہے۔

۷۔ دینیات: از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور نظریات کو سمجھنے کے لیے مختصر اور اہم کتاب ہے۔

۸۔ حقیقت اسلام: یہ مولانا مودودی کی مشہور کتاب ''خطبات'' کا پہلا حصہ ہے۔ اگر رسالہ ''دینیات'' کے ساتھ اس کا بھی مطالعہ کر لیا جائے تو اسلامی فکر کے تمام اہم پہلو واضح ہو جائیں گے۔

باب ۶

قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کا خاتمہ

حضرت ابوبکرؓ

ہم پڑھ چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جب انتقال ہوا تو سارا عرب مسلمانوں کے قبضے میں آ چکا تھا اور ملک میں ایک مرکزی حکومت قائم ہو گئی تھی جس کے سربراہ خود رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ اپنے بعد کسی کو جانشین مقرر نہیں کیا تھا اس لیے اب یہ فیصلہ کرنا عام مسلمانوں کی ذمہ داری تھی کہ آپؐ کی جگہ اسلامی ریاست کا سربراہ کون ہو۔ چنانچہ مسلمانوں نے مدینہ میں ایک جگہ جمع ہو کر جس کو سقیفہ بنی ساعدہ کہا جاتا ہے، بحث و مباحثہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو رسول پاکؐ کا جانشین یعنی ''خلیفہ'' منتخب کر لیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اسلامی تاریخ میں بہت بڑا مرتبہ ہے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت گہرے دوست تھے اور مردوں میں سب سے پہلے اسلام لائے تھے۔ اُن کو آنحضرتؐ کی باتوں کی سچائی پر اتنا یقین تھا کہ وہ آنحضرتؐ کے ہر دعوے اور بات کی بغیر کسی شک وشبہ کے تصدیق کر دیتے تھے اور اسی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ کا لقب صدیق ہوا یعنی تصدیق کرنے والا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ہر مشکل اور ہر نازک موقع پر رسول پاکؐ کا ساتھ دیا اور اپنی دولت سے مسلمانوں کی مدد کی۔ رسول پاکؐ فرمایا کرتے تھے کہ ''ابوبکرؓ کے مال نے مجھے جتنا فائدہ پہنچایا اتنا کسی دوسرے کے مال نے نہیں پہنچایا'' وفات سے پہلے جب آنحضرتؐ بیماری کی وجہ سے مسجد نبوی میں جانے کے قابل نہ رہے تو آپؐ کے حکم سے حضرت ابوبکرؓ ہی مسلمانوں کی امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں انتخاب ہو جانے کے بعد دوسرے دن ایک عام اجتماع میں، جو مسجد نبویؐ میں ہوا تھا، حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر تمام مسلمانوں نے بیعت کی اور اس طرح حضرت ابوبکرؓ مسلمانوں کے پہلے خلیفہ ہو گئے۔ بیعت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک تقریر کی جس میں

انھوں نے عوام کے حقوق اور حکمران کے فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

''لوگو! میں تم پر حاکم بنایا گیا ہوں حالانکہ میں تمہاری جماعت میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کام کروں تو میری اطاعت کرو اور اگر غلط راستے پر چلوں تو مجھے سیدھا کر دو۔ تم میں جو کمزور ہے وہ بھی میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق اس کو دلا دوں اور تمہارا قوی شخص بھی میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق حاصل کرلوں۔ اگر میں خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرو اور اگر اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں''

حضرت ابوبکرؓ کی اس تقریر میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ ایک مسلمان حکمران مطلق العنان نہیں ہوسکتا اور من مانی نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے اسلامی اصولوں پر عمل کرنا ضروری ہے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو عوام اس کو علیحدہ کر سکتے ہیں۔ ان کی یہ تقریر اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ اس میں عوام کے حقوق کی جو نشاندہی کی گئی ہے اور حکمران کے جو فرائض اور حدود مقرر کیے گئے ہیں وہ اسلام کے سیاسی نظام میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور بعد میں خلفائے راشدین نے ان کو اپنا رہنما اصول بنالیا۔ یہ وہ حقوق و فرائض ہیں جن کو مغربی دنیا نے اٹھارہویں صدی میں اپنایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اگرچہ پورے عرب پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی تھی لیکن تمام لوگ ابھی اسلام نہیں لائے تھے اور جو اسلام لائے تھے ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایسے لوگوں نے بغاوت کردی۔ کچھ قبیلوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا اور یمامہ کے ایک شخص مسیلمہ نے تو نبی ہونے کا دعویٰ کردیا۔ چونکہ یہ شخص جھوٹا تھا اس لیے اس کو مسیلمہ کذاب یعنی جھوٹ بولنے والا کہا جاتا ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے ان باغیوں کا مقابلہ کیا۔ فوجیں روانہ کیں اور سب کو اطاعت پر مجبور کردیا۔ ان لڑائیوں میں ایک صحابی حضرت خالدؓ بن ولید نے جو اسلامی فوج کے سپہ سالار تھے بڑا نام پیدا کیا۔ مسیلمہ کذاب کو بھی انھوں نے ایک سخت جنگ کے بعد شکست دی۔

عرب کی سرحد پر اس زمانے میں دو بڑی حکومتیں تھیں۔ ایک ایران کی حکومت اور دوسری روم کی حکومت جسے بازنطینی حکومت بھی کہتے ہیں۔ ایران کا بادشاہ کسریٰ کہلاتا تھا۔ ہم پڑھ چکے

ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں بادشاہوں کو اسلام قبول کرنے کے لیے خطوط لکھے تھے۔ قیصر روم نے جس کا نام ہرقل تھا اسلام تو قبول نہیں کیا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد سے اچھا سلوک کیا۔ اس کے برخلاف ایران کے بادشاہ خسرو پرویز نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پھاڑ کر پھینک دیا۔ اور مسلمان سفیر کو دربار سے نکلوا دیا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اطلاع ہوئی تو آپؐ نے کہا کہ اس کی سلطنت بھی اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ اب ہم پڑھیں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی کس طرح پوری ہوئی۔ اُس زمانے کے ایرانی جن کا مذہب آتش پرستی تھا عربوں سے بڑی نفرت کرتے تھے اور سرحد پر ایرانیوں اور عربوں میں لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ جب یہ عرب مسلمان ہو گئے تو ان لڑائیوں نے اور زور پکڑ لیا اور حضرت ابوبکرؓ سے سرحد کے عربوں نے مدد مانگی۔ اب کیا تھا ایرانیوں اور عربوں میں یا یوں کہو کہ آتش پرستوں اور مسلمانوں میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔

اُدھر تو ایرانیوں سے جنگ شروع ہوئی اِدھر رومیوں سے بھی جنگ شروع ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں رومیوں اور مسلمانوں میں جھگڑے شروع ہو گئے تھے۔ روم کے ایک شہر بصریٰ کے حاکم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کو قتل بھی کرا دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقام کے لیے ایک فوج بھی بھیجی تھی کہ وہ رومی لشکر کی کثرت کی وجہ سے زیادہ کامیاب نہ ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد شام پر جو رومیوں کے قبضے میں تھا باقاعدہ لشکر کشی شروع کر دی۔

لیکن مسلمان ملک گیری کے شوقین نہیں تھے۔ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ اسلام کو پھیلنے میں آزادی ہو تا کہ لوگ اس کی تعلیمات پر عمل کر کے برائیوں سے بچیں اور اچھے کام کریں۔ اس لیے لڑائی شروع ہونے سے پہلے انھوں نے ایرانیوں اور رومیوں دونوں کو اسلام کی دعوت دی اور کہا کہ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو پھر لڑائی بند ہو جائے گی۔ لیکن انھوں نے نہ مانا۔ اب مسلمانوں نے کہا کہ اچھا اگر تم مسلمان نہیں ہوتے تو ہماری اطاعت قبول کر لو اور اس اطاعت کے ثبوت میں جزیہ دو۔ لیکن انھوں نے یہ بھی نہ مانا۔ اب مسلمانوں کے لیے سوائے اس کے کوئی راستہ نہ رہا کہ وہ ان کے خلاف جہاد شروع کر دیں۔ چنانچہ ایران اور روم کی دونوں حکومتوں سے ایک ہی وقت

میں مسلمانوں کی جنگ شروع ہوگئی۔ حضرت خالدؓ بن ولید کو حضرت ابوبکرؓ نے پہلے ایران کی طرف بھیجا۔ وہاں کئی شہر فتح کرنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے حکم پر وہ رومیوں کے مقابلے کے لیے شام چلے گئے۔

لڑائی کو ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ ڈھائی سال کی خلافت کے بعد حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہوگیا۔ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

حضرت ابوبکرؓ اگرچہ مسلمانوں کے سردار خلیفہ تھے لیکن ان کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ شروع میں وہ اپنا خرچ تجارت کرکے پورا کرتے تھے لیکن بعد میں مسلمانوں کے مشورے سے سرکاری خزانے سے جسے بیت المال کہتے تھے ان کے لیے ایک رقم مقرر ہوگئی۔ وہ خلیفہ ہونے کے باوجود مدینے کی گلیوں میں چکر لگا کر لوگوں کے حالات معلوم کرتے تھے اور ان کے ذاتی کام خود کر دیا کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ جو بعد میں خلیفہ ہوئے کہتے ہیں کہ میں ہر روز صبح ایک بڑھیا کے گھر جا کر اس کے گھر کا کام کر دیا کرتا تھا لیکن ایک روز جب میں گیا تو بڑھیا نے کہا کہ آج کوئی کام نہیں ہے۔ ایک نیک آدمی تم سے پہلے آ کر کام کر گیا۔ حضرت عمرؓ کو بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حضرت ابوبکرؓ تھے جو خلیفہ ہونے کے باوجود غریب بڑھیا کے گھر کا کام کر آتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اگرچہ صرف ڈھائی سال حکومت کی لیکن ان کا یہ زمانہ اسلامی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد

۱۔ مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق قائم رکھا۔

۲۔ عرب میں ہونے والی بغاوتوں کو ختم کر دیا اور

۳۔ حکومت کو جلد ہی اتنا مضبوط کر دیا کہ مسلمانوں نے ایران و روم کی حکومتوں کے خلاف جو اس زمانہ کی سب سے بڑی حکومتیں تھیں، بیک وقت جہاد شروع کرکے ان کے بہت سے علاقے فتح کر لیے۔

حضرت ابوبکرؓ کا ایک اور کارنامہ جمع قرآن ہے۔ قرآن مجید اب تک پورا کا پورا ایک جگہ کتابی شکل میں لکھا ہوا نہیں تھا۔ ہاں حافظ ہزاروں تھے جن کو پورا قرآن حفظ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ

کے ابتدائی دور میں جب عرب میں بغاوتیں ہوئیں تو کئی سو حافظ لڑائیوں میں شہید ہو گئے۔ صرف ایک جنگ میں جو مسیلمہ کذاب سے ہوئی تھی سات سو حافظ قرآن شہید ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کا لقب چونکہ صدیق تھا اس لیے قرآن کا یہ نسخہ مصحف صدیقی کہلاتا تھا۔ بعد میں قرآن کے تمام نسخے اسی مصحف صدیقی سے نقل کیے گئے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنی زندگی ہی میں حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا۔ انھوں نے یہ فیصلہ مسلمانوں کے مشورے سے کیا تھا۔ موت سے پہلے آپؓ نے حضرت عمرؓ کے حق میں وصیت لکھوائی اور اس کے بعد مسجد نبوی میں جا کر جہاں تمام مسلمان جمع تھے لوگوں سے اپنے اس فیصلے کی ایک بار پھر تصدیق کرائی۔ آپؓ نے عوام سے پوچھا:

''میں نے اپنے کسی رشتہ دار کو نہیں بلکہ عمرؓ کو جانشین مقرر کیا ہے تو کیا تم لوگ اُن کے انتخاب سے راضی ہو؟''

اور تمام لوگوں نے اتفاق رائے سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کو پسند کیا۔

حضرت عمرؓ

حضرت عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے صحابیوں میں سے تھے لیکن وہ اسلام لانے سے پہلے مسلمانوں کے دشمن تھے۔ ایک روز وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادے سے گھر سے نکلے لیکن خدا نے ان کو ایسی ہدایت دی کہ وہ قتل کرنے کے بجائے اسلام لے آئے۔ وہ بڑے بہادر اور نڈر تھے۔ ان کے اسلام لانے سے مسلمانوں کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ مدینہ پہنچ کر حضرت ابوبکرؓ کی طرح حضرت عمرؓ نے بھی آنحضرتؐ کے ساتھ تمام بڑی لڑائیوں میں حصہ لیا۔

حضرت عمرؓ کے خلیفہ مقرر ہو جانے کے بعد لڑائی پورے زور سے شروع ہوگئی۔ قادسیہ کے میدان میں ایک صحابی سعدؓ بن وقاص کی سپہ سالاری میں تیس ہزار مسلمانوں نے ساٹھ ہزار ایرانیوں کو شکست دی اور شام میں یرموک کے میدان میں حضرت خالدؓ بن ولید کی سپہ سالاری میں چالیس ہزار مسلمانوں نے ایک لاکھ سے زیادہ عیسائیوں کو شکست دی۔ مسلمانوں کے جوش و خروش کا آتش پرست ایرانی اور عیسائی رومی مقابلہ نہ کر سکے۔ اور کر بھی کیسے سکتے تھے۔ مسلمان

سمجھتے تھے کہ وہ اپنے لیے نہیں خدا کے لیے لڑ رہے ہیں اور دنیا سے بُرائی کو ختم کرنے کے لیے اپنی جانیں دے رہے ہیں۔ اس لیے ان کو موت کا ڈر نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ خدا ان کو اجر دے گا۔ یہ جذبہ آتش پرستوں اور عیسائیوں میں نہیں تھا۔ اس لیے وہ ہر جگہ ہارنے لگے اور مسلمان ہر جگہ کامیاب ہوتے گئے۔ دس سال کے عرصے میں مسلمانوں نے ایرانی سلطنت کو ختم کر دیا اور رومیوں سے شام فلسطین اور مصر کے زرخیز ملک چھین لیے۔ فتوحات کی یہ داستان بڑی دلچسپ اور ولولہ انگیز ہے اس لیے ہم اس کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

عراق اور ایران کی فتح

قادسیہ کی جنگ تاریخ اسلام کی فیصلہ کن جنگوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس جنگ میں ایرانیوں کو ایسی شکست ہوئی کہ وہ اپنے دارالحکومت مدائن کو بھی نہیں بچا سکے جو دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر اس جگہ واقع تھا جہاں اب بغداد آباد ہے۔ مسلمان جب دریا کے کنارے پہنچے تو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے خدا کا نام لے کر اپنا گھوڑا دجلہ میں ڈال دیا۔ اپنے سردار کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر باقی مسلمانوں نے بھی اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے اور اس طرح پوری فوج بغیر پُل کے دریا کو پار کر گئی۔ ایرانی یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان دریا کو پار نہ کر سکیں گے لیکن جب مسلمانوں نے دریا پار کر لیا تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ایسے ڈرے کہ دیو آ گئے، دیو آ گئے، کہتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے اور مسلمانوں نے ان کے دارالسلطنت مدائن پر آسانی سے قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں نے اپنی اس شاندار کامیابی پر سب سے پہلے نماز شکرانہ پڑھی اور اس کے بعد جمعہ کی نماز کسریٰ کے شاہی محل میں ادا کی۔

حضرت سعدؓ نے جب شاہی خزانہ اور مال و اسباب مدینہ روانہ کیا تو حضرت عمرؓ اس کو دیکھ کر رو پڑے۔ لوگوں نے پوچھا کہ ''یہ تو خوشی کی بات ہے آپ روتے کیوں ہیں؟'' حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ''میں اس لیے روتا ہوں کہ مال و دولت کی اس کثرت میں مجھے مسلمانوں کے زوال کے آثار نظر آ رہے ہیں'' مدائن کی فتح کے بعد مسلمان جلد ہی پورے عراق اور خوزستان کو اسلامی حکومت کے دائرے میں لے آئے۔

حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ اب مسلمان اور آگے نہ بڑھیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کاش

ہمارے اور ایران کے درمیان آگ کا پہاڑ حائل ہو جاتا کہ نہ ہم ایران پر حملہ کر سکتے اور نہ ایران ہمارے اوپر۔ لیکن ایرانی مجوسی اپنے علاقوں کی واپسی کے لیے برابر حملے کرتے رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مجبور ہو کر عام لشکر کشی کا حکم دینا پڑا۔ عراق اور ایران کی سرحد کے قریب نہاوند کے مقام پر ایرانیوں سے پھر ایک بڑی جنگ ہوئی۔ اس موقع پر ایرانیوں نے قادسیہ سے بھی زیادہ فوج جمع کر لی تھی۔ لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں یہ تعداد ان کے کام نہ آئی۔ جنگ میں تیس ہزار ایرانی کام آئے اور ان کو شکست فاش اٹھانی پڑی۔ اس معرکہ میں اسلامی فوج کے سپہ سالار نعمان بن مقرن بھی شہید ہو گئے۔ نہاوند کی اس لڑائی کو فتح الفتوح کہا جاتا ہے یعنی ایسی فتح جو کئی فتحوں کے برابر ہو۔ نہاوند کی شکست نے ایرانیوں کی کمر توڑ دی اور وہ اس کے بعد کہیں بھی جم کر مقابلہ نہ کر سکے۔ اسلامی فوج کے مختلف دستے ایران کے مختلف حصوں کی طرف روانہ کر دیئے گئے جو چار پانچ سال کے اندر اندر پورے ایران کو اسلام کے سیاسی اقتدار کے تحت لے آئے۔

ایران کی فتح کے سلسلے میں جن مسلمان سپہ سالاروں نے نمایاں کارنامے انجام دیئے ان میں احنف بن قیس کا نام سب سے نمایاں ہے۔ جس طرح حضرت سعد فاتح عراق کہلاتے ہیں اسی طرح احنف فاتح خراسان کہلاتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ خراسان فتح کیا بلکہ ساسانی حکمران یزدگرد کو ایران کی حدود سے باہر نکال دیا اور اس کام کو مکمل کر دیا جو حضرت خالد نے شروع کیا تھا۔ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی پوری ہوگئی کہ ایران کی ساسانی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔

یزدگرد کے ملک بدر ہونے کے بعد ایران کے مجوسیوں نے مسلمانوں سے صلح کر لی۔ حضرت احنف نے جب حضرت عمر کو ان فتوحات کی خبر دی تو حضرت عمر نے مسلمانوں کو مسجد نبوی میں جمع کر کے خوشخبری سنائی اور کہا:

”آج مجوسیوں کی سلطنت برباد ہوگئی۔ اب ان کے ملک کی ایک چپہ زمین بھی ان کے قبضہ میں نہیں کہ وہ مسلمانوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچا سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی زمین، ان کے ملک اور ان کی دولت کا تم کو وارث بنایا ہے کہ وہ تم کو آزمائے۔ اس لیے تم اپنی حالت نہ بدلو، ورنہ خدا بھی تمہاری جگہ دوسری قوم کو بدل دے گا۔ مجھ کو اس امت کے لیے خود اس

کے افراد سے خوف ہے"

شام و مصر کی فتح

شام و مصر کی فتح کے سلسلے میں مسلمانوں نے جو کارنامے انجام دیئے وہ ایران کی فتح سے کم حیرت انگیز نہیں تھے۔ رومی یا بازنطینی سلطنت دنیا کی طاقت ورترین حکومتوں میں شمار ہوتی تھی اور رومی حکمران ہَرقل شاید اپنے دَور کا سب سے بڑا سپہ سالار تھا۔ اس نے چند سال پہلے ایران کے شہنشاہ خسرو پرویز کو مسلسل شکستیں دی تھیں لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں ہَرقل بھی بے بس ہو گیا۔ مسلمانوں کی مسلسل کامیابیوں کو دیکھ کر اس نے ایک مرتبہ اپنے ساتھیوں سے پوچھا!

"جب عرب تم سے تعداد، اسلحہ اور ساز و سامان، غرض ہر چیز میں کم ہیں تو پھر تم ان کے مقابلے میں کیوں کامیاب نہیں ہوتے"

اس پر ایک شخص نے جواب دیا کہ:

"عرب کے اخلاق ہمارے اخلاق سے اچھے ہیں' وہ رات کو عبادت کرتے ہیں اور دن کو روزہ رکھتے ہیں، وہ کسی پر ظلم نہیں کرتے، ایک دوسرے سے برابری کا سلوک کرتے ہیں، اس کے برخلاف ہمارا یہ حال ہے کہ ہم شراب پیتے ہیں، بدکاریاں کرتے ہیں، وعدے کی پابندی نہیں کرتے، دوسروں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہر کام میں جوش و استقلال ہوتا ہے اور ہمارے کام ان خوبیوں سے خالی ہوتے ہیں"

یرموک کی جنگ قادسیہ کی طرح فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ اس میں ستر ہزار سے لے کر ایک لاکھ تک رومی کام آئے جب کہ اس کے مقابلے میں صرف تین ہزار مسلمان شہید ہوئے یہ جنگ حضرت خالدؓ بن ولید کی حیرت انگیز فوجی صلاحیت کا ثبوت ہے جو عراق کی ابتدائی فتوحات کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے شام آ گئے تھے اور یہاں اسلامی فوجوں کی کمان سنبھال لی تھی۔ جب قیصر روم ہَرقل کو یرموک کے میدان جنگ میں رومیوں کی شکست کی خبر ملی تو وہ نہایت حسرت و افسوس کے ساتھ شام کو الوداع کہہ کر قسطنطنیہ چلا گیا۔

شام کی فتح کے سلسلے میں ایک اہم واقعہ بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ ہے۔ بیت المقدس جس کو یروشلم بھی کہا جاتا ہے، شام کے علاقے فلسطین میں واقع ہے اور مسلمانوں کا قبلہ

اول اسی شہر میں تھا۔ اور یہیں وہ مقام تھا جہاں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معراج کے موقع پر آسمان کی سمت روانہ ہوئے تھے۔ جب مسلمانوں نے اس مقدس شہر کا محاصرہ کرلیا تو عیسائی اس شرط پر شہر کو حوالے کرنے اور صلح کرنے پر تیار ہو گئے کہ حضرت عمرؓ خود آ کر صلح کا معاہدہ لکھیں۔ جب حضرت عمرؓ کو اطلاع دی گئی تو وہ تیار ہو گئے اور مدینہ میں حضرت علیؓ کو اپنا جانشین مقرر کر کے بیت المقدس کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ سفر انھوں نے اس سادگی سے کیا کہ صرف ایک غلام ان کے ساتھ تھا اور اونٹ پر ایک مرتبہ وہ خود بیٹھتے تھے اور دوسری مرتبہ غلام بیٹھتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے کپڑے بھی اتنے سادہ تھے کہ مسلمان آپؓ کو ان کپڑوں کے ساتھ شہر کے متمدن باشندوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے جھجک رہے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے ان کو خبردار کیا کہ ہماری عزت اسلام کی وجہ سے ہے کپڑوں کی وجہ سے نہیں۔ چنانچہ آپ ان ہی کپڑوں میں بیت المقدس میں داخل ہوئے اور عیسائیوں کو ایک صلح نامہ لکھ کر دیا جس میں ان کے جان و مال اور مذہب کی حفاظت کی ضمانت دی۔ اسی صلح نامہ کی رُو سے حضرت عمرؓ نے مقامی عیسائیوں کے مطالبہ پر یہودیوں کو بیت المقدس سے خارج کر دیا۔ اب مسلمانوں کا قبلۂ اول بھی ان کے اپنے قبضہ میں آ گیا۔ مسلمانوں نے حضرت سلیمانؑ کی بنائی ہوئی مسجد کی جو ہیکل سلیمانی کہلاتی تھی تجدید کی۔ مسجد اقصیٰ یہی مسجد کہلاتی ہے۔

شام اور فلسطین سے اگرچہ رومی خارج کر دیئے گئے لیکن وہ مصر کی طرف سے اب بھی مسلمانوں کے لیے خطرہ ہو سکتے تھے۔ ایک مشہور صحابی حضرت عمروؓ بن عاص نے جو شام کی لڑائیوں میں شریک تھے، حضرت عمرؓ سے مصر پر حملہ کرنے کی اجازت مانگی۔ اجازت ملنے پر انھوں نے دو تین سال کے اندر پورا مصر فتح کرلیا۔ رومیوں کے زمانہ میں بندرگاہ اسکندریہ مصر کا دارالحکومت تھا۔ اب مسلمانوں نے دریائے نیل کے کنارے فسطاط کے نام سے ایک نیا شہر آباد کیا۔

حضرت عمروؓ بن عاص نے کچھ مدت بعد مغرب میں برقہ اور طرابلس کو بھی اسلامی خلافت کی حدود میں شامل کرلیا۔ یہ وہ علاقہ ہے جو آج کل لیبیا کہلاتا ہے۔

اصلاحات

حضرت عمرؓ نے کل ساڑھے دس سال خلافت کی لیکن اس مختصر سے عرصہ میں انھوں نے

ایک ایسی عظیم الشان حکومت قائم کر دی جو اپنے رقبہ اور طاقت کے لحاظ سے اپنے زمانہ کی سب سے بڑی حکومت تھی۔ حضرت عمرؓ کا عہد صرف فتوحات کی وجہ سے مشہور نہیں ہے بلکہ عدل و انصاف، رعایا پروری اور انتظام حکومت کی خوبی کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔

آپؓ کے عہد میں پہلی مرتبہ مختلف انتظامی محکمے قائم کیے گئے اور سرکاری آمدنی اور خرچ کا باقاعدہ حساب تیار کیا گیا۔ یہ محکمے دیوان کہلاتے تھے۔ انتظام حکومت کے سلسلے میں حضرت عمرؓ نے جو اقدامات کیے اور اصلاحات جاری کیں ان کو تاریخ اسلام میں حضرت عمرؓ کی ''اولیات'' کہا گیا ہے یعنی وہ کام جو سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے کیے۔ ان ''اولیات'' کی فہرست بہت لمبی ہے۔ ذیل میں ان کی مختصر فہرست دی جاتی ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ آپ کی اصلاحات کتنی اہم اور ہمہ گیر تھیں۔

۱۔ مملکت کو صوبوں میں تقسیم کیا۔

۲۔ فوجی محکمہ قائم کیا۔

۳۔ مال کا محکمہ قائم کیا۔

۴۔ پولیس کا محکمہ قائم کیا جس کو ''احداث'' کہا جاتا تھا۔

۵۔ عدالتیں قائم کیں۔

۶۔ بیت المال قائم کیا۔

۷۔ زمین کی پیمائش کرائی۔

۸۔ مردم شماری کرائی۔

۹۔ جیل خانہ قائم کیا۔

۱۰۔ خبریں حاصل کرنے کے لیے پرچہ نویس مقرر کیے۔

۱۱۔ فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔

۱۲۔ اماموں اور موذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں۔

۱۳ مکتب اور مدرسے قائم کیے اور استادوں کی تنخواہیں مقرر کیں۔

۱۴۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان چوکیاں قائم کیں اور سرائیں بنوائیں۔

حضرت عمرؓ کی ان اصلاحات کے بعد اسلامی خلافت، جو پہلے ہی رقبے کے لحاظ سے دنیا

کی عظیم ترین سلطنت بن چکی تھی، انتظامی لحاظ سے بھی اپنے دور کی ایک نہایت منظم حکومت میں تبدیل ہوگئی۔

حضرت عمرؓ کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپؓ نے اپنے عہد میں تمام مسلمانوں کے وظیفے مقرر کر دیے تھے اور وہ اس سلسلے کو پوری مملکت میں پھیلا دینا چاہتے تھے۔ اس بات کو آپ اتنی اہمیت دیتے تھے کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کا وظیفہ مقرر کر دیتے تھے۔

پہلے آپ نے یہ قاعدہ بنایا تھا کہ جب بچہ دو سال کا ہو جاتا تھا اور ماں کا دودھ پینا چھوڑ دیتا تھا تب وظیفہ مقرر کیا جاتا تھا لیکن ایک رات جب کہ وہ مدینہ میں گشت لگا رہے تھے انھوں نے دیکھا کہ ایک بچہ رو رہا ہے اور اس کی ماں دودھ نہیں پلاتی۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے عورت سے پوچھا۔ ''تم اس بچے کو دودھ کیوں نہیں پلاتیں''

''میں اس کا دودھ چھڑانا چاہتی ہوں کیونکہ عمر اس وقت تک وظیفہ مقرر نہیں کرتا جب تک بچہ دودھ نہ چھوڑ دے'' عورت نے جواب دیا۔

جب حضرت عمرؓ نے یہ سنا تو ان کو بڑا افسوس ہوا کہ میرے اس حکم کی وجہ سے معلوم نہیں کتنے بچے ماں کے دودھ سے محروم رہ جاتے ہوں گے۔ اس کے بعد انھوں نے حکم جاری کر دیا کہ بچہ کے پیدا ہوتے ہی اس کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

وظیفوں کا یہ نظام بڑی انقلابی نوعیت کا تھا۔ اس کے ذریعے دنیا میں پہلی مرتبہ ایک ایسی ریاست قائم کی گئی جس کو جدید اصطلاح میں رفاہی مملکت کہا جاتا ہے اور جس میں حکومت عوام کی بنیادی ضرورتوں کی کفیل ہوتی ہے۔

حضرت عمرؓ بھی حضرت ابوبکرؓ کی طرح بیت المال کا روپیہ اپنی ذات پر خرچ نہیں کرتے تھے۔ وہ اس آمدنی کو قوم کا حق سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنی تنخواہ مقرر کر لی تھی اور یہ تنخواہ اتنی ہی تھی جو عام مسلمانوں کی تھی۔

حضرت عمرؓ نے پہلی مرتبہ اپنے لیے امیر المومنین کا لقب اختیار کیا ہے۔ اس کے بعد جس قدر خلفاء ہوئے وہ سب امیر المومنین کہلاتے تھے۔

حضرت عمرؓ اگرچہ اتنی بڑی سلطنت کے حکمران تھے لیکن ان کی زندگی حضرت ابوبکرؓ کی طرح سادہ تھی۔ انھوں نے نہ کوئی مکان بنایا اور نہ مال و دولت جمع کی۔ ان پر ہر شخص اعتراض

کر سکتا تھا اور مقدمہ چلا سکتا تھا۔ ایک مرتبہ مالِ غنیمت میں چادریں بھی آئیں۔ یہ چادریں مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ حضرت عمرؓ کے حصہ میں بھی ایک چادر آئی۔ حضرت عمرؓ یہ چادر پہنے مسجد میں تقریر کر رہے تھے کہ ایک بدو یعنی دیہات کا عرب اٹھا اور اس نے کہا:

''عمرؓ ہم تمھاری بات اس وقت سنیں گے جب تم یہ بتادو گے کہ تمھارے پاس اتنی بڑی چادر کیسے آ گئی جب کہ مسلمانوں کے حصہ میں چھوٹی چادر آئی ہے''

حضرت عمرؓ نے اس کو بتایا کہ میرے حصہ کی چادر چونکہ چھوٹی تھی اس لیے میں نے اپنے بیٹے کے حصے کی چادر لے کر جوڑ لگایا ہے۔

حضرت عمرؓ اس کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ رعایا پر ظلم نہ ہو۔ مدینہ میں وہ خود راتوں کو گشت کرتے تھے۔ حج کے موقع پر جب سلطنت کے ہر حصہ کے مسلمان مکہ پہنچتے تھے تو حضرت عمرؓ ان سے پوچھا کرتے تھے کہ ان کا حاکم یا والی کیسا انتظام کرتا ہے۔ ان والیوں کو حج کے موقع پر حاضر ہونے کا حکم تھا۔ جب لوگ کوئی شکایت کرتے تھے تو حضرت عمرؓ ان سے جواب طلب کرتے تھے اور ان کی شکایت رفع کرتے تھے۔

ہجری کا سنہ جو اسلامی دنیا میں رائج ہے حضرت عمرؓ کا قائم کیا ہے۔ اس کا آغاز اس سال سے ہوتا ہے جس سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی۔

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں تین شہر قائم کیے۔ ان کے نام کوفہ، بصرہ اور فسطاط ہیں۔ بعد میں یہ تینوں شہر اسلامی دنیا کے بہت بڑے شہر بن گئے۔

حضرت عمرؓ نے زراعت کی ترقی کے لیے کئی نہریں کھدوائیں اور حکومت کے انتظام کے لیے کئی محکمے اور دفتر قائم کیے۔ فتوحات، انتظامِ حکومت، تدبر، عدل و انصاف، رعایا کی خیر خواہی اور حکمران کی حیثیت سے ذمہ داری کا احساس حضرت عمرؓ کے وہ کارنامے اور خوبیاں ہیں جن کی مثال دنیا کا کوئی دوسرا حکمران پیش نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخوں میں ان کو فاروقِ اعظم کہا جاتا ہے اور وہ بعد کے حکمرانوں کے لیے ایک ایسا مثالی نمونہ بن گئے جس کی ہر اچھے حکمران نے تقلید کرنے کی کوشش کی۔

یہ اچھا حکمران ساڑھے دس سال کی خلافت کے بعد ایک ایرانی مجوسی ابولولو، کے خنجر کا شکار ہو گیا۔ وہ صبح کی نماز پڑھا رہے تھے کہ اس مجوسی نے ان پر حملہ کر دیا اور وہ زخموں کی تاب نہ لا کر

دوسرے دن وفات پا گئے۔

آپؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار کے پہلو میں حضرت ابوبکرؓ کے برابر دفن کیا گیا۔

حضرت عثمانؓ

حضرت عمرؓ نے بھی حضرت ابوبکرؓ کی طرح اپنے بعد اپنی اولاد یا رشتہ داروں میں سے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا۔ آپؓ نے اپنی وفات سے پہلے چھ آدمیوں پر مشتمل ایک مجلس بنا دی تھی اور کہا تھا کہ یہ لوگ خود اپنے میں سے ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں۔ آپؓ نے یہ ہدایت بھی دی کہ جو شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر زبردستی امیر بننے کی کوشش کرے اسے قتل کر دیا جائے۔

ان بزرگوں کے نام جو انتخابی مجلس میں شامل تھے یہ ہیں:

حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ بن وقاص اور حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف۔

یہ تمام صحابی تھے۔ اسلام کی انھوں نے بڑی خدمت کی تھی اور یہ ان دس لوگوں میں سے تھے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت میں جانے کی خوشخبری دی تھی۔

اس مجلس نے آخر کار حضرت عبدالرحمن بن عوف کو خلیفہ تجویز کرنے کا اختیار دے دیا۔ حضرت عبدالرحمنؓ نے عام لوگوں میں چھپ پھر کر معلوم کرنے کی کوشش کی کہ عوام کا رجحان زیادہ کس طرف ہے۔ انھوں نے حج سے واپس گزرتے ہوئے قافلوں سے بھی دریافت کیا اور استصواب عام سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ لوگ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے حق میں ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد انھوں نے حضرت عثمانؓ کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ انتخاب کے بعد مجمع عام میں حضرت عثمانؓ کی خلافت کی بیعت ہوئی۔

حضرت عثمانؓ بھی ان صحابیوں میں سے ہیں جو شروع میں اسلام لے آئے تھے۔ انھوں نے رسول پاکؐ کا ہر موقع پر ساتھ دیا۔ حضرت عثمانؓ تجارت کرتے تھے اور ان کا شمار قریش کے دولت مند ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ ان کی دولت سے عہد رسالت میں مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں ایک مہم کے سلسلے میں آپؓ نے ایک ہزار اونٹ، پچاس گھوڑے اور پوری فوج کے لیے غلہ فراہم کیا تھا۔

حضرت عثمانؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد بھی تھے۔ رسول پاکؐ نے اپنی دو صاحبزادیوں حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ کی شادی یکے بعد دیگرے آپؓ سے کی تھی۔ حضرت عثمانؓ کو جس وقت خلافت ملی اس وقت ان کی عمر ستر سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔

حضرت عثمانؓ نے تقریباً بارہ سال خلافت کی۔ (۲۴ھ تا ۳۵ھ) ان کے زمانہ میں بھی کئی فتوحات ہوئیں اور اسلامی حکومت پہلے سے بھی زیادہ بڑی ہو گئی۔ مشرق میں غزنی اور کابل تک کا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا اور مغرب میں تونس پر، جو اس زمانہ میں افریقہ کہلاتا تھا، مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ ایران کا آخری بادشاہ یزدگرد حضرت عثمانؓ ہی کے زمانے میں مارا گیا اور اس طرح اس کی طرف سے مسلمانوں کو اطمینان ہوا۔ ایشیائے کوچک میں بھی فتوحات ہوئیں۔

حضرت عثمانؓ کے عہد کا ایک بڑا کارنامہ بحری فوج کی تنظیم ہے۔ اب تک مسلمانوں نے تمام لڑائیاں خشکی میں لڑی تھیں اور وہ سمندری لڑائیوں سے قطعی ناواقف تھے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں مسلمانوں نے پہلی مرتبہ بحری بیڑہ تیار کیا۔

بحری بیڑہ تیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ رومی اگرچہ شام اور مصر سے نکال دیئے گئے تھے لیکن ان کے پاس ایک طاقتور بحری بیڑہ تھا جس کی مدد سے وہ شام اور مصر کے ساحلوں پر حملہ کرتے رہتے تھے۔ ان حملوں کی روک تھام کے لیے شام کے والی یا گورنر امیر معاویہؓ نے حضرت عمرؓ سے بحری بیڑہ بنانے کی اجازت مانگی تھی۔ لیکن حضرت عمرؓ مسلمانوں کو سمندر کے خطروں میں ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے انھوں نے اجازت نہیں دی۔ بعد میں حضرت عثمانؓ نے اجازت دے دی۔ چنانچہ امیر معاویہؓ نے نہ صرف شام کے ساحل کی کامیاب حفاظت کی بلکہ قبرص کا جزیرہ بھی رومیوں سے چھین لیا۔ ان بحری لڑائیوں میں امیر معاویہؓ کے علاوہ مصر کے والی عبداللہ بن ابی سرح نے بھی بڑا نام پیدا کیا جنھوں نے دو سو جنگی جہازوں سے چھ سو جنگی جہازوں پر مشتمل رومی بحری بیڑہ کو شکست فاش دی۔ اس کامیاب بحری جنگ کے بعد اسلامی خلافت بحیرۂ روم کی ایک بڑی بحری طاقت بن گئی۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں رعایا کے آرام کے لیے سڑکیں، پل اور مسافر خانے بنائے گئے۔ انھوں نے مسجدوں میں تنخواہ دار موذن رکھے۔ مسجد نبویؐ کی دوبارہ تعمیر کی اور اسے وسیع اور شاندار بنا دیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے جو وظیفے مقرر کیے تھے حضرت عثمانؓ نے ان کو جاری

رکھا۔ ان کے زمانے میں اتنی خوشحالی ہوگئی تھی کہ لوگ حضرت عثمان کے عہد کو حضرت عمرؓ کے عہد پر بھی فوقیت دینے لگے تھے۔

آپؓ کا ایک اور اہم کارنامہ مسلمانوں کو قرآن مجید کی ایک قرأت پر متحد کرنا ہے۔ قرآن مجید، حضرت ابو بکرؓ کے زمانے ہی میں کتابی شکل میں مرتب ہو گیا تھا، لیکن اس نسخے کی اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ قرآن مجید کے بعض الفاظ کا املا اور تلفظ مختلف طریقوں سے ہوسکتا ہے۔ چنانچہ مختلف صحابہ ان الفاظ کو مختلف طریقوں سے لکھتے اور پڑھتے تھے لیکن اس سے معنی پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں غیر عرب باشندوں نے کثرت سے اسلام قبول کر لیا۔ اُن کی زبان چونکہ عربی نہ تھی اس لیے ان میں قرآن مجید کی قرأت پر اختلاف پیدا ہونے لگے۔ حضرت عثمانؓ نے جب یہ دیکھا تو عہد صدیقی کا مدون کیا ہوا نسخہ جو حضرت عمرؓ کی صاحبزادی ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس محفوظ تھا منگایا اور اس کی نقلیں کرا کے تمام اسلامی ملکوں میں بھجوا دیں اور اس کے علاوہ قرآن کے جو نسخے تھے انھیں تلف کرا دیا۔ اس طرح حضرت عثمان نے قرآن مجید پر اختلاف کا راستہ بند کر دیا۔ اس کارنامے کی وجہ سے حضرت عثمانؓ کو جامع قرآن بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت عثمانؓ بڑے مالدار تھے اس لیے وہ نسبتاً آرام کی زندگی گزارتے تھے۔ لیکن وہ اپنا تمام خرچ ذاتی آمدنی سے پورا کرتے تھے۔ بیت المال سے کچھ نہیں لیتے تھے۔ اپنی ذاتی رقم سے سینکڑوں بیواؤں، یتیموں اور رشتہ داروں کی پرورش کرتے تھے اور ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کرتے تھے۔ دولت مند ہونے کی وجہ سے آپؓ کو عثمان غنیؓ بھی کہا جاتا ہے۔ حیا اور شرم ایک مسلمان کے دین کا حصہ ہے اور اس معاملے میں تمام صحابیؓ مسلمانوں کے لیے نمونہ ہیں۔ لیکن حیا اور شرم کے معاملے میں حضرت عثمانؓ کو تمام صحابیوں میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کی حیاء سے تو فرشتے بھی شرماتے ہیں۔

حضرت عثمانؓ انتہائی رحم دل اور نرم دل انسان تھے۔ ایک مرتبہ آپؓ نے کسی بات پر ایک غلام کے کان اینٹھے لیکن بعد میں اتنا افسوس ہوا کہ اپنے کان غلام کے سامنے کر دیئے اور کہا کہ لو تم بدلہ لے لو۔

حضرت عثمانؓ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ آپؓ کہتے تھے کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ خود بھی تنگ دست رہتے تھے اور اپنے عزیزوں کو بھی تنگ دست اور محتاج رکھتے تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے عزیزوں کے ساتھ اچھا سلوک کروں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ دوسروں کے ساتھ اپنے عزیزوں کی بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ اور اس مقصد کے لیے ذاتی مال کے علاوہ بیت المال سے بھی رقم دیتے تھے۔ آپؓ نے حکومت میں بھی اپنے عزیزوں کو بڑے بڑے عہدے دیئے۔ حضرت عثمانؓ کے اس طرزِ عمل سے کچھ لوگوں میں بے چینی اور شکایت پیدا ہوئی۔ اسلام سے پہلے بنی ہاشم اور بنی اُمیہ کے قبیلوں میں قریش کی سرداری کے مسئلہ پر رقابت رہتی تھی۔ اسلام کے بعد یہ جذبہ دب گیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا تعلق ان میں سے کسی قبیلہ سے نہیں تھا اور انھوں نے اپنے رشتہ داروں کو بھی سرکاری عہدے نہیں دیئے تھے۔ حضرت عمرؓ تو اس معاملے میں اتنی احتیاط رکھتے تھے کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے کہا کرتے تھے کہ اگر آپ میں سے کوئی خلیفہ ہو جائے تو اپنے قبیلے والوں کو مسلمانوں کے سروں پر مسلط نہ کیجیے گا۔ لیکن حضرت عثمانؓ ایسا نہ کر سکے۔ ان کا بنی امیہ سے تعلق تھا اس لیے جب انھوں نے اپنے خاندان والوں کو بڑے بڑے عہدے دیئے تو بنی ہاشم اور بنو امیہ کی سوئی ہوئی رقابت پھر جاگ اٹھی۔ لوگوں نے حضرت عثمانؓ پر طرح طرح کے الزام لگانا شروع کر دیے۔ حضرت عثمانؓ بادشاہ یا آمر نہیں تھے کہ مخالفت کرنے والوں کی زبان زبردستی بند کر دیتے۔ آپؓ نے الزامات کی تحقیقات کے لیے فوراً ایک غیر جانبدار کمیشن قائم کر دیا جس نے عراق، شام اور مصر جا کر معاملات کی تحقیقات کی اور تمام الزاموں کو بے بنیاد قرار دیا۔ لیکن حضرت عثمانؓ کی نرم دلی نیکی اور بڑھاپے سے آپؓ کے بعض عزیزوں نے، خاص کر آپؓ کے کاتب مروان بن حکم نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور فتنہ کی آگ پھر بھڑک اٹھی۔

ہنگامہ پیدا کرنے والے لوگ مدینہ کے نہیں تھے۔ ان کا تعلق بصرہ، کوفہ اور مصر کے ان گروہوں سے تھا جن کی صحیح اسلامی تربیت نہیں ہوئی تھی۔ ان میں کوئی ممتاز آدمی شامل نہیں تھا اور ان کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ لوگ اچانک مدینہ میں گھس آئے۔ حضرت عثمانؓ کے مکان کو گھیر لیا اور اُن سے خلافت چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا۔ حضرت عثمانؓ نے یہ مطالبہ ماننے سے

انکار کر دیا اور کہا کہ میں تلوار کے زور سے خلیفہ نہیں بنا ہوں کہ مجھ کو زبردستی علیحدہ کیا جائے۔ میں مسلمانوں کی مرضی سے خلیفہ منتخب ہوا ہوں۔ اس موقع پر بعض صحابیوںؓ نے حضرت عثمانؓ کو ہنگامہ کرنے والوں کے خلاف طاقت استعمال کرنے کا مشورہ بھی دیا لیکن آپؓ نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا اور کہا کہ میں اپنی ذات کی وجہ سے مسلمانوں میں خونریزی کا آغاز نہیں کرنا چاہتا۔ آپؓ اس فیصلہ پر ثابت قدم رہے یہاں تک کہ شورش پسندوں نے گھر میں گھس کر آپؓ کو شہید کر دیا۔

"حقیقت یہ ہے کہ اس انتہائی نازک موقع پر حضرت عثمانؓ نے وہ طرزِ عمل اختیار کیا جو ایک خلیفہ اور ایک بادشاہ کے فرق کو نمایاں کرتا ہے۔ ان کی جگہ کوئی بادشاہ ہوتا تو اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے کوئی بازی کھیل جانے میں بھی اسے باک نہ ہوتا خواہ کتنی ہی تباہی اور بربادی ہوتی۔ مگر وہ خلیفہ راشد تھے۔ اپنی جان دینے کو اس سے ہلکی چیز سمجھتے تھے کہ ان کی بدولت وہ حُرمتیں پامال ہوں جو ایک مسلمان کو ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہونی چاہییں"[1]

حضرت علیؓ

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد شورش پسندوں نے حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت علیؓ سے خلافت قبول کرنے کو کہا لیکن ہر ایک نے انکار کر دیا۔ آخر کار اہل مدینہ حضرت علیؓ کے پاس گئے اور کہا کہ خلافت کا نظام کسی امیر کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا اور آج آپؓ کے سوا کوئی اور شخص اس منصب کے لیے آپؓ سے زیادہ مستحق نہیں۔ لوگوں کے اصرار پر آخر کار حضرت علیؓ نے خلافت قبول کر لی لیکن آپؓ نے فرمایا کہ میری بیعت خفیہ طریقہ پر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے عام مسلمانوں کی رضامندی ضروری ہے۔ چنانچہ مسجد نبویؐ میں اجتماع عام ہوا اور سترہ یا بائیس صحابہؓ کے علاوہ مہاجرین اور انصار نے آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت علیؓ کی اسلام میں بڑی خدمات ہیں۔ وہ دس برس کے تھے کہ اسلام لے آئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی جنگوں میں سب سے زیادہ شجاعت کا اظہار انھوں نے ہی کیا تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حیدر کا خطاب دیا تھا اور ایک تلوار دی تھی جس کو ذوالفقار کہتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں وہ تمام اہم فیصلوں میں شریک

---

(۱) "خلافت وملوکیت" از سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۶۶ء) صفحہ ۱۲۰

رہے۔ اور حضرت عثمانؓ کو بھی اہم موقعوں پر مشورے دیتے تھے۔ جس طرح حضرت ابوبکرؓ کو صدیق، حضرت عمرؓ کو فاروق اور حضرت عثمانؓ کو غنی کہا جاتا ہے آپؓ کو علیؓ مرتضیٰ کہا جاتا ہے۔

حضرت علیؓ کی خلافت کا آغاز بڑے مشکل اور پیچیدہ حالات میں ہوا۔ خلیفہ بننے کے بعد حضرت علیؓ کا پہلا کام حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو سزا دینا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ کسی قاتل کا نام معلوم نہیں تھا اور فسادی جو ہزاروں کی تعداد میں تھے مدینہ پر چھائے ہوئے تھے اور خود حضرت علیؓ کی فوجوں میں شامل ہو گئے تھے۔ اس مشکل کی وجہ سے حضرت علیؓ فوری طور پر قصاص لینے سے مجبور تھے۔ لیکن ان کی اس مجبوری کو بہت سے مسلمانوں نے نہیں سمجھا اور حضرت علیؓ سے جلد از جلد قصاص کا مطالبہ کیا۔ ان مطالبہ کرنے والوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب بیوی حضرت عائشہؓ اور حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ جیسے بزرگ صحابہ بھی تھے۔ یہ لوگ حضرت عائشہؓ کی سرداری میں فوج لے کر بصرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں ان کے حامیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اسی دوران حضرت علیؓ بھی وہاں پہنچ گئے۔ بصرہ کے قریب جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو حضرت عائشہؓ کی جانب سے مطالبات پیش ہوئے۔ دوسری طرف حضرت علیؓ نے اپنی مشکلات بتائیں۔ چونکہ دونوں طرف سے خلوص دل سے کوشش ہو رہی تھی اس لیے جلد ہی تصفیہ ہو گیا۔ حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ واپس ہو گئے اور حضرت عائشہؓ نے بھی واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ لیکن فسادی جو دونوں فوجوں میں موجود تھے اس صلح سے گھبرائے اور انھوں نے ایک رات کو دونوں طرف کی فوجوں پر حملہ کر دیا۔ اب ہر طرف کے لوگوں نے یہ سمجھا کہ دوسرے نے ان پر دھوکہ سے حملہ کیا ہے۔ حضرت علیؓ کو فتح ہوئی اور انھوں نے حضرت عائشہؓ کو تمام حالات سے باخبر کر دیا اور وہ مطمئن ہو کر واپس چلی گئیں۔

یہ لڑائی جنگ جمل کے نام سے مشہور ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ اونٹ پر سوار تھیں، اور اونٹ کو عربی میں جَمل کہتے ہیں۔ جنگ جمل کے بعد حضرت علی مدینہ واپس نہیں آئے، اور کوفہ کو دار الخلافہ بنا لیا۔

جنگ جمل پہلی لڑائی تھی جس میں مسلمانوں نے آپس میں ایک دوسرے کا خون بہایا۔ مسلمان آپس کے اس ٹکراؤ سے بہت رنجیدہ تھے۔ اور ان کو اتنا افسوس تھا کہ بعض صحابہؓ نے لڑائی میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ اور جب حضرت عائشہؓ کی فوجیں مدینہ سے روانہ ہوئیں تو مدینہ

کے لوگ زار و قطار رو رہے تھے۔

حضرت عائشہؓ سے تو حضرت علیؓ کا تصفیہ ہو گیا لیکن شام کے والی امیر معاویہؓ سے تصفیہ نہیں ہو سکا۔ حضرت علیؓ نے ان کو شام سے معزول کر دیا تھا۔ لیکن انھوں نے حکم نہیں مانا اور کہا کہ جب تک حضرت عثمانؓ کا قصاص نہیں لیا جائے گا میں خلافت تسلیم نہیں کروں گا۔

حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان صفین کے مقام پر جنگ جمل سے بھی بڑی لڑائی ہوئی جس میں دونوں طرف سے نوے ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ صفین کے آخری معرکے میں جو لیلۃ الحر کہلاتا ہے حضرت علیؓ تقریباً کامیابی حاصل کر چکے تھے، لیکن امیر معاویہؓ نے جب شکست کے آثار دیکھے تو قرآن کو بیچ میں واسطہ بنایا۔ ان کی فوجوں نے نیزوں سے باندھ کر قرآن بلند کیے اور کہا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اس کے مطابق فیصلہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ لڑائی بند کر دی گئی اور حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور امیر معاویہؓ کی طرف سے حضرت عمروؓ بن عاص حکم بنائے گئے اور یہ طے پایا کہ یہ دونوں جو فیصلہ کریں گے حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کو منظور ہوگا۔ دومۃ الجندل کے مقام پر مسلمانوں کا بہت بڑا اجتماع ہوا لیکن عمروؓ بن عاص کی وعدہ خلافی کی وجہ سے جو انھوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے ساتھ کی۔ یہ اجتماع کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکا اور مسلمان وہاں سے مایوس واپس لوٹے۔ بہر حال اس کے بعد حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ نے آپس کی خونریزی ختم کرنے کے لیے صلح کر لی۔

اسی زمانے میں مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ پیدا ہوا، جو خارجی کہلاتا ہے۔ حضرت علیؓ کے حامیوں میں کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ دینی معاملات میں انسان کو حکم بنانا کفر ہے اور حضرت علیؓ نے ابوموسیٰ اشعریؓ کو حکم بنانے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ قرآن کے خلاف ہے۔ چنانچہ یہ لوگ حضرت علیؓ سے علیحدہ ہو گئے۔ یہ خارجی اپنے طرز عمل میں انتہا پسند تھے اور تشدد پر ان کو یقین تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایک خوفناک منصوبہ تیار کیا۔ انھوں نے طے کیا کہ حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ اور حضرت عمروؓ بن عاص مسلمانوں میں خانہ جنگی کے ذمہ دار ہیں اس لیے ان کو قتل کر دینا چاہیے۔ چنانچہ صلح کے کچھ عرصہ بعد ایک مقررہ دن تین خارجی اس مقصد سے اپنے اپنے گھروں سے نکلے، امیر

معاویہؓ اور حضرت عمروؓ بن عاص تو کسی طرح بچ گئے لیکن تیسرے خارجی نے جس کا نام ابن ملجم تھا حضرت علیؓ کو جب کہ وہ فجر کی نماز پڑھنے مسجد جا رہے تھے شہید کر دیا۔

حضرت علیؓ نے تقریباً ساڑھے چار سال خلافت کی۔ شام اور مصر کے علاوہ باقی تمام سلطنت ان کے قبضہ میں تھی۔ ان کا عہد چونکہ خانہ جنگی میں گزرا اس لیے کوئی نیا ملک فتح نہیں کیا گیا۔

حضرت علیؓ کا انتظام سلطنت بڑی حد تک حضرت عمرؓ کی طرح تھا۔ ان کی زندگی بھی ان ہی کی طرح سادہ اور زاہدانہ تھی۔ فیصلہ کرتے وقت وہ بڑے سے بڑے آدمی کی یہاں تک کہ اپنے رشتہ داروں تک کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ وہ خود کو عام مسلمانوں کے برابر سمجھتے تھے اور ہر غلطی کی جوابدہی کے لیے تیار رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک یہودی نے آپؓ کی زرہ چرالی۔ حضرت علیؓ نے اسے دیکھ کر پہچان لیا۔ اگر وہ چاہتے تو اس یہودی سے زرہ زبردستی چھین سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور قانون کے مطابق یہودی پر عدالت میں دعویٰ کیا۔ قاضی بھی انصاف کے معاملہ میں سخت تھے۔ انھوں نے حضرت علیؓ سے ثبوت مانگا۔ حضرت علیؓ ثبوت نہ دے سکے چنانچہ قاضی نے یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس فیصلہ کا یہودی پر اتنا اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گیا اور کہا یہ تو نبیوں جیسا انصاف ہے۔ حضرت علیؓ امیر المومنین ہو کر مجھے اپنی عدالت کے قاضی کے سامنے پیش کرتے ہیں اور قاضی امیر المومنین کے خلاف فیصلہ دیتا ہے۔

حضرت علیؓ نے اپنے بعد کسی کو جانشین مقرر نہیں کیا۔ لوگوں نے جب آپؓ کے بڑے صاحبزادے حضرت حسنؓ کو خلیفہ بنانے کے متعلق پوچھا تو آپؓ نے فرمایا کہ نہ میں تم کو اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ اس سے روکتا ہوں۔ ایک اور شخص نے جب سوال کیا کہ آپؓ اپنا ولی عہد کیوں مقرر نہیں کر دیتے تو حضرت علیؓ نے جواب دیا ''میں مسلمانوں کو اُسی حالت میں چھوڑ دوں گا جس میں رسول اللہ ﷺ نے چھوڑا تھا''

حضرت علیؓ کی وفات کے بعد دار الخلافہ کوفہ کے لوگوں نے امام حسنؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا۔ امام حسنؓ مسلمانوں میں خونریزی کو پسند نہیں کرتے تھے اس لیے جب امیر معاویہؓ نے عراق پر حملہ کیا تو آپؓ نے جنگ کرنے کے بجائے امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہونا پسند کیا۔ اس طرح حضرت حسنؓ کی بے مثال قربانی نے مسلمانوں کو خانہ جنگی سے نجات دلا دی۔

آپ ؓ کی دستبرداری کے سال کو تاریخ اسلام میں عام الجماعہ کہا جاتا ہے یعنی اتحاد و اتفاق کا سال۔
خلافت سے دستبردار ہونے کے بعد حضرت حسن ؓ کوفہ چھوڑ کر مدینہ آ گئے اور وہیں نو سال بعد ۵۰ھ میں وفات پائی۔ آپ ؓ کی خلافت کی مدت چھ ماہ ہے۔

خلفائے راشدین

۱۔	حضرت ابوبکرؓ صدیق	۶۳۲ء/۱۱ھ	تا	۶۳۴ء/۱۳ھ
۲۔	حضرت عمرؓ فاروق	۶۳۴ء/۱۳ھ	تا	۶۴۵ء/۲۴ھ
۳۔	حضرت عثمانؓ غنی	۶۴۵ء/۲۴ھ	تا	۶۵۵ء/۳۵ھ
۴۔	حضرت علیؓ مرتضیٰ	۶۵۵ء/۳۵ھ	تا	۶۶۰ء/۴۰ھ

جنگ یرموک	۶۳۴ء/۱۳ھ
جنگ قادسیہ	۶۳۶ء/۱۵ھ
فتح مصر	۶۴۱ء/۲۱ھ
جنگ نہاوند	۶۴۲ء/۲۱ھ
جنگ جمل	۶۵۶ء/۳۶ھ
جنگ صفین	۶۵۷ء/۳۷-۳۶ھ

باب ۷

خلافتِ راشدہ
ایک جمہوری اور رفاہی مملکت

حضرت علیؓ کی شہادت اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ حضرت حسنؓ کی خلافت سے دستبرداری کے ساتھ اسلامی تاریخ کا دوسرا اہم دور ختم ہوگیا۔ پہلا دور عہد رسالت کا تھا جس میں سارے عرب میں اسلام پھیلا۔ اسلامی معاشرہ وجود میں آیا اور اسلامی ریاست کی بنیاد پڑی۔ دوسرا دور جو حضرت ابوبکرؓ کی خلافت سے شروع ہوا اور حضرت حسنؓ کی دست برداری پر ختم ہوا۔ اس کے بعد کے مورخین نے اسے خلافت راشدہ کا نام دیا یعنی سیدھے راستے پر چلنے والی خلافت۔ اس دور میں اسلامی حکومت نے بین الاقوامی حیثیت اختیار کرلی اور اسلامی خلافت ایک عالمی طاقت بن گئی۔

خلافت راشدہ کا سیاسی نظم ونسق بڑی حد تک وہی تھا جس کا تذکرہ حضرت عمرؓ کے حالات میں ہو چکا ہے۔ یہاں ہم خلافت راشدہ کے صرف ان پہلوؤں کا تذکرہ کریں گے جن کی وجہ سے خلافت راشدہ کو تاریخ عالم میں ایک منفرد اور امتیازی مقام حاصل ہے۔

انتظام مملکت، سیاست اور اصلاح معاشرہ کے میدان میں ان تیس سالوں میں جو کارنامے انجام دیئے گئے وہ نہ صرف اسلامی تاریخ میں بلکہ تاریخ عالم میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خلافت راشدہ کے سیاسی اور اجتماعی نظام کی بنیاد وہی تھی جو عہد رسالتؐ میں رکھی گئی تھی لیکن خلافت راشدہ کے دور میں اُس بنیاد پر ایک شاندار عمارت تعمیر کردی گئی اور دنیا کو یہ بتادیا گیا کہ اسلام کا سیاسی اور اجتماعی نظام صرف جزیرہ نمائے عرب کے خانہ بدوش باشندوں کے لیے ہی موزوں نہیں بلکہ اس کی بنیاد پر اپنے وقت کے جدید ترین تمدن کی بنیادیں استوار ہوسکتی ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ خانہ بدوش عربوں کی طرح ایران، عراق، شام اور مصر کے متمدن اور مہذب باشندوں کے لیے بھی اسلام پیغام رحمت ثابت ہوا۔

بادشاہت نہیں خلافت

یونان اور روم کی تاریخ کے ایک مختصر زمانہ کو چھوڑ کر، عہد قدیم سے لے کر انقلاب فرانس تک (۱۷۸۹ء) دنیا کا واحد نظام حکومت ملوکیت یعنی بادشاہت رہا ہے۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں بھی دنیا کے ہر ملک میں بادشاہت قائم تھی، لیکن خلافت راشدہ کا سیاسی نظام ان سب سے مختلف تھا اور بادشاہت سے اس کا دور تک کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا لیکن مسلم معاشرہ کے لوگوں نے خود یہ جان لیا تھا کہ اسلام ایک شورائی خلافت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لیے وہاں نہ کسی خاندانی بادشاہت کی بنا ڈالی گئی اور نہ کوئی شخص طاقت استعمال کر کے برسر اقتدار آیا۔ نہ کسی نے خلافت حاصل کرنے کے لیے خود کوئی دوڑ دھوپ کی، بلکہ یکے بعد دیگر چار اصحاب کو لوگ اپنی آزاد مرضی سے خلیفہ بناتے چلے گئے۔ اس سے خود بخود یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں خلافت کا صحیح طرز یہی ہے۔''[1]

ایک ممتاز صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے، جو خلافت راشدہ میں بلند عہدوں پر فائز رہے ہیں، خلافت اور بادشاہت کے فرق کو اس طرح بیان کیا ہے:

''امارت (خلافت) وہ ہے جسے قائم کرنے میں مشورہ کیا گیا ہو اور بادشاہی وہ ہے جس پر تلوار کے زور سے غلبہ حاصل کیا گیا ہو''

خلافت راشدہ میں سیاسی نظام قائم تھا اگرچہ وہ جمہوریت کی ٹھیٹ مغربی اصطلاح کے مطابق جمہوری نظام نہ تھا کیونکہ اس میں حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ عوام کو حاصل نہ تھا۔ حتیٰ کہ جدید مغربی اور اشتراکی حکومتوں کے مقابلہ میں بھی زیادہ جمہوری تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نظام میں حاکمیت صرف اللہ کو حاصل تھی۔ اللہ اور رسولؐ کے بعد عوام کو سارے حقوق حاصل تھے اور وہ کتاب و سنت کے مقرر کردہ رہنما اصولوں کے دائرے میں مکمل طور پر بالادستی رکھتے تھے۔ اللہ کی اس حاکمیت نے خلافت راشدہ کے اسلامی معاشرہ کو نہ صرف ان مظالم اور ناانصافیوں سے نجات دلادی تھی جو شخصی اور استبدادی حکومتوں کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں، بلکہ اس قسم کے مظالم، بے انصافیوں

---

(۱) ''خلافت و ملوکیت'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۸۳ مطبوعہ دسمبر ۱۹۶۶ء۔ باب ''خلافت راشدہ اور اس کی خصوصیات''

اور گمراہیوں سے بھی نجات دلائی جو جدید دَور میں عوام کی حاکمیت کے نام پر عام ہیں اور جن کی وجہ سے نہ صرف دوسری قوموں کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ خود اپنی قوم بھی نقصان اٹھاتی ہے۔[1]

مشاورتی نظام

جمہوریت کی روح آزادی رائے ہے اور یہ خصوصیت خلافت راشدہ میں پوری طرح موجود تھی۔ خلیفہ کو سربراہ ریاست کی حیثیت سے مکمل اختیارات حاصل تھے۔ لیکن وہ دو باتوں کا پابند تھا۔ ایک اسلامی قانون کی پابندی اور دوسری اہل الرائے سے مشورہ کرنا۔ حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ بننے کے بعد پہلے خطبہ ہی میں یہ بات صاف کر دی تھی کہ اگر میں کتاب وسنت کی پابندی نہ کروں تو لوگوں پر اُن کی اطاعت لازم نہیں'' اسی طرح باہمی مشورہ کرنے کے متعلق حضرت عمرؓ کا مشہور قول ہے کہ **لا خلافة الا عن المشورہ** یعنی خلافت کے لیے مشورہ لازم ہے۔ چنانچہ خلافت راشدہ کے پورے دَور کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ کوئی خلیفہ انتظام حکومت اور قانون سازی کے معاملے میں مسلمانوں کے اہل الرائے سے مشورہ کیے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتا تھا۔ لوگوں کو اظہار رائے کی پوری آزادی تھی۔ حضرت عمرؓ تو لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کریں۔ حضرت عمرؓ کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی اہم مسئلہ پیش آتا تھا تو وہ اعلان کرا دیتے تھے کہ لوگ مسجد نبویؐ میں جمع ہو جائیں۔ جب لوگ مسجد میں جمع ہو جاتے تو حضرت عمرؓ دو رکعت نماز پڑھتے اور پھر حاضرین کے سامنے مسئلہ پیش کر کے اُن کا مشورہ طلب کرتے۔ بعض اوقات بحث طول پکڑ جاتی اور کئی کئی دن جاری رہتی۔ حضرت عثمانؓ خلفاء میں سب سے زیادہ تنقید اور الزاموں کا نشانہ بنے لیکن آپؓ نے کبھی کسی کا مُنہ زبردستی بند کرنے کی کوشش نہ کی اور اپنے اوپر لگائے جانے والے الزاموں کی برسرعام صفائی پیش کی۔

---

(1) امریکہ میں ۱۹۲۰ء میں شراب نوشی ممنوع قرار دی گئی تھی لیکن بالآخر عوام کے مطالبہ پر ۱۹۳۳ء میں یہ قانون منسوخ کر دیا گیا۔ خلافت راشدہ کے دَور میں یا کسی اسلامی مملکت میں عوام کے مطالبہ پر ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اسی طرح اشتراکی ملکوں میں عدالتی کارروائی کے بغیر لوگوں کی ملکیت کو بلا معاوضہ جس طرح چھینا جاتا ہے اور اشتراکیت سے اختلاف رکھنے والوں کی زبان بندی کی جاتی ہے اور اشتراکی نظریات زبردستی تھوپے جاتے ہیں خلافت راشدہ میں ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔

قانون کی بالادستی

باہمی صلاح مشورہ اور آزادی رائے کے بعد خلافت راشدہ کی ایک اور خصوصیت قانون کی بالادستی تھی۔ آزادی رائے اور عدل و انصاف کا تقاضا صرف اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب قانون لوگوں کے حقوق کا تحفظ کرے۔ خلافت راشدہ میں انصاف کے لیے ہر جگہ عدالتیں قائم تھیں جہاں قاضیوں کے سامنے مقدمے پیش کیے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں جج کو قاضی کہا جاتا تھا۔ اگرچہ قاضیوں کا تقرر خلیفہ کرتا تھا لیکن وہ اپنے فیصلوں میں بالکل آزاد ہوتے تھے حتیٰ کہ وہ خود خلیفہ کے خلاف مقدمہ کی سماعت کر سکتے تھے۔ پچھلے باب میں اس کی مثالیں پیش کی چکی ہیں کہ خلفاء تک کو کس طرح عدالت میں طلب کرلیا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں قاضیوں کو سخت تاکید تھی کہ وہ اپنے فیصلوں میں کسی کے ساتھ رعایت نہ کریں خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے قانون کی بالادستی کی ایک اور مثال اس طرح قائم کی کہ جب اُنؓ کے صاحبزادے ابوشحمہ شراب پینے کے جرم میں پکڑے گئے تو اُن کو قانون کے مطابق کوڑے مارے گئے اور وہ مار کی تاب نہ لا کر چند دن بعد انتقال کر گئے۔

حضرت علیؓ کے زمانے میں ایک مرتبہ لوگ ایک خارجی کو پکڑ کر لائے جو برسرعام کہہ رہا تھا کہ میں علیؓ کو قتل کردوں گا۔ مگر حضرت علیؓ نے یہ کہہ کر اس کو رہا کردیا کہ جب تک وہ عملاً کوئی باغیانہ کاروائی نہیں کرتا محض زبانی مخالفت کوئی ایسا جرم نہیں جس کی وجہ سے اس کو سزا دی جائے۔

دنیا کی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے خالی ہے۔ یہ محض چند مثالیں نہیں ہیں۔ بلکہ اُس زمانہ کی رُوح کی عکاسی کرتی ہیں اور یہ سب کچھ صرف اسی نظام میں ممکن ہوسکتا ہے جس میں قانون کی برتری ہو اور اس کے ساتھ ہی اللہ کی حاکمیت تسلیم کی جاتی ہو۔

خلفائے راشدینؓ نہ صرف ذاتی طور پر عدل و انصاف کو اہمیت دیتے تھے بلکہ صوبوں اور ضلعوں کے حاکموں کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے کہ وہ لوگوں کے حقوق کی حفاظت کریں۔ حضرت عمرؓ کہتے تھے کہ:

”میں نے اپنے حاکموں کو اس لیے مقرر نہیں کیا ہے کہ وہ لوگوں کو پیٹیں اور ان کا مال چھینیں بلکہ اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ لوگوں کو دین اور نبی کا طریقہ سکھائیں۔ اگر کسی حاکم نے اس

کے خلاف عمل کیا ہو تو میرے سامنے شکایت کی جائے۔ خدا کی قسم میں اس کو سزا دوں گا''
حاکموں سے جواب طلبی کا یہ طریقہ آخر تک قائم رہا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں وہ سختی تو نہیں رہی جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تھی لیکن اس زمانے میں بھی حاکم جواب طلبی سے نہیں بچ سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں گورنروں کو ہدایت تھی کہ وہ حج کے موقع پر مکہ میں حاضر ہوا کریں۔ اس موقع پر چونکہ مملکت کے ہر حصے سے لوگ مکہ معظمہ پہنچتے تھے اس لیے لوگوں کی شکایت سننا اور ان کے حاکموں سے جواب طلب کرنا آسان تھا۔

معاشی عدل

معاشی عدل بھی انسانی معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے اور خلافت راشدہ میں اس پر پوری توجہ دی گئی۔ اس زمانہ میں سرکاری آمدنی کے پانچ بڑے ذریعے تھے۔ زمینوں کا خراج اور جزیہ۔ یہ دونوں یکسر غیر مسلموں سے لیے جاتے تھے۔ عُشر، جو زرعی پیداوار کا ٹیکس تھا، اور زکوۃ، مسلمانوں سے وصول کی جاتی تھی۔ چونکہ اس زمانے میں فتوحات بھی کثرت سے ہوئیں اس لیے مال غنیمت بھی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ مال غنیمت کے پانچ حصے کر دیئے جاتے تھے۔ چار حصے فوجیوں میں تقسیم ہو جاتے تھے اور پانچواں حصہ مرکز خلافت کو بھیج دیا جاتا تھا اور مرکزی بیت المال میں جمع ہو جاتا تھا۔ اس طرح ہر ملک اور صوبے کی مقامی آمدنی پہلے مقامی ضروریات پر صرف ہوتی تھی اور جو فاضل بچ رہتی تھی اس کو مرکزی بیت المال کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔ بیت المال کی رقم قوم کی امانت سمجھی جاتی تھی۔ خلفاء اس رقم کو نہ اپنی ذات پر خرچ کرتے تھے اور نہ اپنے رشتہ داروں پر۔ ذاتی اخراجات کے لیے خلیفہ کی تنخواہ مقرر ہوتی تھی اور اگر اس کو بھی مزید رقم کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ اس کو لینے سے پہلے ملت سے اجازت لیتا تھا۔ حضرت عثمانؓ چونکہ بہت دولت مند تھے، اس لیے وہ بیت المال سے کوئی تنخواہ نہیں لیتے تھے۔ بیت المال کو جس طرح خلفائے راشدین نے ملت کی امانت سمجھا اور اس ضمن میں جس احساس ذمہ داری کا ثبوت دیا اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اسی طرح خلفائے راشدین کے زمانہ میں دولت کو جس طرح منصفانہ طریقے سے تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ تجارت اور کاروبار میں سود نہیں لیا جاتا تھا۔ جو

لوگ تجارت کرتے تھے وہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ ان کی آمدنی میں حرام مال شامل نہ ہو۔ حکومت دولت مند لوگوں سے زکوٰۃ خود وصول کرتی تھی اور اس کی رقم محتاجوں کی امداد اور دوسرے مفید کاموں پر صرف کرتی تھی۔ جو شخص محتاج ہو جاتا تھا اس کے اخراجات حکومت خود اٹھاتی تھی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں عرب کے مسلمان، مرد، عورتوں، بچوں اور غلاموں کے جس طرح وظیفے مقرر کیے گئے وہ عوام کی معاشی کفالت کا ایک ایسا نظام تھا جس کی مثال نہ تو اسلام سے پہلے کی تاریخ میں ملتی ہے اور نہ بعد کی تاریخ میں۔ وظائف کا یہ نظام حضرت علیؓ کے زمانہ تک بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ غالباً خلافت راشدہ کی یہی خصوصیت تھی جس کی وجہ سے مشہور انگریز مورخ ایچ۔ جی۔ ویلز نے لکھا ہے کہ:

"اسلام کو دوسری قوموں پر غلبہ اس لیے حاصل ہوا کہ وہ اپنے زمانے میں سب سے اچھا سیاسی اور معاشرتی نظام تھا۔"(۱)

فتوحات میں جہاد کی رُوح

جنگ اور ملک گیری سے متعلق اسلام کے نظریہ کو عہد رسالت والے باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اسلام میں جنگ صرف خدا کی راہ میں جائز ہے اور اسی لیے اسلامی جنگ کو جہاد فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں اسلامی قوانین جنگ پر پورا پورا عمل کیا گیا اور اس طرح جنگ کی تباہ کاریوں کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ آنحضرتؐ کے بعد جب ایران اور روم سے لڑائی شروع ہو گئی تو حضرت عمرؓ نے ان لڑائیوں کو محدود رکھنے اور ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ عراق کی فتح کے بعد وہ نہیں چاہتے تھے کہ جنگ ایران تک پھیلے، اسی طرح انہوں نے مصر پر لشکر کشی کی اجازت مجبور ہو کر دی۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بھی زیادہ تر لڑائیاں بغاوتوں کو کچلنے کے سلسلے میں ہوئیں یا ان لڑائیوں کو قطعی نتیجے تک پہنچانے کے لیے کی گئیں جو پہلے سے شروع ہو چکی تھیں۔

مسلمانوں کا طریقہ تھا کہ لڑائی شروع کرنے سے پہلے دشمن کو اسلام کی دعوت دیتے

---

(۱)........ تاریخ کا خاکہ (انگریزی) از ایچ۔ جی۔ ویلز باب محمدؐ اینڈ اسلام صفحہ ۶۱۸۔

تھے[1] اور جب وہ انکار کر دیتا تھا تو اسلامی مملکت کی اطاعت قبول کرنے کا مطالبہ کرتے تھے اور جنگ اسی وقت شروع کرتے تھے جب دشمن ان دونوں باتوں کو رَدّ کر دیتا تھا۔ یہ دنیا کی تاریخ میں بالکل نئی چیز تھی اور اس نے جنگ کو شہرت، ناموری، مُلک گیری اور دوسروں کو غلام بنانے کا ذریعہ بنانے کی بجائے اصلاح کا ذریعہ بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب جنگ کا سلسلہ شروع ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی ان لڑائیوں میں وہ وحشت، بہیمیت اور ظلم و ستم نظر نہیں آتا جو جنگ کے ساتھ لازمی سمجھا جاتا ہے۔

شام پر لشکر کشی کے لیے جب پہلا لشکر مدینہ سے روانہ ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے جو دس ہدایات دیں وہ فوج کشی کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپؓ نے ہدایت کی کہ کسی عورت، بوڑھے اور بچے کو قتل نہ کیا جائے، پھل دار درختوں کو نہ کاٹا جائے، آباد جگہ ویران نہ کی جائے، نخلستان نہ جلائے جائیں اور عیسائی راہبوں اور عبادت گذاروں کو قتل نہ کیا جائے۔ یہ ہدایات ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار کی گئیں اور ان پر پوری طرح عمل کیا گیا۔

اسلام سے قبل سکندر یونانی کی فتوحات، رومیوں اور ایرانیوں کی جنگوں اور ہُنوں کی لشکر کشی سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ ان تمام جنگوں میں بے گناہ شہریوں کا قتل عام، لُوٹ مار، آتش زنی اور عورتوں کی بے عزتی عام بات تھی۔ اسلام کے آغاز کے وقت ایران اور روم کے درمیان کئی سال تک لڑائیوں کا سلسلہ جاری تھا جس کی وجہ سے فریقین نے ایک دوسرے کے علاقے میں اتنی تباہی اور بربادی پھیلائی تھی کہ شہر کے شہر اور بستیاں کی بستیاں اجڑ گئی تھیں۔ خلافت راشدہ کی فتوحات اپنی وسعت میں نہ سکندر کی فتوحات سے کم تھیں اور نہ رُومیوں اور ہنوں کی لشکر کشی سے کم۔ لیکن اس کے باوجود خلافت راشدہ کے زمانے کی فتوحات اس قدر پُرامن تھیں

---

(۱) جنگ کے آغاز سے اسلام کی اس دعوت کا بعض غیر مسلم مورخین نے غلط مطلب نکالا ہے اور یہ الزام لگایا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ حالانکہ اسلام کی یہ پیشکش جنگ کا ایک پُرامن حل نکالنے کی کوشش تھی اور تین شرائط میں سے ایک شرط تھی۔ اس کے جواب میں کبھی کسی نے اسلام قبول نہیں کیا اور تاریخ بتاتی ہے کہ میدان جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد دشمن کے کسی قیدی یا شہری کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ ایران، عراق، شام اور مصر کے باشندوں نے تقریباً ایک سو سال کی مدت میں بتدریج اور بغیر کسی دباؤ کے اسلام قبول کیا۔ اسلام کی سیدھی اور سادہ تعلیم، مسلمانوں کا اعلیٰ اخلاق اور سابق حکمرانوں کے مقابلہ میں ان کا حسن سلوک ان قوموں میں اشاعت اسلام کا باعث ہوا۔ دین کے معاملہ میں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جبراً کسی کو مسلمان نہیں بنایا جا سکتا۔

کہ ان کو لشکر کشی کی بجائے لٹیروں اور غارت گروں کے خلاف پولیس کی کاروائی قرار دینا زیادہ صحیح ہے۔ کہیں قتل عام نہیں ہوا، شہروں کو اجاڑا اور لوٹا نہیں گیا اور نہ کہیں عورتوں کی بے عزتی ہوئی۔ ایک مرتبہ ایک شخص کے کھیتوں کو فوج سے نقصان پہنچا تو اس نے مقدمہ کر دیا اور حضرت عمرؓ نے اس کو ہرجانہ دلایا۔ فوج کے اخلاق کا یہ حال تھا کہ دمشق میں جب مسلمان داخل ہوئے تو بالا خانوں پر رومیوں کی عورتیں ان کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گئی تھیں، لیکن کسی فوجی نے ان کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اس لیے کہ قرآن میں ان کو ایسے موقع پر نظر نیچی رکھنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ جب صحابہ کرامؓ کی فوجیں شام کی سرزمین میں داخل ہوئیں تو شام کے عیسائی کہتے تھے کہ مسیح کے حواریوں کی جو شان ہم سنتے تھے یہ تو اسی شان کے لوگ نظر آتے ہیں۔

اخلاق اور تعلیم

عوام کے اخلاق کی نگرانی بھی حکومت کے فرائض میں سے تھا۔ زنا، شراب، جوا معاشرتی جرم تھے اور ان پر سزا دی جاتی تھی۔ شراب پینے والے کو کوڑے کی سزا دی جاتی تھی اور عادی شرابیوں کو سزائے قید دی جاتی تھی۔ چوری پر ہاتھ کاٹ دیئے جاتے تھے اور زنا پر سنگسار کیا جاتا تھا یا کوڑے لگائے جاتے تھے۔

قبل از اسلام کی شاعری میں عورتوں کے نام لینا اور مخالفوں کی بُرائی کرنا جس کو ہجو کہا جاتا ہے، عام بات تھی۔ حضرت عمرؓ نے مسلمان شاعروں کو ان دونوں باتوں سے منع کر دیا تھا۔

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مدینہ کے باشندے بہت خوشحال ہو گئے اور غیر عرب قوموں سے میل جول کی وجہ سے بعض لوگوں کو کبوتر بازی اور غلیل بازی کا شوق ہو گیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے ان کھیلوں کو غیر صحت بخش کھیل قرار دیا اور ان پر پابندی لگا دی۔

اسلامی معاشرے میں رشوت بدترین جرم ہے۔ خلافت راشدہ کا دور اس عیب سے پاک تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ دیانت دار لوگوں کو حاکم بنایا جاتا تھا اور وہ اسلامی احکام پر عمل کرنا داخل ایمان سمجھتے تھے۔ حکومت بھی حاکموں کی نگرانی کرتی تھی۔ حضرت عمرؓ تو اس معاملے میں اتنے سخت تھے کہ ملازمت کے زمانے میں جو سرکاری ملازم خوشحال ہو جاتے تھے اُن سے سخت محاسبہ کرتے تھے اور اس معاملے میں حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت ابوہریرہؓ اور

حضرت عمرو بن عاص جیسے جلیل القدر صحابی بھی آپؓ کی گرفت سے نہ بچ سکے۔

ایک نظریاتی ریاست کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ملازمین اور رعایا میں اپنے فرائض اور حقوق دونوں کا شعور موجود ہو۔ شعور پیدا کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ تعلیم ہے۔ اسلام میں تعلیم حاصل کرنا ایک دینی فریضہ قرار دیا گیا ہے اور حکمت کو مومن کا گمشدہ مال بتایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ میں سرکاری سرپرستی میں تعلیم کو فروغ دیا گیا۔ اسلامی خلافت کی حدود میں ہر جگہ قرآن مجید کی تعلیم کے مکتب قائم کیے گئے، جن میں پڑھنا اور لکھنا دونوں سکھائے جاتے تھے۔ ان مکتبوں میں تنخواہ دار معلم مقرر تھے۔ صرف حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسجدوں کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہو چکی تھی۔ یہ مسجدیں، جن میں تنخواہ دار امام اور مؤذن مقرر تھے، بعد میں بتدریج مدرسوں میں تبدیل ہو گئیں۔ حضرت عمرؓ نے سورۂ بقرہ، سورۂ نساء، سورۂ مائدہ، سورۂ حج اور سورۂ نور کو یاد کرنا ضروری قرار دیا تھا کیونکہ بیشتر اسلامی احکام انہی سورتوں میں ہیں۔ اسی طرح احادیث رسولؐ کی تعلیم میں ان احادیث پر زور دیا جاتا تھا جو عبادت، اخلاق اور معاملات سے متعلق ہیں۔ تعلیم کے فروغ اور وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں صرف شہر کوفہ میں تین سو حافظ قرآن تھے۔ جو مدینہ کے بعد، تعلیم کا سب سے بڑا مرکز تھا، دوسرے بڑے تعلیمی مرکز مکہ، بصرہ، دمشق اور فسطاط تھے۔ مدینہ منورہ میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ، مکہ معظمہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اپنے وقت کے ممتاز ترین عالم اور معلم تھے۔ ان اصحاب کے درس میں قرآن اور حدیث کے علاوہ فقہ، علم لغت، تاریخ اور شعر و شاعری پر بھی توجہ دی جاتی تھی۔ ان تمام اصحاب کی روایات کو اسلامی تعلیمات کی وضاحت کے سلسلے میں آج بھی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

غلام اور ذمی

غلامی کے رواج سے متعلق اسلامی احکام کا تذکرہ عہد رسالتؐ میں کیا جا چکا ہے۔ خلافت راشدہ میں نظام غلامی کی اصلاح اور خاتمہ کے سلسلے میں مزید اقدامات کیے گئے۔ اس زمانے میں غلاموں کو بڑی تعداد میں آزاد کیا گیا اور اندازہ ہے کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں ۳۹ ہزار سے

زیادہ غلام یقینی طور پر آزاد کیے گئے۔ حضرت عمرؓ نے خصوصیت سے غلامی کے خاتمہ کے سلسلہ میں کئی اہم اقدامات کیے۔ حضرت ابوبکرؓ کے دور میں فتنۂ ارتداد کے سلسلے میں جو لوگ غلام بنائے گئے تھے حضرت عمرؓ نے ان سب کو آزاد کر دیا اور حکم دیا کہ آئندہ کسی عرب کو قطعی غلام نہ بنایا جائے۔ غیر عرب باشندوں کو بھی غلام بنانے کی حضرت عمرؓ نے حوصلہ شکنی کی۔ مصر سے جب کچھ غلام مدینہ لائے گئے تو حضرت عمرؓ نے ان کو واپس کر دیا اور مصر کے والی حضرت عمروؓ بن عاص کو انہوں نے جن الفاظ میں ہدایت کی اسے غلامی کی تاریخ میں ہمیشہ روشن حروف سے لکھا جائے گا۔ آپؓ نے لکھا کہ:

"ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا ہے اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان کا یہ فطری حق چھین لے"

حضرت عمرؓ غلاموں کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ ان کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ ایک والی کو صرف اس جرم پر معزول کر دیا تھا کہ وہ ایک بیمار غلام کی عیادت کو نہیں گئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے وظیفے مقرر کرتے وقت بھی آقا اور غلام کا فرق مٹا دیا اور غلاموں کا وظیفہ اُن کے آقاؤں کے برابر مقرر کیا۔ غلام آزاد کرنا چونکہ ثواب کا کام تھا اس لیے حضرت عثمانؓ ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کرتے تھے۔

خلافت راشدہ کے زمانے میں صرف وہی لوگ غلام بنائے جاسکتے تھے جو جنگوں میں پکڑے جاتے تھے۔ ان کی حیثیت دراصل جنگی قیدیوں کی ہوتی تھی۔ چونکہ اس زمانے کے حالات کے تحت اُن قیدیوں کا تبادلہ آسان نہ تھا اور ان کو ساری عمر قیدی کی حیثیت سے رکھنا غیر انسانی فعل ہوتا اس لیے ان کو غلام بنا کر گھر اور معاشرہ کا کارآمد رکن بنالیا جاتا تھا۔

اشاعتِ اسلام

خلافتِ راشدہ کی حدود میں مختلف نسل، زبان اور مذہب سے تعلق رکھنے والی قومیں آباد تھیں۔ ایران کے باشندے فارسی زبان بولتے تھے اور اُن کا مذہب آتش پرستی تھا۔ مصر اور شام میں قبطی، سریانی اور یونانی زبانیں بولی جاتی تھیں اور اُن ملکوں کے باشندے عیسائی تھے۔ عربی زبان صرف عرب اور اس سے ملے ہوئے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ عرب باشندے تقریباً تمام مسلمان تھے لیکن دوسرے ملکوں میں یہ صورت نہیں تھی۔ ایران، عراق، شام اور مصر میں اسلام

تیزی سے پھیل رہا تھا اور یہاں کی قومیں اپنے آبائی مذاہب کو چھوڑ کر ملت اسلامی میں شامل ہو رہی تھیں لیکن ان ملکوں کی اکثریت ابھی تک غیر مسلم تھی۔ مسلمان باشندوں کو خواہ وہ کسی ملک اور نسل سے تعلق رکھتے ہوں، وہی حقوق حاصل تھے جو عرب مسلمانوں کو حاصل تھے۔ ان کا غیر عرب ہونا عربوں کے برابر حقوق حاصل کرنے کی راہ میں حائل نہ تھا۔ لیکن خلافت راشدہ چونکہ ایک نظریاتی ریاست تھی اور ایسی قومی حکومت نہیں تھی جس کی بنیاد وطن یا نسل پر ہو اس لیے غیر مسلم آبادی کو حکومت میں برابر کی حیثیت سے شریک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ایک شہری کی حیثیت سے غیر مسلموں کو مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل تھے۔ اسلامی حکومت نے چونکہ ان کی فلاح و بہبود اور حفاظت کی ذمہ داری اپنے ذمہ لے لی تھی اس لیے اس غیر مسلم آبادی کو ذمی کہا جاتا تھا۔ ذمیوں پر فوجی خدمت لازمی نہیں تھی اور اس کے بدلے میں ان سے ایک معمولی سا ٹیکس لیا جاتا تھا جو جزیہ کہلاتا تھا۔ خلافت راشدہ میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ جب مسلمان کسی مفتوحہ علاقے کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے اور اس علاقے کو خالی کرنے پر مجبور ہوتے تھے تو جزیہ کی رقم غیر مسلموں کو واپس کر دیتے تھے۔ مفتوح قوموں اور دوسرے مذاہب کی آبادی سے ایسے منصفانہ سلوک کی مثال خلافت راشدہ کے علاوہ کسی دور میں نہیں ملے گی۔ اسلامی حکومت مسلمانوں کی طرح غیر مسلموں کی معاشی کفالت کی بھی ذمہ دار تھی اور جو غیر مسلم محتاج ہو جاتے تھے ان کو سرکاری بیت المال سے وظیفہ دیا جاتا تھا۔

عرب میں نجران کے عیسائیوں اور خیبر کے یہودیوں کو بعض مصلحتوں کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے شام جلاوطن کر دیا تھا لیکن ان کو نئے گھروں میں آباد ہونے کی پوری سہولتیں دی گئیں۔ اسی طرح بعض جگہ کی ذمی آبادی کو ایک مخصوص لباس پہننے کی ہدایت کی گئی تھی لیکن اس کا مقصد ان کی تذلیل نہیں تھا جیسا کہ بعض غیر مسلم مؤرخ الزام لگاتے ہیں۔ اسلام میں چونکہ لباس کے معاملے میں مسلمانوں کو غیر مسلموں سے مشابہت پیدا کرنے سے منع کیا گیا ہے اس لیے اس پابندی کا مقصد دونوں قوموں کی انفرادیت کو قائم رکھنا تھا، کسی کی تذلیل کرنا یا کسی کو حقیر سمجھنا اس حکم کا مقصد نہیں تھا۔

عرب کا انقلاب بین الاقوامی بن گیا

مختصر طور پر یہ ہیں وہ خصوصیات جو خلافتِ راشدہ کے دَور سے مخصوص ہیں اور جن کی وجہ سے اس دَور کو انفرادیت حاصل ہے۔ تاریخ عالم کا کوئی دُوسرا دَور اس قسم کی مثالوں سے خالی ہے۔ بعض قوموں کی تاریخوں میں ان میں سے بعض خصوصیات تو مل جائیں گی لیکن یہ تمام خصوصیات یکجا کسی قوم کی تاریخ میں نہیں ملیں گی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں مسلمانوں کی تلواروں نے جتنا کام کیا اس سے کہیں زیادہ کام ان کے اخلاق و کردار نے کیا۔

"انھوں نے قوانین طبعی کو قوانین شرعی کے تحت استعمال کر کے زمین میں خدا کی خلافت کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ان کے عہد میں جو تمدن تھا انہوں نے اس کے قالب میں اسلامی تہذیب کی رُوح پھونکی۔"[1]

کسی قوم کی تاریخ میں تیس سال کی مدت بہت مختصر ہوتی ہے۔ لیکن ٹھوس کارناموں کو سامنے رکھا جائے تو خلافتِ راشدہ کے یہ تیس سال دوسری قوموں کے سینکڑوں سالوں کی تاریخ پر بھاری ہیں۔ اس مختصر مدت میں ایک معمولی مملکت جو جزیرہ نمائے عرب تک محدود تھی دنیا کی سب سے بڑی اور طاقت ور ریاست بن گئی۔ عہد رسالتؐ میں جو انقلابی تبدیلی سرزمین عرب اور عربوں کی زندگی میں آئی تھی ویسی ہی تبدیلی خلافتِ راشدہ کے دَور میں ایران، عراق، شام اور مصر میں اور ان ملکوں میں آباد قوموں میں آئی۔

ایرانی اور رومی اس زمانے میں دنیا کی سب سے مہذب اور طاقت ور قوموں میں شمار ہوتے تھے۔ عراق، شام اور مصر وہ ملک تھے جہاں انسان نے سب سے پہلے تہذیب کا درس لیا اور جس کی وجہ سے اس خطہ کو تہذیب کا گہوارہ کہا جاتا ہے۔ تیس سال کی اس مختصر مدت میں ان تمام قدیم قوموں کی سیاسی قوت ہی ختم نہیں ہوئی بلکہ تہذیبی میدان میں بھی ان کو مکمل شکست ہوگئی۔ انھوں نے اس

---

(1) غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی تھی اور ان کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اپنے غلام کو اسلام کی دعوت دی لیکن جب اس نے انکار کر دیا تو آپؓ نے یہ کہہ کر کہ دین میں جبر نہیں خاموشی اختیار کر لی۔ خلافت راشدہ اگرچہ ایک نظریاتی ریاست تھی جس کے سیاسی اور اجتماعی نظریات اسلام پر مبنی تھے لیکن غیر مسلم رعایا کو ان نظریات سے اختلاف رکھنے کی اجازت تھی۔ حتیٰ کہ تعلیمی نظام میں بھی غیر مسلموں کو اسلامی عقائد کی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا جیسا کہ اشتراکی ملکوں میں غیر اشتراکی نظریات رکھنے والوں کو مجبور کیا جاتا ہے۔

تیزی سے اپنے پُرانے مذاہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کرنا شروع کیا کہ اگلے پچاس ساٹھ سال کی مدت میں ان ملکوں کی تقریباً ساری آبادی مسلمان ہوگئی اور یہ ملک ہمیشہ کے لیے اسلامی دنیا کا حصہ بن گئے۔ مذہب کے ساتھ ہی ان قوموں کا زندگی سے متعلق نظریہ بھی بدل گیا اور اس طرح ایک نئی تہذیب کی بنیاد پڑی جو ہر جگہ کی مقامی خصوصیات کے باوجود مجموعی طور پر اسلامی تہذیب کہلائی اور جس کے نقوش چودہ سو سال بعد آج بھی باقی ہیں۔ مسلمانوں کے بے مثل اخلاق و کردار کا نتیجہ تھی۔

دنیا کی مختلف قوموں اور جماعتوں کے سامنے کوئی نہ کوئی مثالی نصب العین ہوتا ہے جس کے حصول کے لیے وہ جدوجہد کرتی ہیں۔ لیکن ابھی تک سیاسی اور اجتماعی میدان میں دنیا میں کوئی ایسا مثالی نصب العین نظر نہیں آتا جس کو حاصل کرلیا گیا ہو۔ ہر نصب العین مستقبل کی ایک آرزو ہی ہے۔ لیکن یہ خصوصیت صرف اور صرف ملت اسلامیہ اور تاریخ اسلام کی ہے کہ خلافت راشدہ کی شکل میں ایک مثالی سیاسی اور اجتماعی نصب العین حاصل کرلیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کا دَورِ حکومت اپنے مثبت اور ٹھوس کارناموں اور منفرد خصوصیات کی وجہ سے آنے والی نسلوں کے لیے ایک مثال اور قابل تقلید نمونہ بن گیا اور آج بھی اسلامی دنیا میں اس کی یہ حیثیت برقرار ہے۔

ہم اگلے صفحات میں دیکھیں گے کہ جو حکومت اپنی خصوصیات میں خلافت راشدہ سے جتنی زیادہ مشابہ اور قریب تھی اتنی ہی اس میں کم خرابیاں نظر آئیں گی اور جو حکومت جتنی زیادہ مختلف تھی اتنی ہی زیادہ خرابیاں اس میں نظر آئیں گی۔

مزید مطالعہ کے لیے کتابیں

۱۔ تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین احمد ندوی (اعظم گڑھ)

۲۔ تاریخ اسلام حصہ اول از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

۳۔ خلافت وملوکیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

۴۔ اسوۂ صحابہ (دارالمصنفین اعظم گڑھ) دو حصے۔

۵۔ الفاروق از شبلی نعمانی۔

۶۔ ابوبکر صدیق ؓ از سید احمد اکبرآبادی۔

۷۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے سلسلے میں معروف فاضل محمد حسین ہیکل کی کتابیں ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی قابل قدر کتابیں ہیں۔ دونوں کے اردو ترجمے دستیاب ہیں۔

۸۔ جو حضرات خلافتِ راشدہ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اُن کے لیے دارالمصنفین اعظم گڑھ کا آٹھ حصوں پر مشتمل سیر الصحابہ کا سلسلہ مفید ثابت ہوگا۔ اس کا پہلا حصہ خلفائے راشدین پر ہے اور ایک حصہ صرف صحابیات کے حالات پر ہے۔

۹۔ ممتاز صحابہ کے حالات کے لیے ''روشنی کے مینار'' از حافظ محمد ادریس اچھی کتاب ہے۔

باب ۸

مشرق و مغرب کی فتح

امیر معاویہؓ

امام حسنؓ کی دست برداری کے بعد امیر معاویہؓ مسلمانوں کے متفقہ خلیفہ تسلیم کر لیے گئے۔ لیکن ان کی یہ خلافت انتخابی خلافت نہیں تھی یعنی امیر معاویہؓ کو مسلمانوں نے انتخاب کے ذریعہ خلیفہ منتخب نہیں کیا تھا بلکہ انھوں نے طاقت کے زور سے خلافت حاصل کی تھی اور جب وہ خلیفہ بن گئے تو لوگوں نے مجبوراً بیعت کر لی کیونکہ اگر وہ بیعت نہ بھی کرتے تو بھی امیر معاویہ خلافت سے دست بردار نہیں ہوتے اور خانہ جنگی بدستور جاری رہتی۔ اس طرح خلافت راشدہ کا انتخابی پروگرام ختم ہو کر اسلامی تاریخ میں ملوکیت کا آغاز ہوا۔

امیر معاویہ کی بیعت ہو جانے کے بعد جب مشہور صحابی اور فاتح عراق حضرت سعد ابن وقاصؓ اُن سے ملے تو انھوں نے امیر معاویہؓ کو السلام علیکم ایھا الملك (یعنی اے بادشاہ السلام علیکم) کہہ کر خطاب کیا۔ اگرچہ امیر معاویہ کو امیر المومنین کی بجائے بادشاہ کہہ کر خطاب کرنا ناگوار گزرا لیکن ان کو خود بھی اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ وہ مسلمانوں میں پہلے بادشاہ ہیں۔

امیر معاویہؓ نے جس حکومت کی بنیاد ڈالی اسے ''خلافت بنی امیہ'' یا اموی خلافت کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس حکومت میں جس قدر خلیفہ ہوئے وہ سب ''امیہ'' کے خاندان سے تھے۔ امیر معاویہؓ نے بیس سال حکومت کی۔ ان کے زمانے میں پوری سلطنت میں امن و امان رہا۔ نئے نئے علاقے فتح ہوئے۔ ان نئے علاقوں میں ایک شمالی افریقہ ہے۔ شمالی افریقہ کو اس زمانے کے مشہور سپہ سالار عقبہ بن نافع نے فتح کیا۔ عقبہ بن نافع بڑے پُرجوش سپہ سالار تھے۔ جب انھوں نے حملہ شروع کیا تو کوئی سو میل تک علاقے پر علاقے فتح کرتے چلے گئے یہاں تک کہ سمندر سامنے آ گیا۔ یہ بحر اوقیانوس تھا جسے بحر ظلمات بھی کہا جاتا ہے۔ عقبہ نے جب دیکھا کہ سمندر ان کی راہ میں حائل ہو گیا ہے تو انھوں نے اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال دیا اور جوش میں

دُور تک پانی میں چلے گئے۔ پھر تلوار اٹھا کر کہا کہ اے خدا اگر یہ سمندر راستے میں حائل نہ ہوتا تو میں دنیا کے آخری کنارے تک تیرا نام بلند کرتا ہوا چلا جاتا۔

شمالی افریقہ چونکہ اسلامی دنیا سے بہت دُور تھا اس لیے عقبہ نے وہاں ''قیروان'' کے نام سے ایک شہر آباد کیا تا کہ اس خطہ میں مسلمانوں کی مستقل آبادی قائم ہو جائے۔ یہ شہر بعد میں کئی سو برس تک اسلامی تہذیب اور علم وفن کا بہت بڑا مرکز بنا رہا۔ عقبہ بڑے نیک بزرگ تھے۔ ان کا مزار شمالی افریقہ میں ''بسکرہ'' نامی بستی میں اب بھی موجود ہے اور ہزاروں لوگ اس کی زیارت کرنے جاتے ہیں۔

امیر معاویہؓ اگرچہ صحابی تھے لیکن ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔ وہ فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تھے اس لیے صرف تین سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہ سکے۔ اس کی وجہ سے ان کے اندر وہ دینداری پیدا نہیں ہو سکی جو خلفائے راشدین میں یا ان صحابیوں میں تھی جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرنے کا زیادہ موقع ملا تھا۔ وہ اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے حضرت علیؓ سے لڑے۔ اپنے بعد اپنے لڑکے یزید کو خلیفہ بنایا۔ خلفائے راشدین کی سادہ زندگی کی بجائے شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے اور مسلمانوں کے بیت المال سے اپنی مرضی کے مطابق بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتے تھے۔ ان کے دربار کا انداز شاہانہ تھا۔ وہ بادشاہوں کی طرح تخت پر بیٹھتے تھے جس کے پائے سونے کے تھے۔ وہ جب باہر نکلتے تھے تو آگے آگے نقیب چلتے تھے۔ اسی طرح وہ پہلے خلیفہ تھے جنھوں نے اپنے لیے حاجب اور پہرے دار مقرر کیے۔ ان کو شاندار محلات بنانے کا بھی شوق تھا اور ان محلوں کے بارے میں دوسروں کی رائے معلوم کرتے تھے۔ شروع میں ان کا محل اگرچہ شاندار تھا لیکن اس کی تعمیر میں مٹی استعمال کی گئی تھی۔ ایک مرتبہ روم سے سفیر آیا۔ امیر معاویہؓ نے اس سے اپنے محل کے بارے میں رائے لی۔ سفیر نے جواب دیا:

''اس کا اوپر کا حصہ چڑیوں کے لیے ہے اور نچلا چوہوں کے لیے''

چنانچہ اس کے بعد امیر معاویہؓ نے محلوں کی تعمیر میں مٹی کی بجائے پتھر استعمال کرنا شروع کر دیے۔ ایسے ہی کسی محل کے بارے میں ایک مرتبہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبداللہ بن عمرؓ سے رائے طلب کی تو انھوں نے اپنے عظیم باپ کے مسلک کی پیروی

کرتے ہوئے جواب دیا کہ:

''اگر آپ نے یہ محل بیت المال کی رقم سے بنایا ہے تو خیانت کی ہے اور اگر ذاتی مال سے بنایا ہے تو فضول خرچی کی ہے''

یہ تھے محلوں کی تعمیر سے متعلق دو نقطہ ہائے نظر۔ ان میں ایک ملوکیت کا نقطۂ نظر تھا اور دوسرا خلافت کا اور عوامی نقطۂ نظر۔ امیر معاویہؓ کو کچھ تو نئے حالات کی وجہ سے اور کچھ ذاتی رجحان کی وجہ سے پہلے نقطۂ نظر میں زیادہ جاذبیت نظر آتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود امیر معاویہؓ بہت اچھے حکمران تھے۔ اتنے اچھے کہ بعد میں ان جیسے حکمران اسلامی تاریخ میں کم ہوئے۔

وہ رائے عامہ کے پابند نہیں تھے لیکن اُس کا کچھ نہ کچھ لحاظ کرتے تھے۔ وہ جبر خالص کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اس معاملے میں اپنا اصول حکمرانی اس طرح بیان کیا ہے:

''جہاں میرا کوڑا کام دیتا ہے وہاں تلوار کام میں نہیں لاتا اور جہاں زبان کام دیتی ہے وہاں کوڑا کام میں نہیں لاتا۔ اگر میرے اور لوگوں کے درمیان بال برابر بھی رشتہ قائم ہو تو میں اس کو نہیں توڑتا۔ جب لوگ اس کو کھینچتے ہیں تو میں ڈھیل دے دیتا ہوں اور جب وہ ڈھیل دیتے ہیں تو میں کھینچ لیتا ہوں۔''[1]

عدل وانصاف کا ان کو بڑا خیال رہتا تھا اور انہوں نے پوری سلطنت میں بڑے قابل والی مقرر کیے تھے جن کی وجہ سے ۲۰ سال تک انہوں نے امن وامان کے ساتھ حکومت کی۔ ان کے زمانے میں ایسا امن تھا کہ عراق کا والی زیاد کہتا تھا کہ اگر کوفہ اور خراسان کے راستے میں رسی کا ایک ٹکڑا بھی ضائع ہو جائے تو مجھے معلوم ہو جائے گا کہ کس نے لیا۔ راتوں کو عورتیں اپنے گھروں میں کواڑ کھول کر تنہا سوتی تھیں۔

امیر معاویہؓ کا مزاج اتنا اچھا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ سختی نہیں کرتے تھے اور لوگ ان کو ان کے منہ پر برا بھلا کہہ جاتے تھے۔ وہ اپنے مخالفوں کو بھی انعام واکرام دے کر خوش رکھتے تھے۔ حضرت حسنؓ حضرت حسینؓ اور ان کے خاندان والوں کے ساتھ ان کا سلوک بہت اچھا تھا اور ان کی لاکھوں روپے سے مدد کرتے تھے۔

---

(۱) تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی حصہ دوم صفحہ ۳۷ (مطبوعہ ۱۹۴۸ء)

امیر معاویہؓ کے زمانے میں رفاہِ عام کے بھی بہت کام ہوئے۔ نہریں کھودی گئیں اور آبپاشی کے لیے تالاب بنائے گئے۔

امیر معاویہؓ پہلے خلیفہ ہیں جنھوں نے ڈاک کا انتظام کیا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ ملک بھر میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تیز رفتار گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ سرکاری ہرکارے ہر منزل پر ان گھوڑوں کو بدلتے ہوئے ایک مقام کی خبریں دوسرے مقام تک لاتے اور لے جاتے تھے۔

اگر ہم امیر معاویہ کو ایک بادشاہ کی حیثیت سے دیکھیں تو ان کے دور میں ہمیں خامیاں کم اور خوبیاں زیادہ نظر آئیں گی۔ ان کے دور کی خامیاں دراصل ملوکیت کے استبدادی نظام کی فطری خامیاں ہیں ان کی ذات کی خامیاں نہیں۔ تاریخ اسلام میں ان کے مقام کا تعین کرنے میں ہمیں اس لیے مشکل پیش آتی ہے کہ وہ خلافت راشدہ کے مثالی دَور کے فوراً بعد آتے ہیں جس کی وجہ سے خلفائے راشدین کے مقابلہ میں ان کی شخصیت کئی عظیم الشان کارناموں کے باوجود گہنا گئی۔

امیر معاویہؓ نے شام کے شہر دمشق کو دارالخلافہ قرار دیا جہاں وہ خلافت سے پہلے کئی سال سے گورنر کی حیثیت سے رہتے چلے آ رہے تھے۔ یہ شہر مدینہ اور کوفہ کے بعد اسلامی خلافت کا تیسرا دارالخلافہ تھا۔ دمشق تہذیب و تمدن کا دنیا میں قدیم ترین مرکز تھا اس لیے اسلامی مملکت کی مستقبل کی تعمیر میں اس کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

خانہ جنگی اور حادثہ کربلا

امیر معاویہؓ نے اپنے بعد اپنے لڑکے یزید (۶۰ تا ۶۴ھ) کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں خلیفہ کا انتخاب مشورے سے کیا جاتا تھا اور کبھی کسی خلیفہ نے اپنے بیٹے کو خلیفہ نہیں بنایا تھا۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ حکومت گھر کی طرح کسی ایک شخص کی جائداد نہیں ہوتی ہے جس کا، باپ کے بعد بیٹا وارث بنایا جائے۔ حکومت تو شہر اور ملک کا انتظام کرنے کے لیے قائم کی جاتی ہے اور وہ ایک طرح کی خدمت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور قول ہے۔: ''قوم کا سردار اس کا خادم ہوتا ہے'' اس لیے سرداری کا یہ کام لائق آدمی کے سپرد ہونا چاہیے۔ لیکن امیر معاویہؓ نے اپنے زمانے کے بڑے بڑے قابل لوگوں کو نظر انداز کر کے اپنے لڑکے یزید کو جو بہت سی باتوں میں بدنام تھا اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ امیر معاویہؓ نے اس مسئلہ

پر ممتاز لوگوں سے مشورہ کر لیا تھا اور یزید کی بیعت حج کے موقع پر ہزاروں افراد نے کی تھی۔ لیکن یہ بیعت دباؤ کے تحت کی گئی تھی۔ امیر معاویہؓ ہر حال میں اپنے بیٹے کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے اور اگر لوگ بیعت نہ کرتے تو وہ اپنے اس ارادے سے باز نہیں آتے۔ یزید کی جانشینی کی جن پانچ ممتاز صحابہ نے کھل کر مخالفت کی ان کے نام یہ ہیں:

حضرت حسینؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت عبدالرحمن بن ابوبکرؓ۔ ان میں حضرت عبدالرحمن بن ابوبکرؓ نے تو امیر معاویہؓ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اپنے بیٹے کو جانشین بنانا ابوبکرؓ اور عمرؓ کی سنت نہیں ہے بلکہ قیصر و کسریٰ کا طریقہ ہے۔

امیر معاویہؓ نے ان حضرات کا مشورہ نہیں مانا اور اپنے بیٹے کو جانشین مقرر کر کے اسلام کی تاریخ میں ایک سیاسی بدعت کی بنیاد ڈالی جس نے ملوکیت کے نظام کو پوری طرح مستحکم کر دیا۔ موجودہ دور کے ایک عظیم محقق نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اس کے بعد ملوکیت کا یہ نظام ایسا مستحکم ہوا کہ موجودہ صدی میں مصطفیٰ کمال کے الغائے خلافت تک ایک دن کے لیے بھی اس میں تزلزل واقع نہیں ہوا۔ جبری بیعت اور خاندانوں کی موروثی بادشاہت کا ایک مستقل طریقہ چل پڑا۔ لوگ مسلمانوں کے آزادانہ اور کھلے مشورے سے نہیں بلکہ طاقت سے برسر اقتدار آتے رہے۔ بیعت سے اقتدار حاصل ہونے کے بجائے اقتدار سے بیعت حاصل ہونے لگی۔ بیعت کا حاصل ہونا اقتدار پر قابض ہونے اور قابض رہنے کے لیے شرط نہ رہا۔ لوگوں کی اوّل تو یہ مجال نہ تھی کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آیا ہوا تھا اس کے ہاتھ پر بیعت نہ کرتے لیکن اگر وہ بیعت نہ بھی کرتے تو اس کا نتیجہ ہرگز یہ نہ ہوتا کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آ گیا ہو وہ ان کے بیعت نہ کرنے کی وجہ سے ہٹ جائے۔''[1]

امیر معاویہؓ کے انتقال کے بعد جب یزید خلیفہ ہوا تو بہت سے لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ اس مخالفت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ جانشینی کے اس طریقہ کو کہ باپ کے بعد بیٹا حکمران ہو

(۱) خلافت و ملوکیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی، صفحہ ۱۵۹۔

قیصر و کسریٰ کا طریقہ سمجھتے تھے اور اسلامی طریقہ نہیں سمجھتے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ یزید کو اخلاق اور کردار کے لحاظ سے اتنا اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ اس کو مسلمانوں کا خلیفہ بنایا جائے۔ ان مخالفوں میں ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے یعنی آپؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کے لڑکے حضرت حسینؓ بھی تھے۔

عراق میں کوفہ کے باشندوں نے حضرت حسینؓ کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور ان کو کوفہ آنے کی دعوت دی۔ اس موقع پر بعض صحابہ نے آپؓ کو کوفہ جانے سے روکنا چاہا۔ ان میں ایک آپؓ کے بھائی محمد بن حنفیہ [1] بھی تھے۔ انھوں نے حضرت حسینؓ سے کہا کہ آپ اپنے آدمی بھیج کر کوفہ کے لوگوں کو اپنی خلافت کی دعوت دیجیے۔ اگر وہ بیعت کرلیں تو ہمارے لیے موجب شکر ہوگا اور اگر آپ کے علاوہ کسی اور شخص پر مسلمانوں کا اتفاق ہوجائے تو اس سے مذہب اور آپ کے فضائل پر کوئی نہیں پڑے گا۔ [2] لیکن حضرت حسینؓ نے ان مشوروں کو نظر انداز کر دیا اور کوفہ والوں کی دعوت پر اپنے خاندان کے ۷۲ آدمیوں کو ساتھ لے کر جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے مکہ سے کوفہ روانہ ہوگئے۔ لیکن اس دوران میں کوفہ میں یزید کا مقرر کیا ہوا والی عبیداللہ بن زیادہ کوفہ پہنچ گیا اور کوفہ کے باشندے اس سے ڈر کر نہ صرف حضرت امام حسینؓ سے کیے ہوئے وعدے سے پھر گئے بلکہ امام حسینؓ کے نمائندے اور بھائی مسلم بن عقیل کو ابن زیاد کے سپرد کر دیا جس نے ان کو قتل کرا دیا۔ کوفہ کے باشندوں کی اس روش سے مایوس ہوکر امام حسینؓ نے واپس مکہ جانا چاہا لیکن حضرت مسلم کے بھائیوں کے اصرار پر حضرت حسینؓ نے سفر جاری رکھا۔ ابن زیاد کے چار ہزار آدمیوں نے دریائے فرات کے کنارے کربلا کے مقام پر اس قافلہ کو گھیر لیا اور حضرت حسینؓ کو یزید کی بیعت کرنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے ابن زیاد کے آدمیوں سے کہا کہ یا تو ان کو یزید کے پاس جانے دیا جائے جہاں وہ خود اس سے معاملہ طے کرلیں گے، یا پھر سرحد کی طرف نکل جانے دیا جائے تاکہ وہ کفار سے جہاد کرسکیں یا ان کو واپس مدینہ جانے دیا جائے۔ لیکن ابن زیادہ نے ان کی کوئی شرط منظور نہیں کی اور یزید کی بیعت پر مجبور کیا۔ لیکن حضرت حسینؓ

---

(۱) محمد بن حنفیہ حضرت حسنؓ اور حسینؓ کے سوتیلے بھائی تھے۔ وہ حضرت فاطمہؓ کے بطن سے نہیں بلکہ حضرت علیؓ کی دوسری بیوی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔

(۲) تابعین از شاہ معین الدین دارالمصنفین اعظم گڑھ تذکرہ محمد بن حنفیہ۔

ایسے انسان نہیں تھے جو موت سے ڈر کر اور دھمکی میں آ کر کوئی بات قبول کر لیتے۔ انہوں نے جان دینا قبول کر لیا لیکن جبر اور زبردستی کے آگے جھکنا پسند نہیں کیا۔ مقابلہ بے جوڑ تھا۔ چند آدمی چار ہزار کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت حسینؓ اور ان کے مرد ساتھی مردانہ وار شہید ہو گئے۔ بالغ مردوں میں صرف ان کے صاحبزادے امام زین العابدین زندہ بچے جو بیمار ہونے کی وجہ سے جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ ابن زیاد نے حضرت حسینؓ کا سر اور ان کے قافلے کے بچے کھچے افراد کو جو عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھے یزید کے پاس دمشق روانہ کر دیا۔

کربلا کا یہ واقعہ تاریخ اسلام کا بڑا افسوس ناک حادثہ ہے۔ اس کی ذمہ داری یزید پر عاید ہو یا ابن زیاد پر لیکن مسلمانوں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے رسولؐ کے پیارے نواسے سے ایسا سلوک کریں گے۔ چنانچہ کربلا کے اس واقعہ کا حجاز میں سخت ردعمل ہوا اور وہاں کے لوگوں نے یزید کی بیعت توڑ کر مشہور صحابی زبیرؓ کے صاحبزادے عبداللہؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر لی۔ یزید نے اس بے چینی کو دبانے کے لیے مدینہ کی سمت ایک فوج بھیجی جس نے مدینہ فتح کرنے کے بعد شہر میں قتل عام کیا اور تین دن تک شہر میں لوٹ مار کی۔ اس واقعہ کو حرّہ کہا جاتا ہے اور یہ بھی ہماری تاریخ پر ایک دھبہ ہے کیونکہ مسلمانوں نے ابھی تک شہری باشندوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں کیا تھا۔ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان چار سال تک لڑائی جاری رہی لیکن کبھی کسی نے دوسرے سے ایسا سلوک نہیں کیا جو خلاف انسانیت ہو۔ یزید کی بھیجی ہوئی فوج نے مدینہ کے بعد مکہ کا رُخ کیا جہاں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پناہ گزیں تھے۔ لیکن اس دَوران میں یزید کا انتقال ہو گیا اور اس کے آدمی واپس دمشق چلے گئے۔

یزید کے انتقال کے بعد امیر معاویہؓ کے خاندان میں حکومت ختم ہو گئی کیونکہ یزید کے لڑکے نے حکومت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کوئی خلیفہ نہ ہونے کی وجہ سے اسلامی دنیا انتشار کا شکار ہو گئی۔ مسلمانوں کی نظریں عبداللہ بن زبیرؓ پر پڑیں اور انہوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ کچھ عرصہ کے لیے مصر، شام، عراق بلکہ پوری اسلامی خلافت حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے تحت آ گئی۔ لیکن شام میں مرج راہط کے مقام پر عبداللہ بن زبیرؓ کے حامیوں اور بنی امیہ کے حامیوں میں ایک سخت جنگ ہوئی جس میں بنی امیہ کامیاب ہوئے اور شام سے عبداللہ بن زبیرؓ کا اقتدار ختم ہو گیا۔ باقی دنیائے اسلام کے بڑے حصہ پر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا سات

سال تک اقتدار قائم رہا۔ لیکن اس دوران میں بنی امیہ کے حامی زور پکڑتے گئے یہاں تک کہ ایک اموی حکمران عبدالملک اس کش مکش میں کامیاب ہوگیا اور مکہ پر بھی اس کا قبضہ ہوگیا۔ عبداللہ بن زبیرؓ اس کے ایک سپہ سالار حجاج بن یوسف کے مقابلہ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوگئے۔ ان کی شہادت کے بعد نظامِ خلافت کی بحالی کی رہی سہی امید بھی ختم ہوگئی۔

عبدالملک (۶۵ھ تا ۸۶ھ)

یزید کے بعد جو لوگ خلیفہ ہوئے وہ امیر معاویہؓ کی اولاد میں سے نہیں تھے لیکن وہ بھی امیر معاویہؓ کی طرح خاندان بنی امیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نئے خاندان کا بانی مروان بن حکم تھا جو ایک زمانہ میں حضرت عثمانؓ کا کاتب یعنی سیکرٹری تھا۔ حضرت عثمانؓ کی مشکلات کا سب سے بڑا ذمہ دار یہی شخص تھا۔ جب مدینہ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی حکومت قائم ہوگئی تو مروان شام چلا گیا جہاں ذیقعدہ ۶۴ھ میں بنو امیہ کے حامیوں نے اسے خلیفہ بنا لیا۔ مرج راہط کی جنگ کے بعد شام اور مصر پر اس کا قبضہ ہوگیا۔ لیکن وہ صرف نو ماہ خلافت کر کے رمضان ۶۵ھ میں مر گیا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا عبدالملک خلیفہ ہوا۔

عبدالملک ۳۹ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ اس کا شمار مدینہ کے ممتاز علماء میں ہوتا تھا۔ وہ بڑا ہمت والا اور مستقل مزاج انسان تھا۔ عبداللہ بن زبیرؓ کو شکست دینے کے بعد وہ پوری اسلامی مملکت کا حکمران بن گیا۔ اس کو شروع میں کئی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا ان میں خارجیوں کی بغاوت جس کا مرکز عراق اور ایران تھے سب سے زیادہ خطرناک تھی یہ بغاوت کئی سال جاری رہی اور بالآخر مہلب بن ابی صفرہ کی کوششوں سے، جو اپنے وقت کا سب سے بڑا سپہ سالار تھا یہ بغاوت فرو ہوگئی اور پوری سلطنت میں امن قائم ہوگیا۔ اپنے ان کارناموں کی وجہ سے عبدالملک کو خاندان بنی امیہ کا حقیقی بانی سمجھا جاتا ہے۔ شمالی افریقہ اگرچہ امیر معاویہؓ کے زمانہ میں اسلامی خلافت کا جزو بن چکا تھا لیکن وہاں کے بربر باشندے بار بار باغی ہو جاتے تھے۔ عبدالملک کے عہد میں شمالی افریقہ کو دوبارہ فتح کیا گیا اور یہ کام ایک سپہ سالار موسیٰ بن نصیر نے انجام دیا جو ۷۹ھ میں شمالی افریقہ کے والی مقرر کیے گئے تھے۔ موسیٰ نے نہ صرف جنگی کامیابی حاصل کی بلکہ انہوں نے بربروں میں اسلام کی تبلیغ بھی کی۔ ان کے عہد میں تقریباً تمام شمالی افریقہ مسلمان ہوگیا اور

اس طرح بر بر اسلامی خلافت کے پُرامن شہری بن گئے۔ موسیٰ بن نصیر نے بحری فوج کو بھی ترقی دی اور اس مقصد سے تونس میں جہاز سازی کا کارخانہ قائم کیا۔

عبدالملک کے عہد کا ایک اور کارنامہ قبۃ الصخرہ کی تعمیر ہے۔ ہم پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ بیت المقدس مسلمانوں کا قبلۂ اوّل تھا اور یہیں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معراج کے موقع پر آسمان پر گئے تھے لیکن وہ خاص جگہ جہاں سے حضورؐ اوپر گئے تھے ایک چٹان تھی جو مسجد اقصیٰ کی حدود میں واقع تھی۔ عبدالملک نے اس چٹان کے اوپر ایک عالی شان قبہ بنوادیا جو اب تک موجود ہے اور فن تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ عربی میں چٹان کو چونکہ صخرہ کہا جاتا ہے اس لیے یہ گنبد قبۃ الصخرہ کہلاتا ہے۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ عبدالملک نے قبۃ الصخرہ اس لیے تعمیر کیا تھا کہ مسلمان خانہ کعبہ کی بجائے اس کا طواف کیا کریں گے۔ یہ قطعی جھوٹ اور لغو الزام ہے۔ عبدالملک خود ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھا اور اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی وہ ایسی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ مسلمان عوام جن کی قیادت علماء کے ہاتھ میں تھی اس کے خلاف بغاوت کردیتے۔ اموی حکمرانوں پر اس قسم کے الزام ان مورخین نے لگائے ہیں جو اموی خاندان کے مخالف تھے۔ عبدالملک نے قبۃ الصخرہ، دراصل بیت المقدس کی عیسائی عمارتوں کے مقابلے میں تعمیر کیا تھا۔ [1]

عبدالملک کا زمانہ دو باتوں کی وجہ سے بڑا مشہور ہے۔ ایک دفتروں کی زبان عربی کرنا اور دوسرا سکوں کو ڈھالنا۔ عبدالملک کے زمانے تک دفتروں کا کام مقامی زبانوں میں ہوتا تھا۔ عبدالملک نے آئندہ سے یہ کام عربی میں کرنے کا حکم دے دیا۔ اسی طرح اب تک اسلامی مملکت میں غیر ملکی سکے چلتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے سے اگرچہ اسلامی سکے بننے لگے تھے لیکن یہ سکے بہت کم ہوتے تھے اس لیے اسلامی مملکت میں رومی سکوں کا زیادہ رواج تھا۔ عبدالملک کے زمانے میں رومی بادشاہ نے یہ دھمکی دی کہ وہ رومی سکوں پر پیغمبر اسلام کو گالیاں لکھوائے گا۔ جب عبدالملک کو یہ معلوم ہوا تو اُس نے رومی سکوں کا داخلہ بند کردیا اور دمشق اور کوفہ میں بڑی بڑی ٹکسالیں قائم کردیں جہاں روزانہ لاکھوں سکے ڈھل کر تیار ہونے لگے۔

---

(1) تہذیب وتمدن اسلام حصہ دوم از رشید اختر ندوی صفحہ ۱۶۰ (۱۹۵۲ء)

ولید بن عبدالملک (۸۶ھ تا ۹۶ھ)

عبدالملک کے لڑکے ولید کا زمانہ فتوحات کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس زمانے میں جو فتوحات ہوئیں ان کا حال پڑھ کر حضرت عمرؓ کے زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

ایران کی طرف اسلامی خلافت کی حد اب تک دریائے جیحون تک تھی۔ ولید کے سپہ سالار قتیبہ نے بخارا، سمرقند، خیوہ اور کاشغر فتح کر کے اسلامی حکومت کی حد چین کی سلطنت تک بڑھا دی۔

قتیبہ جب کاشغر فتح کر کے چین کی سرحد کے قریب پہنچ گئے تو انہوں نے چین کے بادشاہ کے سامنے دو تجویزیں پیش کیں۔ یا تو اسلام لاؤ یا پھر جزیہ دو۔ قتیبہ نے چین کے بادشاہ کے پاس جو وفد بھیجا اس نے بادشاہ سے یہ بھی کہا کہ ہمارے سردار نے قسم کھائی ہے کہ میں اس وقت تک واپس نہ جاؤں گا جب تک تمہاری زمین کو اپنے پاؤں سے نہ روندوں اور تمہارے امراء کی گردن نہ دباؤں اور تم سے خراج نہ وصول کروں۔

بادشاہ نے کہا کہ اچھا ہم اس کی قسم پوری کر دیتے ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ اپنے ملک کی کچھ مٹی اس کے پاس بھیج دیتے ہیں کہ وہ اس کو روندے۔ چند شہزادے بھیجتے ہیں کہ وہ ان کی گردنوں کو نیچا کر دے اور اتنا جزیہ دیتے ہیں کہ جس سے وہ خوش ہو جائے۔

بادشاہ چین نے اس کے بعد چار شہزادے اور مٹی قتیبہ کے پاس بھجوا دی جس سے وہ خوش ہو گئے۔ ادھر بادشاہ چین نے یہ ہوشیاری کی اُدھر خلیفہ ولید کا انتقال ہو گیا اور نئے خلیفہ نے قتیبہ کو واپس ہونے کا حکم بھیج دیا جس کی وجہ سے چین کا ملک فتح نہیں ہو سکا۔

۲

پاکستان میں مسلمانوں کا داخلہ بھی اسی زمانے میں ہوا۔ اس کا واقعہ یوں ہے کہ لنکا کے راجہ نے خلیفہ کو ایک جہاز میں تحفے تحائف بھیجے تھے۔ اس جہاز میں بہت سے مسلمان مرد، عورتیں اور بچے بھی تھے جو لنکا سے عرب جا رہے تھے۔ جب یہ جہاز سندھ کے ساحل کے پاس سے گزرا تو یہاں کے بحری ڈاکوؤں نے اسے لوٹ لیا اور مسلمان عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا۔

خلیفہ نے جب یہاں کے راجہ کو لکھا کہ وہ مسلمانوں کو اور ان کے مال کو واپس کر دے تو اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ بس اب کیا تھا۔ مسلمان اب کوئی کمزور قوم تو رہے نہیں تھے جو ظلم و جبر سہتے۔ خلیفہ کے حکم سے محمد بن قاسم کو سپہ سالار بنا کر ایک فوج سندھ روانہ کر دی گئی۔ محمد بن قاسم کی عمر اس وقت صرف سترہ سال تھی لیکن اتنی کم عمر میں وہ اتنا ذہین، عقلمند اور بہادر تھا کہ ایک پوری فوج کا اس کو سردار بنا دیا گیا۔ اس زمانے میں بلوچستان، سندھ اور ملتان کا علاقہ سندھ کی حکومت میں تھا اور یہاں کے راجہ کا نام داہر تھا۔ محمد بن قاسم بلوچستان کے راستے سے آیا اور سب سے پہلے دیبل کی بندرگاہ کو فتح کیا جو کراچی کے موجودہ شہر سے قریب کسی جگہ واقع تھا۔ یہاں محمد بن قاسم نے وہ تمام مسلمان قیدی رہا کرا لیے جن کو قزاقوں نے گرفتار کر لیا تھا۔ اس کے بعد محمد بن قاسم نے راجہ داہر کو شکست دی۔ راجہ داہر لڑائی میں مارا گیا۔

یہ جنگ راور کے مقام پر ہوئی جو جنوبی سندھ میں کسی جگہ تھا۔ برصغیر پاکستان و ہند کی تاریخ میں یہ ایک بڑی فیصلہ کُن جنگ تھی۔ اس جنگ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ مغربی پاکستان آئندہ اسلامی دنیا کا ایک حصہ ہوگا۔ محمد بن قاسم نے اس کے بعد پورا صوبہ سندھ اور ملتان فتح کر لیا۔ محمد بن قاسم اب شمالی بھارت کی طرف بڑھنا چاہتا تھا جہاں قنوج کے راجہ کی طاقتور حکومت قائم تھی لیکن اس عرصہ میں ولید کا انتقال ہو گیا اور نئے خلیفہ نے محمد بن قاسم کو واپس بلا لیا جس کی وجہ سے چین کی طرح بھارت پر بھی مسلمانوں کا قبضہ نہیں ہو سکا۔ اگر محمد بن قاسم واپس نہ جاتا تو شاید مشرقی پاکستان تک اسی زمانہ میں اسلامی حکومت قائم ہو جاتی۔

۳

ولید کے زمانہ میں تیسری لشکر کشی مغرب میں اسپین اور پرتگال پر کی گئی۔ دونوں ملک اس زمانہ میں ایک عیسائی بادشاہ کے قبضہ میں تھے۔ اور ان دونوں ملکوں کو مسلمان اپنے زمانہ میں ''اندلس'' کہا کرتے تھے۔

اندلس کے ایک مسیحی سردار نے وہاں کے بادشاہ راڈرک کے مظالم کے خلاف موسیٰ بن نصیر سے امداد طلب کی جو عبدالملک کے زمانہ سے شمالی افریقہ کے والی چلے آ رہے تھے۔ موسیٰ نے

خلیفہ ولید سے اجازت لینے کے بعد اپنے ایک بربر غلام طارق بن زیاد کو اندلس کی طرف بھیجا۔ طارق نے وادی لکہ کی جنگ میں بارہ ہزار فوج سے راڈرک کی ایک لاکھ فوج کو شکست دی۔ راڈرک جنگ میں مارا گیا۔ اس کے بعد موسیٰ بھی اندلس آ گئے اور موسیٰ اور طارق نے مل کر مختصر سی مدت میں نہ صرف پورا اندلس فتح کر لیا بلکہ کوہ پیرینیز کو پار کر کے فرانس کی حدود میں داخل ہو گئے۔ یہاں سے یہ دونوں سپہ سالار اٹلی، بلقان اور قسطنطنیہ کو فتح کرتے ہوئے شام جانا چاہتے تھے۔ لیکن خلیفہ ولید نے اس خطرناک مہم کی اجازت نہ دی۔ اگر مسلمان اس مہم میں کامیاب ہو جاتے تو آج پورا یورپ مسلمان ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ولید کا دَور بڑے حوصلہ مند سپہ سالاروں کا دَور تھا اگر ان سپہ سالاروں یعنی قتیبہ، محمد بن قاسم اور موسیٰ بن نصیر کو اپنے منصوبوں کو آزادی کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کا موقع ملتا تو شاید آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

ان بڑی فتوحات کے علاوہ ولید کے زمانہ میں مسلمانوں کو اور بھی کئی کامیابیاں ہوئیں۔ ایشیائے کوچک کے محاذ پر رومیوں سے مسلسل لڑائیاں رہیں اور مسلمانوں نے ان سے کئی اہم علاقے چھین لیے۔ ان لڑائیوں میں ولید کے بھائی مسلمہ بن عبدالملک نے سپہ سالار کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی۔

اس دور میں کئی بحری لڑائیاں بھی ہوئیں اور مسلمانوں نے مغربی بحیرۂ روم میں جزائر بلیارک پر قبضہ کر لیا۔

ان فتوحات کی وجہ سے جو صرف دس سال کے مختصر عرصہ میں ہوئیں ولید کے زمانہ میں اسلامی حکومت انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ اب تک دنیا میں اتنی بڑی سلطنت پہلے کبھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ کاشغر سے بحرِ اوقیانوس تک سلطنت کی لمبائی پانچ ہزار میل تھی۔ یہ اتنا زیادہ فاصلہ ہے کہ اگر کوئی شخص پیدل سفر کرے جیسا کہ پُرانے زمانہ میں کیا جاتا تھا اور روزانہ تیس میل چلے تو مشرقی سرے سے روانہ ہو کر مغربی سرے تک آٹھ مہینے سے پہلے نہیں پہنچ سکتا۔

۴

ولید کا زمانہ اگرچہ فتوحات کی وجہ سے مشہور ہے لیکن اس کے عہد میں ترقی کے بھی بہت سے کام ہوئے۔ ولید کو عمارتیں بنانے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے مدینہ کی مسجد نبوی کو پہلے سے بڑا کر دیا اور اس کی نئے سرے سے تعمیر کر کے اس کو بڑی خوبصورت مسجد بنا دیا۔ تعمیر کی خوشی میں حکومت کی طرف سے اہل مدینہ میں نقد روپے تقسیم کیے گئے۔

دارالحکومت دمشق میں بھی نہایت شاندار جامع مسجد تعمیر کی گئی جو اب تک موجود ہے۔ یہ مسجد جس کو جامع اموی کہا جاتا ہے اتنی شاندار تھی کہ جب ایک مرتبہ روم کے سفیر آئے تو انہوں نے کہا:

''ہم لوگ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کا عروج چند روزہ ہے لیکن اس عمارت کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ مسلمان ایک زندہ رہنے والی قوم ہے''

ولید کے زمانہ میں رفاہ عام کے کام اتنے زیادہ ہوئے کہ خلفائے راشدین کے بعد اب تک انجام نہیں دیے گئے تھے۔ سڑکیں درست کی گئیں اور ان پر میل کے نشان لگائے۔ تمام راستوں پر کنوئیں بنوائے۔ مسافروں کی سہولت کے لیے جگہ جگہ مہمان خانے قائم کیے۔ اور ساری سلطنت میں شفا خانے قائم کیے۔ وہ دمشق کے بازار میں ذاتی طور پر کاموں کی نگرانی کرتا تھا۔

ولید کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لوگوں کو بھیک مانگنے کی ممانعت کر دی تھی اور معذور اور اپاہج لوگوں کے روزینے مقرر کر دیئے تھے۔ اندھوں کی رہنمائی اور اپاہجوں کی خدمت کے لیے آدمی مقرر کیے۔

ولید نے یتیموں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کیا۔ علماء اور فقہاء کے وظیفے مقرر کیے تا کہ وہ اطمینان سے لوگوں کو تعلیم دے سکیں۔ اس کے علاوہ وہ نیک لوگوں میں روپیہ تقسیم کراتا تھا۔

ولید اگرچہ جابر اور سخت گیر بادشاہ تھا لیکن اس کے مذکورہ بالا کارنامے اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ ایک بیدار مغز حکمران تھا اور اس کو رعایا سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا۔ ذاتی طور

پر اس کی زندگی مذہبی تھی۔ تین دن میں ایک قرآن ختم کرتا تھا۔ رمضان کے علاوہ پیر اور بدھ کو روزے رکھتا تھا۔ خلافت کے زمانے میں اس نے دو حج کیے۔ قرآن حفظ کرنے پر عطیے دیتا تھا اور رمضان میں مسجدوں میں روزہ داروں کے لیے کھانے کا انتظام کرتا تھا۔

عبدالملک اور ولید کے دَور کی تاریخ میں ہم حجاج بن یوسف کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ شخص اسلامی خلافت کے مشرقی حصے کا والی تھا۔ عراق، ایران، ترکستان اور سندھ اس کے تحت تھے۔ اس کی حیثیت گورنر جنرل کی تھی اور اس کا مرکز کوفہ کا شہر تھا۔ یہ شخص عجیب متضاد طبیعت کا مالک تھا۔ ایک طرف وہ بڑا ظالم اور جابر انسان تھا دوسری طرف بڑا مدبر اور منتظم تھا۔ سندھ اور ترکستان اسی کی کوششوں سے اسلامی دنیا کے حصے بنے۔ قتیبہ فاتح ترکستان اور محمد بن قاسم فاتح سندھ اسی کے مقرر کردہ والی تھے۔ اس زمانہ کا ایک بہت بڑا سپہ سالار مہلب بن ابی صفرہ جس نے عراق اور ایران میں خارجیوں کی بغاوت کو فرو کیا اور جس نے مغربی پاکستان پر درہ خیبر کے راستے محمد بن قاسم سے بھی پہلے حملہ کیا تھا اسی حجاج کا مقرر کردہ سپہ سالار تھا۔ اس کے علاوہ حجاج کا ایک بڑا کارنامہ قرآن مجید پر اعراب اور نقطے لگانا ہے۔ اس سے پہلے عربی رسم الخط میں نہ نقطے ہوتے تھے اور نہ زیر و زبر۔ مؤرخین جب ایک طرف حجاج کے ان کارناموں کو دیکھتے ہیں اور دوسری طرف اس کے ظلم و جبر کو جس کا نشانہ بڑی بڑی ممتاز شخصیتیں بنیں تو ان کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ حجاج کو ایک اچھا والی کہا جائے یا نہیں۔ حجاج نے عبدالملک اور ولید کے عہد میں بائیس سال تک مشرقی خلافت پر حکومت کی۔ اور اس وسیع علاقے میں اموی حکومت کو استحکام اسی کی بدولت حاصل ہوا۔ لیکن عبدالملک اور ولید کے دَور خلافت میں جن گورنروں نے سب سے زیادہ نیک نامی حاصل کی وہ مصر کے گورنر عبدالعزیز اور افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نُصیر ہیں۔ عبدالعزیز اکیس سال تک گورنر رہے۔ وہ مشہور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے والد تھے۔ موسیٰ بن نُصیر شمالی افریقہ میں سولہ سال تک والی کے فرائض انجام دیتے رہے۔

سلیمان بن عبدالملک

ولید کے بعد اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک خلیفہ ہوا۔ اس نے اگرچہ صرف ڈھائی سال حکومت کی لیکن اس کے دَور حکومت میں کئی اہم واقعات پیش آئے۔ پہلا واقعہ ولید کے دَور کے

تین مشہور سپہ سالاروں کا افسوسناک انجام ہے۔ ترکستان کے فاتح قتیبہ نے کسی غلط فہمی کی وجہ سے سلیمان کے خلاف بغاوت کرنا چاہی لیکن اس کی فوج نے ساتھ نہیں دیا اور اپنے ہی سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ محمد بن قاسم کو، کوفہ کے نئے والی نے جو حجاج بن یوسف کے انتقال کے بعد گورنر مقرر ہوا تھا۔ سندھ سے واپس بُلا لیا۔ نیا گورنر چونکہ حجاج کا مخالف تھا اس لیے اس نے حجاج کے تمام رشتہ داروں سے انتقام لیا۔ محمد بن قاسم بھی اس انتقام کا بے قصور نشانہ بنا اور قید کر دیا گیا جہاں اس کا انتقال ہو گیا۔ موسیٰ بن نُصَیر سے سلیمان نے اخراجات سے متعلق سختی سے باز پرس کی اور جب وہ اطمینان بخش جواب نہ دے سکے تو ان سے سارے اخراجات وصول کر لیے اور موسیٰ کی زندگی کا آخری زمانہ تنگ دستی میں گزرا۔ ان سپہ سالاروں میں پہلے دو کے انجام کی ذمہ داری اگرچہ سلیمان پر نہیں ہے اور موسیٰ کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ ان سے جواب طلبی حق وانصاف کی خاطر تھی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ تین عظیم سپہ سالاروں کا یہ افسوس ناک انجام سلیمان کے دَورِ حکومت سے تعلق رکھتا ہے اور اسلامی تاریخ کے مستقبل پر اس کا بڑا اثر پڑا۔

سلیمان کے دَور کا دوسرا اہم واقعہ قسطنطنیہ کا محاصرہ ہے۔ قسطنطنیہ پر یہ حملہ خشکی اور سمندر دونوں راستوں سے کیا گیا تھا۔ اس مہم کا قائد سلیمان کا بھائی مسلمہ بن عبد الملک تھا جو اس سے پہلے بھی رومیوں کے ساتھ جنگوں میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس جنگ میں مسلمانوں کا شدید نقصان ہوا۔ تھریس کی سخت برفباری اور سامان رسد کی کمی کی وجہ سے فاقہ کشی پر نوبت آ گئی تھی لیکن مسلمہ ہر مشکل میں قسطنطنیہ فتح کرنے کا عزم کیے ہوئے تھا۔ لیکن اس دَوران میں سلیمان کا انتقال ہو گیا اور نئے خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے جو امن کے خواہش مند تھے فوجوں کو واپس بلا لیا۔

سلیمان کے دَور کا تیسرا اہم واقعہ حضرت عمر بن عبد العزیز کی جانشینی ہے۔ سلیمان ایک دیندار اور بیدار مغز حکمران تھا۔ اُس نے اپنے مختصر دَور میں ان زیادتیوں کی تلافی کرنے کی کوشش کی تھی جو ولید کے دَور میں حجاج اور دوسرے حاکموں کی وجہ سے لوگوں کو اٹھانا پڑی تھیں۔ سلیمان کو اُس کی اصلاح پسند طبیعت اور نیک کاموں کی وجہ سے تاریخ میں ''مفتاح الخیر'' یعنی بھلائی کی کُنجی کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے نیک کاموں میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اس نے عمر بن عبد العزیز جیسی ہستی کو اپنا جانشین مقرر کیا، حالانکہ شاہی خاندان کے دوسرے اہم لوگ اور خود اس کے حقیقی بھائی اور لڑکے موجود تھے۔ سلیمان نے یہ فیصلہ اپنے مصاحب رجاء بن

حیوٰۃ کے اس مشورے کے بعد کیا کہ:

''خلیفہ ایسے صالح شخص کو بنانا چاہئے کہ وصیت کرنے والے کو قبر میں امن رہے''

عمر بن عبدالعزیز

فتوحات، تمدنی اور رفاہِ عام کے کاموں کے لحاظ سے اگرچہ ولید کا دَورِ حکومت بے مثل تھا لیکن اموی دَور میں اگر کوئی حکمران عظیم کہلانے کا مستحق ہے تو وہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں۔ انہوں نے صرف دو سال پانچ ماہ خلافت کی لیکن اس مختصر مدت میں خلفائے راشدین کی یاد تازہ کر دی۔

عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ بننے سے پہلے بڑے عیش اور آرام کی زندگی گزارتے تھے اور بڑے نازک مزاج تھے۔ اپنے زمانے کے سب سے زیادہ خوش لباس اور جامہ زیب آدمی سمجھے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ جو لباس پہن لیتے تھے پھر دوبارہ نہیں پہنتے تھے لیکن خلیفہ بننے کے بعد ان کی زندگی بالکل بدل گئی۔ شاہی شان و شوکت سے مُنہ موڑ لیا اور سادہ زندگی اختیار کر لی۔

امیر معاویہؓ، عبدالملک اور ولید وغیرہ اگرچہ اچھے اور قابل حکمران تھے لیکن ان کے زمانہ میں لوگوں پر بہت سی زیادتیاں بھی ہوئیں تھیں اور سب سے بڑا عیب تو یہ تھا کہ خلافت بادشاہت بن گئی تھی۔ خلیفہ اب مسلمانوں کا منتخب کیا ہوا نہیں ہوتا تھا بلکہ خاندان بنی امیہ نے طاقت کے زور سے سلطنت حاصل کر لی تھی اور سلطنت کو اپنی جاگیر بنا لیا تھا۔ خلیفہ ان ہی کے خاندان کا آدمی ہوسکتا تھا۔ بیت المال میں جو رقم آتی تھی اس کو اپنا مال سمجھتے تھے اور اس سے زیادہ تر خلیفہ کے رشتہ داروں اور حامیوں کو فائدہ پہنچتا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس ظلم و زیادتی کا خاتمہ کر دیا۔ ظالم اور جابر عہدیداروں کو ان کے عہدوں سے ہٹا دیا۔ بیت المال کو رعایا کی ملکیت بنا دیا۔ اس سے صرف ان لوگوں کی مدد کی جاتی تھی جو مستحق تھے۔

۲

علمی لحاظ سے عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے وقت کے ممتاز علماء میں سے تھے اور اخلاق و کردار کی بلندی کے لحاظ سے وہ تابعین کے اُس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنے عمل میں صحابہؓ سے مشابہ تھا۔ ان کے والد عبدالعزیزؒ خلیفہ عبدالملک کے بھائی تھے اور مصر کے بڑے نیک نام گورنر تھے۔

غالباً یہ باپ کی تربیت ہی کا اثر تھا کہ وہ شروع ہی سے نیکی کی طرف مائل تھے اور حکومت کے استبدادی نظام کو ناپسند کرتے تھے۔ خلیفہ منتخب ہونے سے پہلے عہد ولید کے ظالم امراء پر ان کا یہ تبصرہ ان کے اس رجحان کا واضح ثبوت ہے:

''عراق میں حجاج، شام میں ولید، مصر میں قُرّہ بن شریک، مدینہ میں عثمان بن حیان اور مکہ میں خالد بن عبداللہ قسری، خداوند تیری دنیا ظلم سے بھر گئی ہے اب لوگوں کو راحت دے''

ولید کے بعد سلیمان اور پھر عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت کیا تعجب اسی دُعا کا نتیجہ ہو۔ ولید کے زمانہ میں وہ مدینہ کے والی تھے اور مسجد نبوی کی توسیع اُن ہی کے زیر انتظام ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں ان کو ولید کے حکم پر ایک ظالمانہ فعل کا ارتکاب کرنا پڑا جس کا ان کے ذہن پر اتنا اثر پڑا کہ زندگی کا رُخ ہی بدل گیا۔

عمر بن عبدالعزیز اگرچہ دستور کے مطابق خلیفہ مقرر ہو چکے تھے لیکن ان کا تقرر چونکہ عام مسلمانوں کے مشورہ سے نہیں ہوا تھا اس لیے انہوں نے خلافت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور انتخاب خلیفہ کے معاملے کو عوام کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا:

''لوگو! میری خواہش اور عام مسلمانوں کی رائے لیے بغیر مجھے خلافت کی ذمہ داریوں میں مبتلا کیا گیا ہے، اس لیے میں خلافت سے دست بردار ہوتا ہوں اور تم جسے چاہو اپنا خلیفہ بنالو''

لیکن مجمع نے آپ کی دست برداری کو قبول نہیں کیا اور آپ کو اتفاق رائے سے خلیفہ منتخب کر لیا۔ جب عمر بن عبدالعزیزؒ کو یقین ہو گیا کہ کسی شخص کو آپ کی خلافت سے اختلاف نہیں تو آپ نے خلافت کی ذمہ داری قبول کر لی اور مجمع عام کے سامنے تقریر کی جو اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں ان بنیادی خیالات کا اعادہ کیا گیا ہے جو اسلامی ریاست کے بنیادی اصول سمجھے جاتے ہیں اور جن پر خلفائے راشدین ہمیشہ عمل پیرا رہے۔ آپ نے فرمایا:

''خدا نے جو چیز حلال کر دی ہے وہ قیامت تک حلال ہے اور جو حرام کر دی ہے وہ قیامت تک حرام ہے۔ میں اپنی طرف سے کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں بلکہ صرف احکام الٰہی کو نافذ کرنے والا ہوں۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ خدا کی نافرمانی میں اس کی اطاعت کی جائے۔ میں تم میں کوئی ممتاز آدمی نہیں ہوں بلکہ معمولی فرد ہوں، البتہ تمہارے مقابلے میں اللہ نے مجھ پر ذمہ داریاں زیادہ عاید کر دی ہیں''

خلافتِ راشدہ کے بعد ملوکیت کے دَور میں یہ پہلی اور آخری مثال ہے کہ جب خلافت کے اسلامی تصور کی بالادستی قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے نہ صرف بیت المال کو ناجائز مصرف سے بچایا بلکہ شاہی خاندان والوں کو بھی جو بڑی بڑی جاگیریں اور جائدادیں ناجائز طور پر ملی ہوئی تھیں ان سب کو واپس لے کر اُن کے اصلی، مالکوں کو واپس کر دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے سب سے پہلے اپنی ذاتی جاگیر، واپس کر دی۔ آپ نے سابق شاہی خاندان کے لوگوں کے وظیفے بھی اسی شرح سے مقرر کیے جس شرح سے عام لوگوں کو دیئے جاتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ کام آسان نہیں تھا۔ کوئی شخص اپنی جائیداد اور مال سے اور سہولتوں سے آسانی سے دست بردار نہیں ہوسکتا۔ لیکن عمر بن عبدالعزیز نے اپنے منصوبہ پر پوری طرح عمل کر کے دکھا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی خاندان کے لوگ آپ کے مخالف ہو گئے۔

عمر بن عبدالعزیز خلفائے راشدین کی طرح خود بھی بیت المال سے صرف اتنی رقم لیتے تھے جو زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے۔ اس سلسلے میں آپ جو غیر معمولی احتیاط کرتے تھے تاریخ کی کتابوں میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیز چراغ کی روشنی میں سرکاری کام کر رہے تھے ایک شخص ان سے ملنے آیا۔ کام چونکہ ذاتی تھا اس لیے حضرت عمرؒ نے چراغ بُجھا دیا اور اندھیرے میں باتیں کرنے لگے۔ اس شخص نے جب وجہ پوچھی تو آپ نے جواب دیا:

"یہ سرکاری چراغ ہے اور مَیں تم سے ذاتی گفتگو کر رہا ہوں اس لیے مَیں نے چراغ بجھا دیا۔ بیت المال کا روپیہ ہم ذاتی کام پر خرچ نہیں کر سکتے۔"

اسی طرح ایک مرتبہ بیت المال میں بہت سے سیب آئے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز انہیں عام مسلمانوں میں تقسیم کر رہے تھے کہ ان کا چھوٹا بچہ ایک سیب اٹھا کر کھانے لگا۔ یہ دیکھ کر آپ نے اس کے منہ سے سیب چھین لیا۔ وہ رونے لگا اور ماں سے شکایت کی۔ ماں نے بازار سے سیب منگا دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز جب گھر واپس آئے تو سیب کی خوشبو محسوس کر کے بیوی سے پوچھا کہ سرکاری سیب تو یہاں نہیں آیا۔ جب بیوی نے سارا واقعہ بیان کر دیا تو آپ کو اطمینان ہوا اور بیوی سے کہا:

''اللہ کی قسم میں نے اُس کے مُنہ سے سیب نہیں چھینا تھا بلکہ اپنے دل سے چھینا تھا اس لیے کہ مسلمانوں کے حصے کے سیب کے بدلے میں، میں اپنے کو اللہ کے سامنے برا پانہ کر دوں۔''

عمر بن عبدالعزیز کی سیاست کی بنیاد جبر اور طاقت کی بجائے عدل و انصاف پر تھی۔ حجاج بن یوسف کے طرز حکومت کو آپ اس قدر نا پسند کرتے تھے کہ آپ نے اس کے مقرر کردہ حاکموں کو تمام ملکی حقوق سے محروم کر دیا۔ آپ نے جبر، ظلم اور طاقت کے اظہار کی بجائے انصاف کو کامیاب حکومت کی کنجی قرار دیا۔ اُموی دَور میں ذرا ذرا سی بدگمانی اور شُبہ پر سزا دینا عام ہو گیا تھا۔ یہ بات قانون کی برتری کے اصول کے خلاف تھی، اس لیے عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں اس طریقہ کو بالکل بند کر دیا گیا۔ آپ نے والیوں کو حکم دیا کہ ''صرف شرعی ثبوت پر جواب طلب کیا جائے اور سزا دی جائے۔ اگر حق لوگوں کی اصلاح نہیں کر سکتا تو پھر کسی طرح ان کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔''

ایک مرتبہ خراسان کے ایک گورنر نے لکھا کہ ''اہل خراسان کو کوڑے اور تلوار کے سوا کوئی چیز درست نہیں کر سکتی۔'' اس پر عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا کہ ''تمہارا یہ کہنا کہ اہل خراسان کو کوڑے اور تلوار کے علاوہ کوئی اور چیز درست نہیں کر سکتی بالکل غلط ہے۔ ان کو عدل اور حق درست کر سکتا ہے اور اسی کو جہاں تک ہو سکے عام کرو۔''

عدل و انصاف کے معاملے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز مسلم اور غیر مسلم میں فرق نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے عہد حکومت میں ذمیوں اور غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ کیا۔ ذمی کے خون کی قیمت مسلمانوں کے خون کے برابر قرار دی۔ کوئی مسلمان ذمیوں کے مال پر دست درازی نہیں کر سکتا تھا۔ جب آپ نے شاہی خاندان سے زمینیں لے کر ان کے اصل مالکوں کو واپس دلائیں تو بعض ایسے گرجوں کو بھی عیسائیوں کو واپس دلایا جو غلط طریقے سے لے لیے گئے تھے۔ جب شہزادہ عباس بن ولید کو اس کی زمین واپس کرنے کا حکم دیا جو ایک عیسائی سے چھینی گئی تھی تو عباس نے اپنے حق کے ثبوت میں کہا کہ یہ میرے باپ ولید نے دی تھی۔ لیکن عمر بن عبدالعزیز نے اس دلیل کو یہ کہہ کر ردّ کر دیا کہ ''اللہ کی کتاب ولید کی سند پر مقدم ہے'' اور ذمی کو زمین واپس دلا دی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عدل و انصاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کے زمانے میں غیر مسلم کثرت سے اسلام لا کر ملت اسلامیہ میں شامل ہو گئے۔ سندھ میں بھی تیزی سے اسلام پھیلا یہاں تک کہ راجہ داہر کا لڑکا جے سنگھ بھی اسلام لے آیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں معاشرے کی اصلاح کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ مسلمانوں میں مال و دولت کی کثرت کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوگئیں تھیں۔ بہت سے لوگ شراب پینے لگے تھے۔ حماموں میں مرد برہنہ ہو کر نہاتے تھے اور ان حماموں میں عورتوں نے بھی غسل کے لیے جانا شروع کر دیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان سب کی روک تھام کی۔ شراب کی خرید و فروخت بند کر دی، عورتوں کو حماموں میں جانے سے روک دیا اور مردوں کو تہبند باندھ کر غسل کرنے کا حکم دیا۔

ولید کے زمانے میں رفاہِ عام کے جو کام ہوئے ان کا حال ہم پچھلے صفحوں میں پڑھ چکے ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان کاموں کو اور آگے بڑھایا۔ آپ کے عہد میں خراسان اور ترکستان میں راستوں پر مسافروں کے لیے سرائیں تعمیر کی گئیں جہاں تندرست مسافر ایک دن اور بیمار مسافر دو دن بلا معاوضہ رہ سکتا تھا۔ ملک میں جس قدر معذور لوگ تھے سب کے نام کتاب میں لکھ کر ان کا خرچ مقرر کر دیا۔ حضرت عمر فاروق ؓ کے زمانے کی طرح شیر خوار بچوں کے بھی وظیفے مقرر کیے اور جو غریب قرض ادا نہیں کر سکتے تھے ان کے قرض ادا کرنے کا انتظام کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ رفاہِ عام کے ان کاموں کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ڈھائی سال کی مختصر مدت میں اس قدر کام کیسے کیے گئے۔ یہ دراصل استبدادی نظام کے خاتمے اور خلافت کی بحالی کی بدولت ممکن ہوا۔ ان اصلاحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے بلادِ اسلامیہ میں خوشحالی عام ہوگئی اور کوئی صدقہ اور بھیک لینے والا نہیں ملتا تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ان انقلابی اصلاحات نے ملوکیت کے استبدادی نظام اور اس کے تحت پرورش پانے والے مفاد پرست طبقہ پر کاری ضرب لگائی تھی۔ اس طبقہ کی رہنمائی شاہی خاندان کے افراد کر رہے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ان تیز رفتار اصلاحات سے ان کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ وہ خاندانی بادشاہت بھی ختم کر دیں گے اور خلافت کو عام مسلمانوں کے حوالے کر جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ اُن کی عمر اس وقت صرف ۳۹ سال تھی۔

ہشام بن عبدالملک

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اگرچہ استبدادی نظام کو ختم کر دیا تھا لیکن وہ ملوکیت کے نظام کو ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ سلیمان نے عمر بن عبدالعزیز کو جانشین مقرر کرنے کے ساتھ

یہ بھی فیصلہ کر دیا تھا کہ عمر بن عبدالعزیز کے بعد اُس کا بھائی یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوگا۔ سلیمان نے یہ فیصلہ اس ڈر سے کیا تھا کہ اگر عبدالملک کی اولاد کو قطعی نظر انداز کر دیا جاتا تو عبدالملک کے گھر والے عمر بن عبدالعزیز کی خلافت قائم نہ رہنے دیتے۔ چنانچہ عمر بن عبدالعزیز کے بعد یزید ثانی ان کی جگہ خلیفہ ہوا۔ یزید ثانی نے چالیس دن تک عمر بن عبدالعزیز کے نقش قدم پر چلنا چاہا اور ان کی اصلاحات کو قائم رکھا۔ لیکن یہ بھاری پتھر اس سے نہ اٹھ سکا اور چالیس دن بعد تمام اصلاحات منسوخ کر کے وہی پُرانا استبدادی نظام پھر قائم کر دیا۔ چار سال چار ماہ حکومت کرنے کے بعد یزید کا انتقال ہو گیا اور اس کا بھائی ہشام بن عبدالملک خلیفہ ہو گیا۔

ہشام جس نے بیس سال حکومت کی۔ خاندان بنی اُمیہ کا آخری بڑا حکمران ہے۔ وہ بڑا پاکباز، منتظم، کفایت شعار اور بیدار مغز حکمران تھا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس میں امیر معاویہ کا علم و تدبر اور عبدالملک کی اولوالعزمی ایک ساتھ جمع ہو گئی تھیں۔ اس کے انصاف کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بیت المال میں اس وقت تک آمدنی کی رقم داخل نہ کرتا جب تک چالیس آدمی یہ شہادت نہ دے دیں کہ یہ رقم جائز طریقہ سے حاصل کی گئی ہے۔ وہ انصاف میں مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان فرق نہ رکھتا تھا۔ اس کے عہد میں شام میں رصافہ اور سندھ میں منصورہ اور محفوظ کے شہر آباد ہوئے۔

ہشام کے زمانے میں خراسان، ترکستان، آرمینیہ، آذربائیجان اور شمالی افریقہ میں سخت قسم کی بغاوتیں اور لڑائیاں ہوئیں، لیکن ان سب شورشوں کو کامیابی سے فرو کر دیا گیا۔ خراسان اور ترکستان کی لڑائیوں میں وہاں کے حاکم نصر بن سیار نے جو انتظامی لحاظ سے غیر معمولی صلاحیت رکھتا تھا بڑا نام پیدا کیا۔ آرمینیہ اور آذربائیجان پر غیر مسلم ترکوں کی ایک شاخ خزر نے جو جنوبی روس پر حکمران تھی مسلسل حملے کیے لیکن ان تمام حملوں کو پسپا کر دیا گیا اور اموی شہزادہ مروان بن عبدالملک داغستان سے گزرتا ہوا خزر کے دارالحکومت بلنجر تک پہنچ گیا۔ ان حملوں کی وجہ سے خزر مملکت کا دارالحکومت کئی سو میل شمال میں دریائے والگا کے کنارے آتل کے مقام پر منتقل کر دیا گیا۔

ایشیائے کوچک میں رومیوں کے ساتھ سخت لڑائیاں ہوئیں۔ ان لڑائیوں میں بھی ولید اور سلیمان کے دَور کی طرح اس بار بھی اموی شہزادے مسلمہ بن عبدالملک نے بڑے کارنامے انجام دیے۔

شمالی افریقہ میں بربر نومسلموں نے حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے کئی بار سخت بغاوتیں کیں

لیکن مرکزی حکومت نے ان کو دبا دیا اور خلافت دمشق کا لشکر پہلی مرتبہ مراکش کے جنوب میں صحرائے اعظم کو پار کر کے اس علاقہ میں داخل ہو گیا جو آج کل سینیگال اور مالی کہلاتا ہے اور اُس زمانے میں سوڈان کہلاتا تھا۔ یہاں سے سونا اور بہت سا مالِ غنیمت حاصل ہوا۔ مراکش کا انتہائی جنوبی حصہ سوس اقصیٰ بھی اسی زمانہ میں مملکت اسلامیہ میں داخل ہوا اور وہاں کے باشندوں نے اسلام قبول کر لیا۔

ہشام کے زمانہ میں سندھ میں اسلامی قوت کو اور استحکام حاصل ہوا۔ سندھ کا گورنر (۱۰۷۔۱۱۱ھ) جنید بڑا قابل صوبیدار تھا۔ اس نے کشمیر تک تقریباً وہ تمام علاقہ فتح کر لیا جو اب مغربی پاکستان کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے ہندوستان میں مارواڑ، اجین، گجرات اور بھڑوچ تک سارا علاقہ فتح کر لیا۔ اگرچہ بعد کے صوبیداران فتوحات کو برقرار نہیں رکھ سکے۔

لیکن ہشام کے عہد کی فوجی مہمات میں سب سے اہم اندلس کے والی عبدالرحمان غافقی کا فرانس پر حملہ ہے۔ عبدالرحمان کوہ پرنیز، کو پار کر کے فرانس میں داخل ہوا اور جنوبی اور مغربی فرانس کو فتح کرتا ہوا دریائے لوئر کے کنارے ٹورس تک پہنچ گیا جو پیرس سے صرف ڈیڑھ سو میل دور ہے۔ یہاں مسلمانوں کا یورپ کی متحدہ فوجوں سے مقابلہ ہوا۔ دو دن سخت لڑائی ہوئی لیکن دوسرے دن امیر عبدالرحمن شہید ہو گیا۔ اس کی شہادت سے مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے مسلمان فوجیں رات کی تاریکی میں میدان جنگ سے واپس ہو گئیں۔ دوسرے دن میدان خالی دیکھ کر عیسائی بہت حیران ہوئے لیکن ان کو مسلمانوں کا تعاقب کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

بنی امیہ کا زوال

ہشام کا جانشین ولید بن یزید بن عبدالملک جو ولید ثانی کہلاتا ہے ایک نااہل اور عیاش حکمران تھا۔ اس کی زندگی میں عجیب تضاد تھا۔ شراب و کباب میں بھی مست رہتا تھا اور نماز بھی پابندی سے پڑھتا تھا۔ اس کی نااہلی کی وجہ سے عربوں میں قبائلی عصبیت نے زور پکڑ لیا اور بالآخر وہ چند ماہ کی حکومت کے بعد اسی عصبیت کا شکار ہو کر مارا گیا۔ جب لوگ اس کو قتل کرنے کے لیے محل میں داخل ہوئے تو ولید قرآن کھول کر تلاوت میں مصروف ہو گیا اور کہا کہ "میں چاہتا ہوں کہ جس طرح عثمانؓ قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے شہید ہوئے تھے اسی طرح میرا بھی خاتمہ ہو"

ولید ثانی کا جانشین یزید بن ولید یا یزید ثالث عابد و زاہد انسان تھا۔ اس کو یزید الناقص بھی کہتے ہیں۔ اس نے خلافت کو اسلامی رنگ دینے کے عزم کا اظہار کیا تھا۔ لیکن اس کی خلافت ابھی

مستحکم نہیں ہوئی تھی کہ اس کے مقابلے میں دعویدار کھڑے ہو گئے۔ چھ ماہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ یزید ثالث کا جانشین اس کا بھائی ابراہیم بن ولید ہوا لیکن اب شاہی خاندان کے افراد کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی اور ایک دوسرے شہزادے مروان بن محمد نے جو عبدالملک کا بھتیجا تھا تین یا چار ماہ بعد ہی اس کی حکومت ختم کر دی اور خود حکمران بن بیٹھا۔

مروان ثانی جو تاریخ میں مروان الحمار کے نام سے بھی مشہور ہے ایک قابل، تجربہ کار اور دلیر انسان تھا۔ خزر ترکوں کے خلاف لڑائیوں میں اس نے اپنی فوجی قابلیت کا اچھا ثبوت دیا تھا۔ لیکن سلطنت کے اندرونی حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ وہ ان پر قابو نہ پا سکا۔ حکمران خاندان میں بھی اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ عرب بھی دو گروہوں یمنی اور مصری قبائل میں تقسیم ہو گئے تھے اور ایک دوسرے کو قتل کر رہے تھے۔ سلطنت میں ہر جگہ شورش اور بغاوتیں شروع ہو گئی تھیں۔ ان میں سے خطرناک بغاوت بنی ہاشم کی تھی۔ بنی ہاشم چونکہ اس خاندان سے تھے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے ہیں اس لیے وہ خود کو خلافت بنی اُمیہ سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے۔

بنی ہاشم میں بھی دو گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ ایک وہ جو حضرت علیؓ کو اور ان کے بعد ان کی اولاد کو خلافت کا حق دار سمجھتا تھا۔ یہ گروہ شیعانِ علیؓ کا طرفدار کہلاتا تھا۔ بعد میں اسی گروہ میں سے کچھ لوگوں نے شیعہ فرقہ کی شکل اختیار کر لی اور وہ اثنا عشری[1] کہلائے۔

---

(1) اثنا عشری اس لیے کہا جاتا ہے کہ شیعوں کا عقیدہ بارہ اماموں پر ہے جو حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کی اولاد میں ہوئے ہیں۔ بارہ کو عربی میں اثنا عشر کہا جاتا ہے۔ اس لیے شیعہ خود کو اثنا عشری کہتے ہیں۔ یہ بارہ امام حسب ذیل ہیں:

۱۔ حضرت علیؓ ۶۰۰ء تا ۶۶۱ء ۲۔ حضرت حسنؓ ۶۲۴ء/۳ھ تا ۶۶۹ء/۵۹ھ

۳۔ حضرت حسینؓ ۶۲۶ء/۴ھ تا ۶۸۰ء/۶۱ھ ۴۔ امام علی زین العابدینؓ ۶۵۹ء/۳۸ھ تا ۷۱۳ء/۹۵ھ

۵۔ امام محمد باقر ۶۷۷ء/۵۷ھ تا ۷۳۲ء/۱۱۴ھ ۶۔ امام جعفر صادق ۶۹۹ء/۸۳ھ تا ۷۶۵ء/۱۴۸ھ

امام جعفر صادق بنی اُمیہ کے آخری اور بنی عباس کے ابتدائی زمانے میں تھے۔ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ شیعہ قانون یا فقہ آپ ہی کے نام پر فقہ جعفری کہلاتا ہے۔ امام جعفر صادق تک شیعوں میں اور عام مسلمانوں میں کوئی مذہبی اختلاف نہیں تھا لیکن آپ کے بعد شیعوں نے بتدریج ایک مستقل فرقہ کی شکل اختیار کر لی۔

۷۔ امام موسیٰ کاظم ۷۴۵ء/۱۲۸ھ تا ۷۹۹ء/۱۸۳ھ ۸۔ امام علی رضا ۷۶۵ء/۱۴۸ھ تا ۸۱۸ء/۲۰۳ھ

۹۔ امام محمد جواد تقی ۸۱۱ء/۱۹۵ھ تا ۸۳۵ء/۲۲۰ھ ۱۰۔ امام علی نقی ہادی ۸۲۸ء/۲۱۲ھ تا ۸۶۸ء/ ۲۵۴ھ ۱۱۔ امام حسن عسکری ۸۴۶ء/۲۳۲ھ تا ۸۷۳ء/۲۶۰ھ ۱۲۔ محمد مہدی ۲۵۵ھ

محمد مہدی ۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے۔ امام حسن عسکری کے صاحبزادے تھے۔ چار سال کی عمر میں سامرا کے ایک غار میں غائب ہو گئے۔ شیعہ ان کو زندہ تسلیم کر کے امام منتظر، امام زمان، مہدی دوران کے القاب سے یاد کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ قیامت سے قبل آپ کا ظہور ہوگا۔

دوسرا گروہ رسول اللہؐ کے چچا حضرت عباس کی اولاد کو خلافت دلانا چاہتا تھا۔ شروع میں دونوں گروہوں نے مل کر بنی اُمیہ کی حکومت کے خلاف بغاوتیں کیں لیکن بعد میں عباسی گروہ غالب آ گیا۔

بنی عباس کی دعوت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے سے ہی شروع ہوگئی تھی، ہشام کے دَور میں اس نے وسعت حاصل کر لی۔ خلافت کے اصل دعویدار اہل بیت تھے یعنی حضرت علیؓ کی وہ اولاد جو حضرت فاطمہؓ کے بطن سے تھی یا پھر حضرت علیؓ کی غیر فاطمی اولاد جو علوی کہلاتی ہے۔ امام حسینؓ کی شہادت کے بعد شیعانِ علی نے منصب امامت امام حسینؓ کے صاحبزادے زین العابدین کو پیش کیا تھا لیکن جب انہوں نے قبول نہیں کیا تو شیعوں نے حضرت علیؓ کے غیر فاطمی فرزند محمد بن حنفیہ (۲۱ھ تا ۸۱ھ) کو امام بنا لیا اور اس طرح امامت کا منصب اہل بیت نبوی سے علوی شاخ میں منتقل ہوگیا۔ محمد بن حنفیہ کے بعد ان کے صاحبزادے ابو ہاشم عبداللہ جانشین ہوئے اور ایران میں ان کی دعوت خفیہ انداز میں پھیلتی رہی۔ ۱۰۰ھ میں ابو ہاشم عبداللہ نے شام میں وفات پائی۔ اس وقت ان کے خاندان میں سے کوئی شخص ان کے پاس نہیں تھا۔ مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عباس کے پوتے محمد بن علی قریب موجود تھے اس لیے ابو ہاشم نے ان کو جانشین مقرر کر کے منصب امامت ان کے سپرد کر دیا اور اس طرح امامت علویوں سے عباسیوں میں منتقل ہوگئی۔ بنی ہاشم کی یہ دعوت عمر بن عبدالعزیزؒ سے ہشام تک خفیہ رہی اور عراق اور خراسان کے بڑے حصے میں پھیل گئی۔ ۱۲۶ء میں محمد بن علی کا انتقال ہوگیا اور ان کے بعد ان کے لڑکے ابراہیم ان کے جانشین ہوئے۔ ان کا مرکز شام میں ایک مقام حمیمہ تھا۔ ان کے دَور میں تحریک نے بہت زور پکڑ لیا اور مشہور ایرانی ابو مسلم خراسانی اسی زمانہ میں عباسی تحریک کے حامی کی حیثیت سے داخل ہوا۔ اس نے ایک طرف عربوں کو آپس میں لڑایا اور دوسری طرف ایرانیوں کو عربوں کے خلاف ابھارا۔ اس جگہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ محمد بن علی نے ابو مسلم کو ہدایت کی تھی کہ خراسان میں کوئی عربی بولنے والا زندہ نہ چھوڑا جائے۔ مروان کے دَور میں اس سازش کا انکشاف ہوگیا اور ابراہیم کو قتل کر دیا گیا۔ اب ابراہیم کا بھائی ابو العباس عبداللہ بن علی جانشین ہوا۔ اس نے بھی حکم دیا کہ خراسان میں کوئی عرب زندہ نہ چھوڑا جائے۔ اس نے ابراہیم کے غم میں سیاہ لباس اور سیاہ جھنڈا عباسیوں کا نشان قرار دیا۔

ہم پڑھ چکے ہیں کہ ایرانی شروع ہی سے عربوں سے نفرت کرتے تھے اور عرب ایرانیوں سے۔ جب ایران پر عربوں کا قبضہ ہوا تو خلفائے راشدین نے منصفانہ حکومت قائم کر کے اس نفرت کو کم کرنے کی کوشش کی لیکن بنی امیہ کے حکمران خلفائے راشدین کے اصولوں پر نہ چلے۔ ایرانیوں کو بھی حکومت سے شکایت بڑھتی چلی گئی۔ وہ اب مسلمان ہو گئے تھے اور بحیثیت مسلمان عربوں کے برابر حقوق چاہتے تھے۔ جب ان کے ساتھ برابر کا سلوک نہیں کیا گیا تو وہ بنی امیہ کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی فکر کرنے لگے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے انہوں نے بنی ہاشم کا ساتھ دیا۔

بنی امیہ کے زمانے میں عربوں اور ایرانیوں کے درمیان نفرت بڑھنے کے علاوہ خود عربوں کے اندر قبائلی عصبیت اور اختلافات بھی بہت بڑھ گئے تھے۔ یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہے کہ رنگ و نسل کے یہ اختلافات جن کو مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا اتنی جلدی پھر سر اٹھانے لگے اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلے والوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے لگا۔ اس اختلاف کی وجہ سے عربوں کی قوت کمزور ہو گئی اور بنی امیہ کا سب سے بڑا سہارا چونکہ صرف عرب تھے اس لیے ان کی قوت کمزور ہونے سے بنی امیہ کی سلطنت کمزور پڑ گئی۔

اسلامی دنیا کی یہ حالت تھی کہ بنی ہاشم کے حامیوں نے ایرانیوں کی مدد سے خراسان میں زبردست بغاوت کر دی۔ ہشام کے نااہل جانشین اس بغاوت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس جدوجہد میں ایک ایرانی سردار ابو مسلم خراسانی سے بنی ہاشم کو بڑی مدد ملی۔ وہ بڑا متعصب ظالم اور سفاک ایرانی تھا لیکن زبردست تنظیمی صلاحیت کا مالک تھا۔ بنی ہاشم کے یہ حامی ماوراء النہر اور ایران پر قبضہ کرنے کے بعد عراق میں داخل ہو گئے جہاں بنی امیہ کے آخری حکمران مروان بن محمد نے دریائے زاب کے کنارے مقابلہ کیا لیکن ایسی شکست فاش کھائی کہ راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ بعد میں مروان پکڑا گیا اور اس کو قتل کر دیا گیا۔ دارالخلافہ دمشق پر بنی ہاشم کا قبضہ ہو گیا اور بنی امیہ کی حکومت ختم ہو کر بنی ہاشم کی شاخ بنی عباس کی حکومت قائم ہو گئی۔
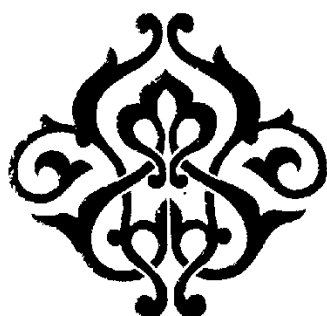
باب ۹

ملوکیت کے نظام کے تحت

خاندان بنی امیہ کی حکومت ۹۲ سال قائم رہی۔ چودہ سال امیر معاویہؓ کا خاندان اور ۷۸ سال مروان کا خاندان حکمران رہا۔ یہ زمانہ ملوکیت کے قیام اور استحکام کا دور ہے۔ امیر معاویہ کے زمانے میں استبداد اور ملوکیت کے برے نتائج زیادہ نمایاں نہیں ہوئے تھے کیونکہ وہ قوت کے استعمال کے ساتھ ساتھ مصلحت، نرمی اور مفاہمت سے بھی کام لینے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن عبدالملک کے بعد سے بادشاہت کا نظام اپنی تمام خرابیوں کے ساتھ نمودار ہوگیا۔ اگرچہ حکمران اب بھی خلیفہ اور امیر المومنین کہلاتے تھے اور انہوں نے اپنے لیے شاہ یا سلطان کا لقب ابھی تک اختیار نہیں کیا تھا۔ خلیفہ کے تقرر کے وقت بیعت اب بھی لی جاتی تھی لیکن اس کی حیثیت اب صرف نمائشی رہ گئی تھی۔ بیعت کی رسم سے اگر کوئی بات ظاہر ہوتی تھی تو وہ صرف یہ کہ نظام خلافت اور مسلمانوں کی رائے عامہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ لیکن رائے دینے کی آزادی اب سلب ہو چکی تھی۔ قوت اپنی ننگی شکل میں نمودار ہو چکی تھی اور اختلاف کرنا جان سے ہاتھ دھونے کے برابر تھا۔ اس بات نے ملوکیت کو استحکام بخشا۔

نظام ملوکیت کی وجہ سے اسلامی دنیا ان نعمتوں اور برکتوں سے محروم ہوگئی جو خلافت راشدہ کی خصوصیات تھیں اور اسلامی دُنیا کے سیاسی ڈھانچہ میں حسب ذیل خرابیاں نمودار ہوئیں:

ا۔ حکمران ایک عام فرد نہیں رہا جیسا کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں تھا۔ اب دمشق کے حکمرانوں نے ایران اور روم کے بادشاہوں کی طرح شاہانہ زندگی اختیار کرلی۔ انہوں نے رہائش کے لیے شاندار محل تعمیر کیے جن پر بے شمار دولت صرف ہوئی۔ حفاظت کے لیے دربان اور باڈی گارڈ مقرر کیے۔ اب لوگ حکمران سے براہِ راست نہیں مل سکتے تھے۔ حاجب اور دربان ان کے اور عوام کے درمیان حائل ہوگئے اور اس طرح حکمران اور عوام کے درمیان وہ براہِ راست تعلق ختم ہوگیا جو خلافت راشدہ کی خصوصیت تھا۔ اس

ماحول میں حکمران خودکو عام انسانوں سے بلند تر ہستی سمجھنے لگا۔

۲۔ بیت المال اب رعایا کی امانت نہیں رہا بلکہ بادشاہ کا ذاتی خزانہ بن گیا۔ بادشاہ اپنی مرضی سے جس طرح چاہے بیت المال کی رقم لٹا سکتا تھا۔ رعایا بادشاہ کی باجگذار ہوگئی اور کسی کو حکومت سے حساب پوچھنے کا حق نہیں رہا۔ اب ناجائز محاصل کی آمدنی بھی بیت المال میں داخل ہونے لگی۔

۳۔ خلافت راشدہ میں لوگوں کو حکمرانوں سے محاسبہ کرنے کی آزادی تھی بلکہ وہ اس معاملے میں لوگوں کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ لیکن اب اظہار رائے کی یہ آزادی ختم ہوگئی۔ حق گوئی کی سزا قید اور قتل ہوتی تھی۔

۴۔ خلافت راشدہ کے دَور میں عدالت کے فیصلوں میں بڑے سے بڑا شخص مداخلت نہیں کرسکتا تھا، بلکہ قاضی، خلیفہ تک کو عدالت میں طلب کر لیتا تھا اور خلیفہ کے خلاف فیصلے دے سکتا تھا۔ لیکن بادشاہ تو بڑی چیز ہے، قاضی کو شاہی خاندان کے لوگوں، گورنروں اور ان سے متعلق بااثر لوگوں کے خلاف بھی فیصلے دینا تقریباً ناممکن ہوگیا۔

۵۔ خلافت راشدہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں شوریٰ یا صلاح ومشورے کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ ملوکیت کے دَور میں یہ نظم بھی ختم ہوگیا۔ اگر خلیفہ کبھی صلاح و مشورہ لیتا تھا تو صرف اپنے حامیوں اور اپنے خاندان اور قبیلے والوں سے اور وہ بھی اپنے طے شدہ مقاصد کی تکمیل کے لیے۔ ملت اسلامیہ کا مفاد اس مشورہ کا اصل مقصد نہیں ہوتا تھا۔ شُوریٰ کے اس نظام کے خاتمے سے ایک نقصان یہ ہوا کہ اسلامی دنیا میں جمہوری نظام کے ارتقا کا راستہ رُک گیا۔

۶۔ خلافتِ راشدہ میں قانون کو بالاتری حاصل تھی۔ خلفائے راشدین نہ تو خود کسی حالت میں حدودِ شرع سے باہر قدم رکھتے تھے اور نہ کسی دوسرے کو اس کی اجازت دیتے تھے۔ بنی اُمیہ کے دَور میں اگرچہ شریعت اسلامی کو قانون کی حیثیت حاصل رہی اور اس کی بالاتری سے انکار نہیں کیا گیا لیکن حکمران اور ان کے پروردہ لوگ، جہاں بھی موقع ملتا تھا اور جہاں بھی ان کے مفادات تقاضا کرتے تھے، شرعی حدود سے انحراف کر جاتے تھے۔ سیاسی اور نجی زندگیوں میں خاص طور پر یہ انحراف بہت نمایاں تھا۔ اس طرح دین

اور سیاست عملاً آزاد ہو گئے اور اس نظریے کے لیے راہ ہموار ہو گئی کہ سیاسی امور کا فیصلہ کرنا بادشاہوں کا کام ہے نہ کہ علماء کا۔

۷۔ حکمرانوں کا تعلق چونکہ ایک خاص قبیلے اور ایک خاص نسل یعنی عربوں سے تھا اس لیے وہ امیر المومنین سے زیادہ امیر العرب بن گئے تھے۔ وہ سب سے پہلے اپنے قبیلے اور اس کے بعد اپنی نسل کے لوگوں کے مفاد کا خیال رکھتے تھے کیونکہ ان کی طاقت کا انحصار بنی امیہ اور عربوں پر تھا۔ اس چیز نے عرب اور عجمی کے اس امتیاز کو پھر نمایاں کر دیا جس کی جڑ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع میں کاٹ دی تھی اور خلافت راشدہ کے زمانہ میں جس کو فروغ نہ مل سکا تھا۔ بنی امیہ کے حکمرانوں کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے ایرانی مسلمانوں میں ایرانی قوم پرستی کا قدیم جذبہ ختم نہ ہو سکا۔ ایرانی قوم پرستی کی یہ تحریک تاریخ میں شعوبیت کے نام سے جانی جاتی ہے۔

ملوکیت کا استحکام

یہاں بعض ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی خلافت اتنی جلدی یعنی تیس سال کی مختصر مدت کے بعد ملوکیت میں کیسے تبدیل ہو گئی؟ اس کے دو اسباب ہیں:

اوّل یہ کہ جمہوریت یا کسی سیاسی نظام کے تصور کی کامیابی کا انحصار عوام کے شعور کے علاوہ وقت کے حالات پر بھی ہے۔ مثلاً یہ کہ معاشرہ ارتقا کے کس مرحلہ میں ہے؟ اور اس میں یک جہتی کا احساس کہاں تک ہے؟ عہدِ قدیم میں یک جہتی چھوٹی بستیوں اور علاقوں میں آسانی سے پیدا ہو سکتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ جمہوریت اپنے ابتدائی دَور میں شہروں اور بستیوں میں وجود میں آئی۔ لیکن ایک وسیع و عریض مملکت میں جس کا ایک علاقہ دوسرے علاقے سے قدرتی رکاوٹوں کی وجہ سے کٹا ہوا ہو، فاصلے دنوں اور مہینوں میں طے ہوتے ہوں اور اس مملکت کے عوام مختلف رنگ، نسل اور زبانوں سے تعلق رکھتے ہوں اور وہ بھی انہی اسلحوں سے مسلح ہوں جو فوج کے پاس ہوتے ہیں، تو ایسی صورت میں جمہوری اور نمائندہ حکومت قائم نہیں رہ سکتی۔ اس قسم کے ماحول میں ہر مہم باز جو کچھ لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو بغاوت کر سکتا ہے اور جمہوری اور نمائندہ حکومت کو ختم کر سکتا ہے۔ عہد قدیم میں یونان اور روما میں جمہوری روایات کو شعوری انداز میں

فروغ دینے کی سب سے زیادہ کوشش کی گئی تھی۔ لیکن یونان میں جمہوریت اسی وقت تک قائم رہی جب تک شہری حکومتیں وجود میں رہیں لیکن جب فیلاقوس اور سکندر نے ان شہری حکومتوں کو ختم کر دیا تو یونان سے جمہوریت بھی ختم ہوگئی۔ روما کو بھی ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ جب تک اقتدار شہر روم کے باشندوں کے ہاتھ میں رہا جمہوریت قائم رہی لیکن جیسے جیسے حکومت کو وسعت حاصل ہوتی گئی اس میں آمریت کا انداز پیدا ہوتا گیا اور جب جولیس سیزر نے روما کو ایک عظیم مملکت کی شکل دے دی تو وہ خود بادشاہ بن گیا اور جمہوریت ختم ہوگئی۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جب تک جمہوریت کے فروغ کے لیے سازگار جغرافیائی، سیاسی اور معاشرتی ماحول پیدا نہیں ہوا جمہوریت قائم نہیں ہو سکی۔ یہ ماحول انیسویں صدی میں اس وقت پیدا ہوا جب یورپ میں چھوٹی چھوٹی قومیں وجود میں آ گئیں اور اس طرح ان میں قومی اور لسانی یکجہتی پیدا ہوگئی۔ اب ہر قوم کے اندر داخلی اختلافات کم سے کم ہو چکے تھے، نظام مواصلات (سڑک، تار، اخبار) بہت ترقی کر چکا تھا اور فوجیں ایسے اسلحے سے مسلح ہوگئی تھیں جو عوام کے پاس نہیں تھے۔ اور جن کے ذریعے وہ جوابی انقلاب لانے والوں کو آسانی سے دبا سکتی تھیں۔ جب یہ ماحول پیدا ہو گیا تو یورپ میں عوام کی نمائندہ حکومتیں قائم ہو گئیں۔

مسلمانوں کو بھی اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں ایسی ہی صورت حال کا مقابلہ کرنا پڑا۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں اسلامی مملکت اپنی وسعت میں روما کی اس حکومت سے وسیع تھی جس کو ختم کر کے جولیس سیزر نے بادشاہت قائم کی تھی۔ پھر یہ خلافت روم کی جمہوریت کی طرح تین سو سال کے ارتقا کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ تیس سال کی مختصر مدت میں وجود میں آئی تھی۔ خلافت کی حدود میں جو قومیں آباد تھیں وہ رنگ، نسل، زبان اور مذہب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ خود عرب جو اسلامی خلافت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے اپنی لسانی، نسلی اور مذہبی یک جہتی کے باوجود قبائلی عصبیت کے جذبے سے ابھی تک خود کو پوری طرح آزاد نہیں کر سکے تھے۔ ایسی صورت میں خلافت یا جمہوریت کے ڈھانچہ کو کوئی چیز اگر قائم رکھ سکتی تھی تو وہ مسلمانوں کا اجتماعی شعور تھا۔

خلفائے راشدین کے زمانے میں مسلمانوں کے اجتماعی شعور نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں خلافت کا راستہ اختیار کیا لیکن مملکت کے اجتماعی حالات چونکہ جمہوری نظام کے لیے سازگار

نہیں تھے اس لیے امیر معاویہ کی بغاوت کامیاب ہوگئی اور بادشاہت کا نظام قائم ہوگیا۔ اس طرح ملت کا اجتماعی شعور بحران کا شکار ہوگیا اور اس کو کام کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ لیکن اگر اس کو کام کرنے کا موقع مل بھی جاتا تو بھی اس وقت کے حالات کے تحت جمہوریت دیرپا ثابت نہ ہوتی۔

علماء کا کردار

اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور کو اسلامی خصوصیات کے لحاظ سے تین دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی عہد صحابہ، عہد تابعین اور عہد تبع تابعین یہ تقسیم ایک مشہور حدیث کے مطابق ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ:

"سب سے اچھا دور میرا ہے، پھر وہ دور جو اس کے بعد آئے گا اور پھر وہ جو اُس کے بعد آئے گا"

علماء نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ پہلے دور سے مراد عہد صحابہ ہے یعنی ان لوگوں کا دور جن کی تربیت خود رسول پاک نے کی۔ دوسرے دور سے مراد عہد تابعین ہے یعنی ان لوگوں کا دور جنھوں نے صحابہؓ سے تربیت حاصل کی اور تیسرے دور کا مطلب تبع تابعین کا دور ہے، یعنی ان لوگوں کا دور جنھوں نے تابعین کی صحبت پائی۔ اس وضاحت کے مطابق بنی امیہ کی حکومت کا زمانہ دوسرے دور سے تعلق رکھتا ہے اگرچہ اس کے آغاز اور اختتام کا تعلق پہلے اور تیسرے دور سے بھی ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام کے بنیادی احکامات میں سے ہے اور اس فرض کو اس دور میں جس طبقہ کے لوگوں نے انجام دیا وہ علماء اور تابعین کا طبقہ ہے اس فرض کو ادا کرتے ہوئے اس دور کے علماء نے دراصل قرآن مجید کے اس حکم کی تعمیل کی جس میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان ایک جماعت ایسی موجود ہونی چاہیے جو لوگوں کو خیر کی دعوت دے، نیکی کا حکم دے اور برائیوں سے روکے۔

خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں تعلیم کا جو وسیع نظام قائم کیا گیا تھا اس کے نتیجے میں اور صحابہ کرام کی ذاتی جدوجہد کی وجہ سے اسلامی دنیا میں قرآن اور سنت سے واقف علماء ہزاروں کی تعداد میں تیار ہوچکے تھے۔ یہ وہ جماعت تھی جس نے قرآن وسنت کی تعبیر اور اسلامی نظریات کی خوف، لالچ اور ذاتی مفاد سے بے نیاز ہوکر بے لاگ انداز میں وضاحت کی۔ یہ وہ گروہ تھا جس

نے بادشاہت کے نظام کو اسلامی ریاست کی بنیاد کے طور پر کبھی تسلیم نہیں کیا اور جب یہ نظام تلوار کے زور سے تھوپ دیا گیا تو اس کو صرف اس لیے قبول کر لیا کہ مسلمان باہمی خونریزی سے محفوظ رہیں۔ ان علماء کی وجہ سے ملوکیت کی وجہ سے پیدا ہونے والی بہت سی خرابیوں اور بہت سے نقصانات کی تلافی ہوگئی۔ انہوں نے حکمرانوں کی غلط باتوں کو اسلام کا جز نہیں بننے دیا، اور ظلم اور استبداد کے مقابلے میں عام لوگوں کی طرف داری کی۔ ان کو جب بھی موقع ملتا تھا وہ حق بات کہنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔

علماء کا یہ طبقہ اگرچہ حکمرانوں کی روش کو پسند نہیں کرتا تھا اور ان میں محتاط افراد سرکاری عہدوں کو قبول نہیں کرتے تھے لیکن چونکہ مملکت کا باشعور اور دانش ور طبقہ اسی گروہ پر مشتمل تھا اس لیے حکومت ان کا تعاون حاصل کرنے پر مجبور تھی۔ چنانچہ عدالت اور تعلیم کے شعبے علماء ہی کے ہاتھ میں تھے۔ اس دور کے قاضیوں نے استبدادی نظام کے باوجود ممکن حد تک عدالت کو آزاد رکھنے کی کوشش کی اور ان کے بے لاگ فیصلے عوام کو انصاف فراہم کرتے رہے۔ اس زمانہ کے قاضیوں میں سب سے نمایاں ذات قاضی شُریح کی ہے جو حضرت عمرؓ کے زمانے سے عبدالملک کی خلافت کے آغاز تک ساٹھ سال کوفہ کے قاضی رہے۔ انہوں نے عدالتی نظام میں مفید اصلاحات کیں۔ خفیہ تحقیقات کا طریقہ رائج کیا، نئے نئے اصول عدالت وضع کیے۔ ان کے فیصلے سننے کے لیے بڑے بڑے علماء عدالت میں آتے تھے۔

علماء نے حکمرانوں کے غلط فیصلوں کے آگے کبھی سر نہیں جھکایا اور حق کی آواز بلند رکھنے کے لیے اپنی جان کی بھی پروانہ کی۔ چنانچہ جب عبدالملک نے اپنی زندگی میں اپنے دو بیٹوں کو یکے بعد دیگرے جانشین بنانا چاہا تو مشہور تابعی سعید بن مسیب نے مخالفت کی اور قید و بند کی تکلیفیں اٹھائیں اور کوڑے کھائے۔ حجاج نے جب بصرہ اور کوفہ کے نومسلموں پر جزیہ لگایا تو علماء نے شدید مخالفت کی اور جب عبدالرحمن ابن اشعث نے حجاج کے مظالم کے خلاف بغاوت کی اور امر بالمعروف کا علم بلند کیا تو علماء کی بڑی تعداد نے جن میں سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی اور شعبی جیسے بزرگ شامل تھے، عبدالرحمن کا ساتھ دیا۔ اس حق پسندی کی وجہ سے سعید بن جبیر کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ اس بغاوت کے سلسلے میں قابل غور بات یہ ہے کہ امام شعبیؒ جیسے ان علماء نے بھی جو حکومت سے تعاون کرتے تھے باغیوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس طرح جب ہشام کے زمانہ میں

حضرت زید بن علی نے استبدادی نظام کا تختہ پلٹنا چاہا تو امام ابو حنیفہؒ نے ان کی تائید کی۔

بنی اُمیہ کی حکومت سے متعلق علماء کے طرزِ عمل کا اس دور کے دو مشہور اہل علم کے اقوال سے ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ مدینہ کے عالم سعیدؒ بن مسیب کہا کرتے تھے:

"بنی مروان انسانوں کو بھوکا رکھتے ہیں اور کتوں کا پیٹ بھرتے ہیں"

اور بصرہ کے مشہور عالم امام حسن بصریؒ کہا کرتے تھے کہ:

"اس زمانہ کے امراء کی تلواریں، ہماری زبانوں سے آگے بڑھ گئی ہیں جب ہم گفتگو کرتے ہیں تو وہ ہمیں تلوار سے جواب دیتے ہیں۔"

اس دور کے حکمران اگرچہ عوام کا دل نہیں جیت سکے۔ لیکن علماء نے اپنی حق گوئی کی بدولت عوام کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ عوام کے ہمدرد، دین کے محافظ اور اخلاق و انصاف کے علمبردار کی حیثیت سے ان کا وقار بہت بلند ہو گیا۔ مسلم معاشرہ میں علماء کو جو بلند مقام حاصل ہے وہ ان ہی روایات کا نتیجہ ہے۔ ایک مشہور مورخ نے لکھا ہے:

"امویوں کے استبداد کے باوجود علماء کی حق گوئی اور حق پرستی کی جتنی مثالیں اس زمانہ میں ملتی ہیں اتنی بعد کے کسی زمانہ میں نہیں ملتیں۔"[1]

بہر حال ان تمام تفصیلات سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہوگا کہ اموی حکمرانوں میں صرف خرابیاں ہی خرابیاں تھیں یا وہ دُنیا کے دوسرے حکمرانوں کے مقابلے میں کمتر یا برے حکمران تھے۔ وہ ذاتی طور پر ٹھیک ویسے ہی تھے جیسے دنیا کے دوسرے بادشاہ ہوتے ہیں۔ ان کے زمانہ میں اگر ہمیں خرابیاں نظر آتی ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ذاتی طور پر اچھے مسلمان نہیں تھے یا دین پر ان کا اعتقاد پختہ نہیں تھا جیسا کہ بعض مورخوں نے لکھا ہے۔ ان کی بدقسمتی یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے فوراً بعد بساط سیاست پر ان کا ظہور ہوا جس کی وجہ سے ان کے کارنامے گہنا گئے۔ ان کے عہد کی خرابیاں دراصل ملوکیت کے استبدادی نظام کی خرابیاں تھیں۔ ورنہ انہوں نے اس سے زیادہ کوئی بُرا کام نہیں کیا جو ہر بادشاہ کرتا رہتا ہے۔ شخصی طور پر بیشتر اموی حکمران اچھے کردار کے مالک تھے اور اسلامی احکام پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ شراب نوشی اور عیش پسندی ان

---

(1) تاریخ اسلام حصہ دوم از شاہ معین الدین احمد مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ص ۳۶۳۔

میں ابھی اتنی عام نہیں ہوئی تھی جتنی بعد کے حکمرانوں میں ہوگئی تھی۔ اموی حکمران عام طور پر اس وجہ سے زیادہ بدنام ہوئے کہ ان کے دور کی تاریخیں عباسی حکمرانوں کے دور میں لکھی گئیں جو اموی خاندان کے شدید مخالف تھے۔ اس کے علاوہ بہت سی ایسی غلط روائتیں بھی تاریخ میں جگہ پا گئیں جن کے راوی شیعان علی رضی اللہ عنہ تھے جو بنی اُمیہ کے سیاسی حریف تھے۔

انتظامِ مملکت

اموی دور میں اسلامی خلافت نے رقبہ کے لحاظ سے انتہائی وسعت اختیار کر لی تھی۔ اتنی وسیع سلطنت اب تک دنیا میں کسی قوم نے قائم نہیں کی تھی۔ ایرانیوں اور رومیوں کی سلطنتیں اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی اتنی وسیع نہیں تھیں۔ اموی مملکت بھی خلافت راشدہ کی طرح مختلف صوبوں میں تقسیم تھی جن کا حاکم یا گورنر والی یا عامل کہلاتا تھا۔ مشرق میں کوفہ کے والی کو اور مغرب میں مصر کے والی کو اس لحاظ سے خاص اہمیت حاصل تھی کہ ان کی حیثیت گورنر کی نہیں بلکہ گورنر جنرل کی تھی۔ مشرق کے سارے علاقے جو ایران، افغانستان، ترکستان اور سندھ پر مشتمل تھے بالعموم کوفہ کے والی کے تحت ہوتے تھے اور وہی ان علاقوں کے لیے گورنر مقرر کرتا تھا۔ چنانچہ سندھ اور ترکستان کوفہ کے والی حجاج بن یوسف ہی کی کوششوں سے فتح کیے گئے۔ اسی طرح مغرب میں سارا شمالی افریقہ اور بعض صورتوں میں اندلس بھی یا تو مصر کے والی کے تحت ہوتے تھے یا شمالی مغربی افریقہ کے والی کے تحت جس کا مرکز قیروان تھا۔ موسیٰ بن نصیر جن کی کوششوں سے اندلس اسلامی مملکت کا ایک حصہ بنا شمالی مغربی افریقہ کے والی تھے۔

اموی دور میں بڑھتی ہوئی ضروریات کے تحت کئی نئے عہدے بھی قائم کیے گئے۔ چنانچہ مرکزی حکومت کے حسب ذیل چار عہدے بنیادی اہمیت رکھتے تھے۔

۱۔ **کتابت:** اس کا سربراہ کاتب کہلاتا تھا۔ خلیفہ کی ڈاک کھولنا، اس کی طرف سے فرمان جاری کرنا اور مہریں لگانا کاتب کا کام ہوتا تھا۔ کاتب موجودہ دور کا چیف سیکرٹری تھا۔

۲۔ **حاجب:** یہ بالکل نیا عہدہ تھا اور امیر معاویہؓ کے زمانے میں قائم کیا گیا۔ کاتب، بادشاہ اور حکام کے درمیان تحریری واسطہ تھا اور حاجب شخصی واسطہ تھا۔ حاجب کی مرضی کے بغیر کوئی شخص خلیفہ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

۳۔ **قاضی:** یہ شعبہ قضا یعنی عدالت کا سربراہ ہوتا تھا۔

۴۔ **صاحب البرید:** یعنی پوسٹ ماسٹر جنرل۔ یہ ڈاک کے محکمے کا سربراہ ہوتا تھا۔ یہ بھی ایک نیا محکمہ تھا جو امیر معاویہؓ نے قائم کیا تھا۔ اُن کے بعد اموی خلفا نے اس کو اور زیادہ وسعت دی۔

ان کے علاوہ دوسرے شعبے تقریباً وہی تھے جو خلافتِ راشدہ میں تھے۔ حاجب کے علاوہ دوسرے تمام عہدے صوبوں میں اور اضلاع میں بھی موجود تھے، اور گورنر کے تحت ہوتے تھے۔

دفاعی نظام

مسلمانوں کی فوجی برتری خلافت راشدہ کی طرح بنی امیہ کے دور میں بھی قائم رہی۔ چین کے علاوہ دنیا کا کوئی ملک خلافت اسلامیہ کے برابر بڑی فوج میدان جنگ میں نہیں لا سکتا تھا۔ سندھ میں اگرچہ ایک ہی معرکہ میں زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار اور اُندلس میں تیس ہزار فوج سے زیادہ میدان جنگ میں لانے کی ضرورت پیش نہیں آئی لیکن ترکستان، ایشیائے کوچک اور شمالی افریقہ کی جنگوں میں اس سے زیادہ فوجوں نے حصہ لیا۔ اس دور میں مسلمان آسانی سے دو لاکھ بلکہ اس سے زیادہ فوج بیک وقت میدان جنگ میں لا سکتے تھے۔ فوج خلافتِ راشدہ کے مقابلے میں زیادہ بہتر اسلحہ سے آراستہ تھی اور فوجی تنظیم بھی بہتر تھی۔ مسلمانوں کے پاس اب وقت کے لحاظ سے جدید ترین اسلحہ کی کوئی کمی نہیں تھی۔

بحری قوت میں بھی اس دور میں بہت اضافہ ہوا۔ شام، مصر اور تونس میں جہاز سازی کے کارخانے قائم ہوئے جو دارالصناعہ کہلاتے تھے۔ اس دور میں بحیرہ روم میں مسلمان سب سے بڑی بحری قوت بن چکے تھے۔ قبرص، رھوڈس اور بلیالک کے جزیرے فتح کیے گئے اور صقلیہ، سردانیہ اور یونان کے مختلف حصوں پر مسلسل بحری حملے کی گئے۔ سلیمان کے زمانہ میں قسطنطنیہ پر مسلمانوں نے جو حملہ کیا تھا اس میں ایک ہزار آٹھ سو جہاز استعمال کیے گئے تھے۔ اس سے پہلے دنیا کی تاریخ میں شاید ہی کسی بحری مہم میں اتنی کثیر تعداد میں جہازوں نے حصہ لیا ہو۔

تمدنی ترقی

بنی امیہ کا دور معاشی خوش حالی کا زمانہ تھا۔ مشرق قریب کے وہ تمام علاقے جو اسلامی

فتوحات سے پہلے ایرانیوں اور رومیوں کی مسلسل جنگوں کی وجہ سے اجڑ گئے تھے ایک بار پھر آباد ہو گئے۔ صد سالہ امن اور حکومت کی تعمیری حکمت عملیوں کے نتیجے میں زراعت اور صنعت وحرفت کو فروغ ہوا۔ کوفہ، [1] بصرہ اور فسطاط کے شہر جن کی بنیاد خلافت راشدہ میں پڑی تھی اب مملکت کے سب سے بڑے شہر بن چکے تھے۔ دمشق، اسکندریہ، اصفہان، رے اور نیشاپور کے شہروں کی نہ صرف قدیم عظمت بحال ہو چکی تھی بلکہ وہ پہلے سے زیادہ وسیع ہو گئے تھے۔ شمالی افریقہ میں قیروان کی بنیاد پڑی جو دوسری صدی کے آغاز تک اس خطہ میں تجارت وصنعت، علم وادب اور اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ فلسطین میں رملہ، ایران میں شیراز اور سندھ میں منصورہ اور محفوظہ کے نئے شہر آباد ہوئے۔

دارالخلافہ دمشق ایک وسیع وعریض نخلستان میں واقع تھا۔ چشموں اور باغوں کی کثرت کی وجہ سے یہ شہر اور اس کا نواح اس زمانے میں اسلامی دنیا کے چار خوبصورت ترین علاقوں میں شمار ہوتا تھا۔ اموی دَور میں محلوں اور شاندار عمارتوں کی کثرت نے شہر کی رونق دوبالا کر دی تھی۔ یہاں کا نظام آب رسانی اپنی مثال آپ تھا۔ چشموں کا پانی کھلی اور بند نالیوں کے ذریعہ ہر گھر میں پہنچایا گیا تھا اور ہر بڑے گھر کے صحن میں فوارے لگے ہوئے تھے۔

تمدنی ترقی کا اظہار زندگی کے ہر شعبہ میں ہوا۔ اور اگر عمارتیں ایک ملک کی خوشحالی اور دولت مندی کا ثبوت ہوتی ہیں تو پھر اموی دَور میں تعمیر ہونے والی عمارتیں اس دَور کی خوشحالی کی عکاسی کرتی ہیں۔ اب عہد خلافت راشدہ کی سادہ عمارتوں کی جگہ پختہ اور عالیشان عمارتوں نے لے لی۔ اس زمانہ کی یادگار عمارتیں یا تو مساجد کی شکل میں وجود میں آئیں جو عبادت گاہوں کے ساتھ تعلیمی مقصد کے لیے بھی استعمال ہوتی تھیں یا شاہی محلات کی شکل میں۔ ان عمارتوں کی تعمیر میں پہلی مرتبہ رومی، شامی، ایرانی اور ہندوستانی معماروں نے مل کر کام کیا اور اس طرح ایک نئے فن تعمیر کی بنیاد پڑی۔ اموی دَور کی ابتدائی عمارتیں امیر معاویہ کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔

اموی حکومت کا مرکز دمشق تھا جو نہ صرف دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے تھا بلکہ ایک

---

(1) اموی دَور میں کوفہ میں اسی ہزار سے زیادہ گھر تھے۔ دوسرے الفاظ میں کوفہ کی آبادی چار لاکھ سے زیادہ تھی جو اس زمانہ کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی۔ بصرہ بھی کوفہ کے برابر تھا۔ سولہ مربع میل میں پھیلا ہوا تھا اور چاروں طرف نہروں کا جال تھا۔ اپنی سرسبزی اور شادابی کے لحاظ سے بصرہ کا علاقہ اسلامی دُنیا کے چار حسین ترین علاقوں میں شمار ہوتا تھا۔

ایسے علاقہ (شام) میں واقع تھا جو اس زمانے میں تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔ عرب ابھی تمدنی لحاظ سے پست تھے جس کی وجہ سے امیر معاویہؓ کو یہ احساس پریشان رکھتا تھا کہ رومی اور شامی باشندے مسلمانوں کو غیر مہذب اور اپنے سے کمتر نہ سمجھیں۔ چنانچہ انہوں نے اس احساس کمتری کے خاتمہ کے لیے وہ تمدن اختیار کرنا چاہا جو اس دور کا ترقی یافتہ تمدن سمجھا جاتا تھا۔ امیر معاویہ کے ان احساسات کا اظہار خلافت راشدہ کے زمانے ہی سے ہونا شروع ہو گیا تھا جس کا تذکرہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورۂ شام کے سلسلے میں پچھلے ایک باب میں کیا جا چکا ہے۔

امیر معاویہ نے رومی تمدن کے جن پہلوؤں کو اپنایا ان میں ایک فن تعمیر بھی ہے۔ ان کے دَور میں پختہ عمارتیں اور عالی شان محل تعمیر ہونا شروع ہوئے۔ وہ اپنی نوتعمیر عمارتوں کے بارے میں لوگوں کی رائے بھی معلوم کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور رومی سفیر سے انہوں نے اس موضوع پر جو گفتگو کی اس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ رومی سفیر کے جواب کے بعد امیر معاویہؓ نے مٹی کی جگہ پتھروں کا استعمال شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ سنگِ مرمر اور موزیک کا استعمال بھی شروع ہو گیا جس کو اس زمانے میں فیسفساء کہا جاتا تھا۔ محلات کے علاوہ امیر معاویہؓ کے زمانے میں بصرہ، کوفہ اور فسطاط (مصر) میں پختہ اور شاندار مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ بصرہ کی جامع مسجد اور دارالامارۃ وہاں کے گورنر زیاد نے تعمیر کرائے تھے۔ بصرہ کی اس مسجد کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ پتھر کے ستون استعمال کیے گئے اور ایک مینار بھی تھا جو غالباً اسلامی دنیا کا پہلا مینار تھا۔ کوفہ کی جامع مسجد بھی زیاد نے ایک ایرانی معمار سے بنوائی تھی۔ اس میں ساٹھ ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے تھے۔ مصر میں جامع عمرو بن عاص کو امیر معاویہ کے زمانے میں توسیع دی گئی اور اس میں چار میناروں کا اضافہ کیا گیا۔

اموی دَور کے فن تعمیر کا پہلا شاہکار قبۃ الصخرہ ہے جو عبدالملک کے زمانہ میں بیت المقدس میں تعمیر کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے فن تعمیر کا یہ سب سے اچھا اور اولین نمونہ ہے جو آج بھی موجود ہے۔

ولید کا دَور فنِ تعمیر کا دورِ زریں تھا۔ اس زمانے میں سب سے زیادہ اور سب سے اچھی عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ ولید کے زمانے میں عمارت سازی کا ذوق اتنا عام ہو گیا تھا کہ جب لوگ آپس میں ملتے تھے تو ان کی گفتگو کا سب سے بڑا موضوع مکانات کی تعمیر ہوتا تھا۔ اس زمانے میں دمشق میں شاہی خاندان کے افراد، امراء اور دولت مند لوگوں نے کثرت سے شاندار عمارتیں تعمیر

گئیں۔ اس دور کی سب سے شاندار عمارتیں دمشق کی جامع اموی اور مدینہ کی مسجد نبوی ہیں جن کا تذکرہ ولید کے دور میں کیا جا چکا ہے۔ جامع اموی میں سنگ مرمر کثرت سے استعمال کیا گیا تھا اور درو دیوار میں لاجوردی کام کیا گیا تھا۔ مسجد میں روشنی کے لیے چھ سو قندیلیں سونے کی زنجیروں سے آویزاں تھیں۔ حضرت عمر عبدالعزیز نے اپنے زمانے میں سونے چاندی کے اس استعمال کو فضول خرچی خیال کرکے تمام قیمتی سامان نکلوا کر بیت المال میں داخل کرانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں روم کے سفیر دمشق آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے جامع مسجد کو دیکھ کر کہا کہ:

''ہم لوگ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کا عروج چندروزہ ہے لیکن اس عمارت کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ مسلمان ایک زندہ رہنے والی قوم ہے''

رومی سفیروں کی یہ رائے سننے کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنا ارادہ ترک کردیا۔

معاشرتی زندگی

اسلحہ سازی، جہاز سازی، پارچہ بافی اور ظروف سازی اس زمانے کی خاص صنعتیں تھیں۔ ہشام کے دور میں ریشمی کپڑے کی صنعت نے خاص طور پر ترقی کی تھی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ جس طرح ولید کے دور میں لوگوں کی گفتگو کا موضوع عمارتیں اور عمر بن عبدالعزیز کے دور میں دینی باتیں ہوتیں تھیں اسی طرح ہشام کے دور میں گفتگو کا موضوع لباس اور کپڑے ہوتے تھے۔ معاشرے کی خوشحالی کی وجہ سے خوش لباسی عام ہوگئی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، جن کا تعلق ابتدائی دور سے ہے، کہتی تھیں کہ ان کے پاس ایک قیمتی اوڑھنی تھی جب مدینہ میں کسی لڑکی کی شادی ہوتی تھی تو عورتیں اس کو اوڑھانے کے لیے یہ اوڑھنی لے جاتی تھیں لیکن اب میری لونڈی بھی اس کو اوڑھنا پسند نہیں کرے گی۔ اموی دور کے آخر میں خوش لباسی معاشرہ کا لازمی جزو بن گئی تھی۔ اس دور کے علماء تک جن کی زندگی میں زہد اور سادگی کا غلبہ ہوتا تھا۔ خوش لباس ہوتے تھے۔ امام زین العابدینؒ، امام جعفر صادقؒ، امام حسن بصریؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ سب خوش لباسی میں مشہور تھے۔ امام مالکؒ سے جب کسی نے سوال کیا کہ آپ عالم ہو کر اتنا قیمتی لباس کیوں پہنتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے زمانے میں علماء کا یہی انداز ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات میں اس واقعہ کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ جب مدائن کی فتح کے

بعد ایران کا خزانہ اور شاہی سامان مدینہ پہنچا تو حضرت عمرؓ اس کو دیکھ کر رو پڑے تھے کیونکہ اس میں ان کو مسلمانوں کے زوال کی نشانیاں نظر آتی تھیں۔ اموی دور میں یہ نشانیاں اور واضح ہو گئیں۔ اسلامی خلافت کی حدود میں آباد لوگوں کی اکثریت مسلمان ہو چکی تھیں لیکن اس کی تربیت اسلامی اصولوں کے مطابق پوری طرح نہ ہو سکی تھی۔ تربیت کا یہ فرض صرف علماء تک محدود رہ گیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور کو چھوڑ کر حکومت نے اس معاملے میں کبھی اُس جذبہ کے تحت کام نہیں کیا۔ جو خلفائے راشدین کی خصوصیت تھا۔ حکمران طبقہ اپنے ذاتی اغراض و مفاد کو اسلام کے اعلیٰ مقاصد پر ترجیح دینے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نو مسلم باشندے بہت سے قدیم لیکن غیر اسلامی عقائد، نظریات، توہمات اور آدابِ زندگی بھی اپنے ساتھ لے آئے جو مسلم معاشرہ کا جزو بن گئے۔ چنانچہ اس دور کی معاشرت اور ثقافت میں ہمیں کئی ایسی نئی باتیں نظر آتی ہیں جو اسلامی روح کے خلاف ہیں اور جو محض دولت کی فراوانی، استبدادی نظام حکومت اور نظریاتی تربیت کی کمی کی وجہ سے مسلم معاشرے میں داخل ہو گئیں اور اس طرح اس زوال کی راہ ہموار کر دی جس کی نشاندہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کی تھی۔

رومی اور ایرانی اثرات کے تحت درباروں میں خواجہ سراؤں کا شرمناک رواج شروع ہوا۔ بڑے بڑے حرم وجود میں آئے جو کنیزوں اور لونڈیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس دور میں شراب نوشی، موسیقی اور رقص کو پہلی دفعہ ثقافتی مرتبہ ملا۔ محلوں کی آرائش میں تصویر کشی سے بھی کام لیا گیا۔ اگرچہ یہ باتیں محدود پیمانے پر تھیں اور عام مسلم معاشرہ ان سے پاک رہا لیکن ان کی وجہ سے ثقافت اور فنون لطیفہ کی اسلامی خطوط پر نشو و نما پانے میں سخت رکاوٹ پڑی۔ زنانِ بازاری بہر حال ابھی تک مسلم معاشرہ میں داخل نہیں ہوئی تھیں اور ایک مسلمان عورت کے طوائف ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اسلامی مملکت میں قحبہ خانے معدوم تھے حالانکہ یہ لعنت غیر اسلامی دنیا میں ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی عام تھی۔

موسیقی کی سرپرستی دربار سے شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ اس نے ان امراء کے گھروں میں جگہ پالی جو مذہبی رجحان نہیں رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلم معاشرہ میں موسیقی کو جس شخص نے رواج دیا وہ ایک مخنث "طاؤس" نامی تھا۔ اب دربار گویوں کا مرکز بن گیا۔ گانے والے اور گانے والیاں عام طور پر ایرانی یا غیر عرب ہوتی تھیں۔ آلاتِ موسیقی بھی زیادہ تر غیر عرب قوموں سے لیے گئے۔

رقص و موسیقی کا مقصد محض تفریح، جذباتی تسکین اور عیش پسندی تھا اس لیے ان چیزوں نے آہستہ آہستہ مسلم معاشرے میں جنسی بداخلاقی اور عیاشی کے لیے راہ ہموار کی۔ حسن بصریؒ کہا کرتے تھے کہ:

"بصرہ کی رونق منافقوں کے دم سے ہے، یہ منافق نہ رہیں تو شہر میں لوگوں کا جی لگنا مشکل ہو جائے۔"(۱)

یہ کہتے وقت غالباً ان کے پیش نظر یہی نئی ثقافت تھی جو مسلم معاشرہ میں جگہ پکڑ رہی تھی۔

اسلامی تاریخ میں مسلمانوں کا زوال ملوکیت اور غیر اسلامی ثقافت کے راستے شروع ہوا۔

مسلمان خواتین اسلامی احکام کے مطابق پردہ کرتی تھیں لیکن یہ پردہ ابھی اتنا سخت نہیں ہوا تھا جتنا بعد کے زمانے میں برصغیر پاکستان و ہند میں ہو گیا۔ خواتین ضروری کاموں اور تفریح کے لیے باہر نکلتی تھیں اور علمی و ادبی مجلسوں میں شرکت کرتی تھیں۔ لیکن یہ اجتماعات مخلوط نہیں ہوتے تھے بلکہ خواتین بالعموم پردے کے پیچھے بیٹھتی تھیں۔ جسٹس امیر علی نے اپنی تاریخ اسلام میں اور بعض دوسرے مورخوں نے علمی و ادبی اجتماعات میں مردوں اور عورتوں کی اس شرکت سے یہ غلط نتیجہ نکال لیا ہے کہ اموی دور میں خواتین پردہ نہیں کرتی تھیں اور مخلوط سوسائٹیوں میں شرکت کرتی تھیں اور یہ کہ عورتوں کے علیحدہ اجتماعات کا رواج ولید دوم کے زمانے میں حکمران کی غیر اخلاقی حرکتوں کی وجہ سے ہوا۔ مولانا شبلی نعمانی نے امیر علی کی اس غلط بیانی کی تردید کی ہے۔(۲)

اموی دور کی ممتاز خواتین میں امیر المومنین حضرت عائشہؓ صدیقہ اور مشہور خدا رسیدہ خاتون رابعہ بصریؒ کے نام قابل ذکر ہیں۔ حضرت عائشہؓ کا تذکرہ پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اس دور کی ایک اور ممتاز خاتون سکینہ بنت حسینؓ تھیں جو اپنے حسن و جمال کے علاوہ ادب، شعر اور موسیقی کی محفلوں کی رونق تھیں۔(۳)

---

(۱) دعوت و عزیمت از مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ حصہ اول صفحہ ۱۵۰ (مطبوعہ ۱۹۵۵ء اعظم گڑھ)

(۲) مقالات شبلی

(۳) اس دور کی خواتین کے حالات کے لیے دیکھیے تاریخ و تمدن اسلامی حصہ دوم از رشید اختر ندوی۔

علم وادب

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں علمی وادبی سرگرمیاں عباسی دور سے شروع ہوئیں، لیکن صحیح یہ ہے کہ مسلمانوں میں علمی وادبی سرگرمیوں کا آغاز اموی دور ہی میں شروع ہو گیا تھا اور عباسی دور میں یہ سرگرمیاں عروج پر پہنچ گئیں۔ اسی طرح مسلمانوں میں علمی وادبی سرگرمیوں کا اصل محرک اسلام تھا، یونانی علوم ان سرگرمیوں کا باعث نہیں تھے جیسا کہ بعض مغربی مؤرخین نے لکھا ہے۔

حصول علم پر اسلامی تعلیمات میں بہت زور دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ:

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھیں علم دیا گیا اللہ ان کے درجے بلند کرے گا۔''

(سورہ مجادلہ)

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم بھی علم کی فضیلت اور اہمیت پر بار بار زور دیتے تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں ذیل کی احادیث بڑی اہمیت رکھتی ہیں:

۱۔ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

۲۔ علم خزانے ہیں اور ان کی کنجی سوال ہے۔

۳۔ عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسے کہ مجھے تم میں سے سب سے معمولی آدمی پر فضیلت حاصل ہے۔ (ترمذی)

۴۔ جس شخص نے ایک راستہ علم کی طلب میں طے کیا وہ جنت کے راستوں میں سے ایک راستہ پر چلا۔ (بخاری)

قرآن مجید اور احادیث میں حصول علم کی تاکید کے علاوہ خود اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے بھی مختلف علوم کا حاصل کرنا ضروری تھا۔ مثلاً صرف ونحو اور علم لغت کی بنیاد اس لیے پڑی کہ اس کے بغیر قرآن کے معنی اور ان کی باریکیوں کو نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے قرآن پڑھانے والوں کے لیے عالم لغت ہونا ضروری قرار دیا تھا۔ اس بات نے عربی زبان کی تحقیقات کے لیے راہ ہموار کی۔ ان ہی اسباب کی وجہ سے حضرت علیؓ اور ان کے شاگرد ابوالاسود دوئلی نے علم نحو کے ابتدائی اصول وضع کیے۔ علم تفسیر کی بنیاد اس لیے پڑی کہ قرآن مجید میں علم وحکمت کے

جو موتی ہیں ان کی وضاحت کی جائے۔ احادیث اس لیے مرتب کی گئیں کہ قرآن کی تعلیمات، رسولؐ کے احکام اور ان کی زندگی کو کما حقہ سمجھا جائے۔ علم فقہ کی بنیاد اس لیے پڑی کہ اسلامی قانون کو منظم اور مرتب شکل میں پیش کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو محفوظ کرنے اور آپؐ کے صحابہؓ کے حالات کو ضبط تحریر میں لانے کے شوق نے فنِ تاریخ نویسی، سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی۔ زکوٰۃ، میراث اور جزیہ اور خراج کے مسائل طے کرنے کے لیے علم ریاضی سے واقفیت حاصل کرنا ضروری تھا۔ محدثین نے احادیث کی تلاش اور حصول علم کے لیے دُور دراز کے سفر کیے۔ حج کی ادائیگی کے لیے اسلامی دُنیا کے گوشے گوشے سے لوگوں کے قافلے مکہ کا رُخ کرنے لگے۔ اور اس بات نے سیر و سیاحت کا شوق پیدا کیا اور اس طرح علم جغرافیہ کی بنیاد پڑی۔ طلب علم ایک عملی ضرورت تھی اور اس کی طرف اس عملی ضرورت کے علاوہ اس وجہ سے بھی توجہ کی گئی کہ رسول پاکؐ نے اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

مختصر یہ کہ مسلمانوں میں علمی تحریک خود اسلام کی وجہ سے شروع ہوئی۔ اس کے فروغ میں نہ حکمرانوں کا ہاتھ تھا نہ غیر مسلم قوموں کے نظریات کا۔ مسلمانوں نے غیر مسلم ذرائع سے فائدہ ضرور اٹھایا لیکن وہ منبع فیضان نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اموی دَور میں علم وادب کی ترقی حکومت کی سرپرستی پر مبنی نہیں تھی۔ یہ ایک آزاد علمی تحریک تھی اور اس کے اصل رُوح رواں اہل علم صحابہؓ اور تابعین تھے جن کی اکثریت حکومت کے اثر سے آزاد تھی۔ تعلیمی سرگرمیوں کی وسعت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ حدیث کا علم جن صحابہؓ سے حاصل کیا گیا ان کی تعداد دس ہزار تھی۔ پھر ہر صحابیؓ نے بے شمار شاگرد چھوڑے۔ مثال کے طور پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کی تعداد آٹھ سو کے لگ بھگ تھی۔ سوانح عمریوں کی مشہور کتاب طبقات ابن سعد میں چند مرکزی شہروں کے جن تابعین کے حالات ملتے ہیں ان کی تعداد ایک ہزار ایک سو بانوے ہے۔ ان میں سے ۴۸۴ مدینہ سے، ۱۳۱ مکہ سے، ۴۱۳ کوفہ سے اور ۱۶۴ بصرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور یہ سب علمی حیثیت سے اتنے بلند تھے کہ ان کے حالات لکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

اموی دَور کو علمی لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ایک ابتدائی دَور جس میں صحابہؓ معلم کے فرائض انجام دیتے تھے۔ عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ اور

حضرت انس بن مالکؓ اس دور کے مشہور اہل علم تھے۔ احادیث کی بیشتر روایات ان ہی بزرگوں کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں۔

دوسرا دور وہ ہے جس میں تابعین نے معلموں کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ یہ فہرست بہت طویل ہے، ہم یہاں صرف چند ممتاز ترین تابعین کا تذکرہ کریں گے جن کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ سعیدؒ بن مسیب (۱۴ھ تا ۹۴ھ): محدث اور فقیہہ تھے۔ سید التابعین کہلاتے تھے۔ شعروسخن کا خاص ذوق تھا۔

۲۔ عُروہؒ بن زبیر (۲۳ھ تا ۹۴ھ): مغازی یعنی عہد رسالت کی جنگوں کی تاریخ پر سب سے زیادہ عبور رکھتے تھے۔

۳۔ حسن بصریؒ (۲۰ھ تا ۱۱۰ھ): جامع العلوم تھے۔ ان کے وعظ اعلیٰ ادب کا نمونہ ہیں۔ تصوف ان کا خاص موضوع تھا اور تصوف کے تمام سلسلے آپ کے ذریعے ہی حضرت علیؓ تک پہنچتے ہیں۔

۴۔ مجاہدؒ بن جبیر (۲۱ھ تا ۱۰۲ھ): حدیث اور فقہ کے امام تھے۔ اپنے دور کے ایک بڑے سیاح تھے۔

۵۔ شعبیؒ (۱۹ھ تا ۱۰۴ھ): قرآن، حدیث اور فقہ کے علاوہ مغازی، ریاضی، ادب اور شاعری میں بھی کمال حاصل تھا۔

۶۔ امام زہریؒ (۵۰ھ تا ۱۲۴ھ): اپنے دور کے سب سے بڑے مصنف تھے۔ مدینہ کے ایک ایک گھر میں جا کر مردوں اور عورتوں سے احادیث نبوی اور اقوال صحابہ جمع کیے اور قلم بند کیے۔

۷۔ قتادہؒ (۶۱ھ تا ۱۱۷ھ): تفسیر اور حدیث کے علاوہ لغت، ایام عرب یعنی زمانہ قبل از اسلام کی تاریخ اور انساب کے ماہر تھے۔

۸۔ مکحولؒ (متوفی ۱۱۸ھ): فقہ کی دو اوّلین کتابوں کے مصنف۔ حدیث کی تلاش کے لیے وسیع سفر کیے۔

۹۔ یزیدؒ بن حبیب (۵۳ھ تا ۱۱۸ھ): مصر کے قاضی القضاۃ، علوم شرعی کے علاوہ تاریخ مصر پر سند تھے۔

۱۰۔ حماد الراہُوِیہ: عربوں کی قدیم تاریخ، انساب اور اشعار کے ماہر تھے۔

۱۱۔ عیسیٰ بن عمر نحوی (متوفی ۱۴۷ھ) عربی صرف ونحو کے بانی خلیل اور سیبویہ کے استاد تھے۔

ان کے علاوہ خاندانِ رسالتؐ کے تین بزرگ امام زین العابدینؒ، امام باقرؒ اور امام جعفر صادقؒ بھی اسی دور سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا گھر مدینہ میں ایک بڑے دارالعلم کی حیثیت رکھتا تھا۔

قرآن کی قرأت ایک مستقل فن ہے اور اس کی بنیاد جن سات [1] قاریوں پر ہے وہ بھی اسی دور میں تھے اور قراء سبعہ کہلاتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ اموی دور میں ان زبردست علمی سرگرمیوں کے باوجود تصنیف وتالیف کا زیادہ رواج نہیں ہوا تھا۔ لوگ حافظہ کو تحریر پر ترجیح دیتے تھے اور تحریری چیزوں پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلامی تاریخ میں تصنیف وتالیف کا باقاعدہ آغاز بھی اسی دور میں ہوا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اور طب پر کتابیں لکھی گئیں اور ترجمہ کی گئیں۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر کتابیں اب ناپید ہیں لیکن عباسی دور میں ان علوم پر جو کتابیں لکھی گئیں ان کی بنیاد اموی دور کی ان ہی کتابوں اور تحریروں پر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور مجاہدؒ بن جبیر نے قرآن مجید کی جو تفسیر کی تھی وہ اب کتابی شکل میں دستیاب ہے۔ عروہؒ بن زبیر نے فقہ پر کئی کتابیں لکھیں اور مغازی اور سیرت پر پہلی کتاب لکھی۔ امام زہریؒ کئی کتابوں کے مصنف تھے اور ان کے فتوے تین ضخیم جلدوں میں جمع کیے گئے تھے۔ ہمام بن منبہ (۴۰ھ تا ۱۳۱ھ) نے احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جو صحیفہ ہمام کے نام سے مشہور تھا اور اب شائع ہو

(۱) قراء سبعہ کے نام یہ ہیں:

۱۔ ابوعبدالرحمان نافع متوفی ۱۶۹ھ (مدینہ)۔

۲۔ ابومعبد عبداللہ متوفی ۱۲۰ھ (مکہ)

۳۔ ابوعمرو بن العلا متوفی ۱۵۴ھ (بصرہ)

۴۔ ابوعمران عبداللہ متوفی ۱۱۸ھ (دمشق)

۵۔ ابوبکر عاصم متوفی ۱۲۷ھ (کوفہ)

۶۔ ابوعمارہ حمزہ متوفی ۱۵۷ھ (کوفہ)

۷۔ ابوالحسن علی متوفی ۱۸۹ھ (کوفہ)

تاریخ افکار وعلوم اسلامی، ترجمہ افتخار احمد بلخی۔ صفحہ ۱۸۲ تا ۱۸۷ مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور۔

چکا ہے۔ [1] احادیث کے اور بھی کئی مجموعے مرتب ہوئے تھے۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے حکم پر اسلامی مملکت کے ہر حصے سے احادیث کے مجموعے مرتب کر کے دمشق بھیجے گئے تھے جہاں سے ان کی نقلیں اسلامی دنیا کے مختلف شہروں میں بھیجی گئیں۔ ان میں صرف وہ مجموعے جو امام زہریؒ نے مرتب کیے تھے کئی اونٹوں پر لادے گئے تھے۔ [2]

عیسیٰ بن عمر ثقفی متوفی ۱۴۷ھ نے فنِ نحو پر دو کتابیں لکھی۔ ایک یمنی عالم عبید بن شریہ نے امیر معاویہؓ کے حکم سے کتاب الامثال اور کتاب الملوک لکھی جو عجمی تاریخ پر تھی۔ عوانہ بن حکم کلبی نے کتاب التاریخ اور سیرت معاویہ لکھی۔ وھب بن منبہ متوفی ۱۱۰ھ نے یمن کے سلاطین حمیر کے حالات میں ایک کتاب لکھی۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اسرائیلی طبیب ماسرجویہ سے یونانی مصنف اہرن کی قرابادین کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ ہشام نے ایران کی تاریخ اور ایرانی علوم سے متعلق ایک کتاب کا ترجمہ کرایا۔ ان کے علاوہ قتادہ (متوفی ۱۱۷ھ) اور ابوعمرو بن العلا (متوفی ۱۵۴ھ) لغت کے امام تھے۔ زبان اور لُغت کی تحصیل اور تحقیق کے لیے انہوں نے برسوں تک صحرائے عرب کی خاک چھانی۔ انہوں نے اس طرح جو تحریری ذخیرہ جمع کیا وہ عباسی عہد کی تدوین لغت میں کام آیا۔ اسی طرح محمد بن سائب کلبی انساب کے ماہر تھے اور علم الانساب نے بعد کے زمانے میں جو ترقی کی اس کا بڑا ماخذ ان ہی کی روایات ہیں۔

انشاء اور خطوط نویسی نے اس دور میں ایک فن کی شکل اختیار کر لی۔ اس زمانے میں اس فن کو کتابت کہا جاتا تھا اور کاتب کی حیثیت ادیب اور انشا پرداز کی ہوتی تھی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ کتابت عبدالحمید سے شروع ہوئی اور ابن العمید پر ختم ہوگئی۔ یہ عبدالحمید خلیفہ عبدالملک کے کاتب تھے۔ اور ابن العمید چوتھی صدی ہجری کے ادیب تھے۔ ایک اموی شہزادہ خالد بن یزید نے یونانیوں سے فلسفہ طب اور علم کیمیا کی تعلیم حاصل کی اور خود بھی علم کیمیا پر کتابیں لکھیں۔

یہ علمی ترقی جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اُس جذبہ کا نتیجہ تھی جو اسلام نے مسلمانوں میں حصول علم

---

(۱) سنت کی آئینی حیثیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

(۲) ملاحظہ کیجیے تاریخ افکار و علوم اسلامی حصہ اول صفحہ ۳۸۱۔ ۷۹۔۴ اور سنت کی آئینی حیثیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۳۶۳۔ ۳۹۲۔

کے لیے پیدا کر دیا تھا۔ یہ ایک ایسی علمی تحریک تھی جس کا محرک اسلام تھا اور درباری سرپرستی سے جس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ حکومت نے اس ضمن میں بہت کم حوصلہ افزائی کی۔ شعروشاعری وہ واحد صنف ادب تھی جس کی اس دور میں سرکاری سرپرستی کی گئی۔ عربی زبان کے صفِ اوّل کے تین شاعر اخطل، فرزدق اور جریر اموی دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں اخطل عیسائی تھی۔ اموی حکمرانوں نے شاعری کی سرپرستی شاہانہ مزاج کے مطابق کی جس کی وجہ سے عربی شاعری صحت بخش خطوط پر آگے نہ بڑھ سکی اور اس میں قبل از اسلام کی وہی خرابیاں پھر پیدا ہو گئیں جن کو عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے دور میں ختم کرنے کی کوشش شروع کی گئی تھی۔ اسی طرح شاعروں کے لیے شرابی ہونا ایک فیشن بن گیا۔

اس کے برخلاف علم و ادب کی وہ دنیا جس پر علماء کا اقتدار تھا حکومت کے مقابلے میں اسلامی روح سے زیادہ دور نہ ہو سکا۔ علماء اور ادیبوں میں عرب اور غیر عرب دونوں شامل تھے۔ بلکہ اس دور کے علماء میں ایرانیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان کے درمیان رنگ و نسل کا قطعی کوئی امتیاز نہیں تھا۔ اس جگہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس دور کے غیر عرب علماء کی ایک بڑی تعداد غلاموں پر مشتمل تھی۔ حسن بصریؒ، مجاہدؒ بن جبیرؒ، سعید بن جبیر، محمدؒ بن سیرین اور ابوالزنادؒ یا تو غلام تھے یا غلام کی اولاد۔ غلاموں کو علمی دنیا کی سرداری اور مسلمان عوام کی سرداری اسلام کی بدولت ہی نصیب ہوئی۔

مزید مطالعہ کے لیے کتابیں

۱۔ تاریخ اسلام حصہ دوم از شاہ معین الدین احمد ندوی (دار المصنفین اعظم گڑھ)

۲۔ تاریخ اسلام حصہ دوم از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

۳۔ تہذیب وتمدن اسلامی حصہ دوم از رشید اختر ندوی۔ یہ کتاب اموی دور کے علمی، ادبی اور معاشرتی حالات کے مطالعہ کے لیے مفید ہے۔

۴۔ خلافت وملوکیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

۵۔ تابعین از شاہ معین الدین احمد ندوی (اعظم گڑھ)۔ تابعین کی بیشتر تعداد اموی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ اس دور کی علمی اور اصلاحی کوششوں کے مطالعہ کے لیے تابعین کے حالات کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کتاب میں عمر بن عبدالعزیز، حسن بصری اور امام زہری سمیت ۹۶ ممتاز تابعین کے حالات ہیں۔

۶۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز از عبدالسلام ندوی (اعظم گڑھ)

۷۔ ابتدائی اموی دور کے مطالعہ کے لیے سیر الصحابہ کا حصہ ششم بہت اہم ہے جو حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، امیر معاویہؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہے۔

خلافت بنی اُمیّہ

	۶۶۱ء/۴۱ھ تا ۷۵۰ء/۱۳۲ھ
امیر معاویہ	۶۶۱ء/۴۱ھ تا ۶۸۰ء/۱۳۲ھ
یزید اوّل	۶۸۰ء/۶۰ھ تا ۶۸۳ء/۶۴ھ
مروان اول	۶۸۴ء/۶۴ھ تا ۶۸۵ء/۶۵ھ
عبدالملک بن مروان	۶۸۵ء/۶۵ھ تا ۷۰۵ء/۸۶ھ
ولید اول	۷۰۵ء/۸۶ھ تا ۷۱۵ء/۹۶ھ
سلیمان	۷۱۵ء/۹۶ھ تا ۷۱۷ء/۹۹ھ
عمر بن عبدالعزیز	۷۱۷ء/۹۶ھ تا ۷۲۰ء/۱۰۱ھ
یزید دوم	۷۲۰ء/۱۰۱ھ تا ۱۷۲۴ء/۱۰۵ھ
ہشام	۷۲۴ء/۱۰۵ھ تا ۷۴۳ء/۱۲۵ھ
ولید دوم	۷۴۳ء/۱۲۵ھ تا ۷۴۵ء/۱۲۶ھ
ابراہیم	۷۴۵ء/۱۲۶ھ تا ۷۴۵ء/۱۲۷ھ
مروان دوم	۷۴۵ء/۱۲۷ھ تا ۷۵۰ء/۱۲۷ھ
فتح ماوراء النہر	۷۰۵ء/۸۶ھ تا ۷۱۴ء/۱۳۲ھ
فتح اندلس	۷۱۱ء/۹۲ھ تا ۷۱۴ء/۹۵ھ
حادثہ کربلا	۷۸۶ء/۶۱ھ
قسطنطنیہ پر پہلا حملہ	۶۶۸ء/۸۴ھ
فتح سندھ	۷۱۱ء/۹۲ھ تا ۷۱۴ء/۹۵ھ
قیروان کی بنیاد	۶۷۰ء/۵۰ھ
راور کی جنگ	۱۰۔رمضان مطابق ۲۔جولائی ۷۱۱ء/۹۲ھ
وادی لکہ کی جنگ	۱۹۔جولائی ۷۱۱ء/۹۲ھ

باب ۱۰

بغداد کا عروج (۱)

عبداللہ بن محمد جو ابوالعباس سفاح کے نام سے زیادہ مشہور ہے پہلا عباسی خلیفہ ہے۔ اس کی حکومت کی مدت صرف چار سال ہے۔ یہ سارا زمانہ مخالفوں کو دبانے اور نئی حکومت کو مضبوط بنانے میں گزرا۔ سفاح نے عراق میں شہر انبار کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور ۱۳۴ھ میں اس شہر کے قریب ہاشمیہ کے نام سے نیا شہر تعمیر کیا۔

مؤرخوں نے سفاح کی عقل، تدبر اور اخلاق کی تعریف کی ہے لیکن اس کے ظلم و ستم نے تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ سفاح کے دست راست ابومسلم خراسانی نے بنی اُمیہ کا اقتدار ختم کرنے میں چھ لاکھ انسان ہلاک کیے۔ دمشق فتح کر کے عباسی فوجوں نے وہاں قتل عام کیا۔ حضرت امیر معاویہؓ سمیت تمام اموی حکمرانوں کی قبریں کھود ڈالی گئیں۔ ہشام بن عبدالملک کی لاش قبر میں صحیح سلامت ملی تو اس کو کوڑوں سے پیٹا گیا۔ بنی امیہ کا بچہ بچہ قتل کیا گیا اور اموی سرداروں کی تڑپتی لاشوں پر فرش بچھا کر کھانا کھایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مؤرخین نے ابوالعباس کو سفاح (یعنی خونریزی کرنے والا) کا لقب دیا۔

سفاح کے دور کا ایک اہم واقعہ جسے مسلمان مؤرخوں نے اہمیت نہیں دی جنگ تالاس ہے۔ یہ جنگ قلب سلطنت سے بہت دور ترکستان کی مشرقی سرحد پر عربوں اور چینیوں کے درمیان ۷۵۱ء میں ہوئی تھی۔ چینیوں نے مسلمانوں کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر ترکستان پر قبضہ کرنے کی آخری بار کوشش کی تھی۔ لیکن اس تالاس کی جنگ میں شکست کھانے کے بعد ہمیشہ کے لیے ترکستان سے دست بردار ہو گئے۔ عربوں کی فتح نے اس بات کا فیصلہ کر دیا کہ ان ملکوں کی آئندہ تہذیب اسلامی ہی رہے گی اور چینی تہذیب کو وہاں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ [1]

---

(۱) جنگ تالاس کی تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب "چین و عرب کے تعلقات" مصنفہ بدرالدین چینی۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی مطبوعہ ۱۹۴۹ء صفحہ ۴۹ تا ۵۱۔

منصور (۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ)

ابو العباس سفاح اگرچہ پہلا عباسی خلیفہ ہے لیکن عباسیوں کا پہلا نامور حکمران اس کا بھائی ابوجعفر منصور (۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ) ہے جو سفاح کے بعد تخت خلافت پر بیٹھا۔ منصور نے بائیس سال حکومت کی اور خلافت عباسیہ کی جڑوں کو مضبوط کر دیا۔ منصور بڑا قابل حکمران تھا۔ وہ مخالفوں کے ساتھ تو بڑی سختی کرتا تھا لیکن عام رعایا کے لیے وہ عادل بادشاہ تھا۔ وہ اپنا تمام وقت سلطنت کے کاموں پر صرف کرتا تھا۔ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ جس کو کسی حاکم سے تکلیف پہنچے وہ بلا روک ٹوک اس سے شکایت کر سکتا ہے۔ وہ خود سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کی لونڈی نے اس کے بدن پر پیوند لگے ہوئے کپڑے دیکھ کر کہا ''خلیفہ اور پیوند لگا ہوا کرتا؟'' منصور نے اس جواب میں ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا۔

''مرد اس حالت میں عزت حاصل کر لیتا ہے کہ اس کی چادر پرانی ہوتی ہے اور اس کی قمیص میں پیوند لگا ہوتا ہے''

منصور کا ایک بڑا کارنامہ بغداد کی بنیاد ہے۔ خلفائے راشدین کا دار الخلافہ مدینہ تھا۔ بنی اُمیہ کا دمشق۔ منصور نے بنی عباس کا دار الخلافہ بنانے کے لیے دریائے دجلہ کے کنارے ایک نیا شہر آباد کیا جو بغداد کے نام سے مشہور ہوا۔ آگے چل کر بغداد نے ایسی ترقی کی کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا شہر بن گیا۔ اس کی آبادی بیس لاکھ سے زیادہ ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ عروج کے زمانے میں بغداد میں سترہ ہزار حمام، اس سے زیادہ مسجدیں اور دس ہزار سڑکیں اور گلیاں تھیں۔

منصور کے زمانے میں عباسیوں کی حکومت اندلس کو چھوڑ کر ان تمام علاقوں میں قائم ہو گئی جو بنی اُمیہ کے قبضے میں تھے۔ منصور نے اندلس پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اور ایک اموی شہزادہ عبدالرحمان نے وہاں بنی امیہ کی حکومت قائم کر لی۔

منصور کے عہد کا ایک اہم واقعہ ابو مسلم خراسانی کا قتل ہے۔ عباسیوں کی حکومت قائم کرانے میں ابو مسلم خراسانی کا بہت بڑا حصہ تھا۔ لیکن منصور نے جب دیکھا کہ ابو مسلم خراسانی کا اثر بڑھ رہا ہے اور اس کی ہمدردیاں عباسیوں سے زیادہ حضرت علیؓ کی اولاد کے ساتھ ہیں تو اس نے ابو مسلم کو دھوکا دے کر قتل کرا دیا۔

منصور کے عہدِ حکومت میں کئی بغاوتیں بھی ہوئیں اور حضرت علیؓ کی اولاد کی طرف سے خلافت حاصل کرنے کی کوششیں بھی ہوئیں۔ ان میں ایک کوشش محمد بن عبداللہ نفس ذکیہ نے، جو حضرت حسینؓ کی اولاد میں سے تھے حجاز میں کی اور دوسری اسی کے قریب ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ نے۔ لیکن منصور نے ان تمام بغاوتوں کو دبا دیا۔

منصور کے زمانے میں رومیوں سے پھر لڑائیاں شروع ہوگئیں جن میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی اور ۱۵۵ ہجری میں منصور نے قیصرِ روم کو جزیہ دینے پر مجبور کر دیا۔

منصور کا دَورِ حکومت علمی ترقی کے لحاظ سے بھی بہت ممتاز ہے۔ بنی اُمیہؔ کے زمانے میں تعلیم زیادہ تر زبانی ہوتی تھی اور کتابیں لکھنے کا رواج زیادہ نہیں ہوا تھا۔ منصور کے دَور میں تصنیف و تالیف کا کام باقاعدگی سے شروع ہوگیا۔ منصور کو خود بھی اشاعت علم سے دلچسپی تھی۔ اس کے دربار میں ہر علم وفن کے ماہر اور عالم جمع رہتے تھے اور وہ پہلا خلیفہ ہے جس کے دربار میں ہر علم وفن کے ماہر اور عالم جمع رہتے تھے اور وہ پہلا خلیفہ ہے جس نے سریانی، یونانی، فارسی اور سنسکرت میں لکھی ہوئی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کرایا۔ یہ کتابیں عام طور پر ریاضی، طب، فلسفہ اور علم ہیئت سے متعلق تھیں۔ یہ وہ علم تھے جن سے عربوں اور مسلمانوں کو واقفیت نہیں تھی۔ اس طرح مسلمانوں نے منصور کے دَور میں علمی ترقی کی طرف ایک اہم قدم اٹھایا۔

اگرچہ منصور کے عہد میں حکومت نے علم و ادب کی بڑے پیمانے پر سرپرستی کی لیکن علمی و ادبی میدانوں میں اب بھی سب سے زیادہ کام دربار کے دائرے سے باہر علماء نے آزادانہ فضا میں انجام دیا۔ چنانچہ امام مالکؒ نے احادیث کی مشہور کتاب ''مؤطا'' اسی زمانے میں لکھی۔ امام ابوحنیفہؒ نے فقہ اسلامی کو اسی دَور میں تحریری صورت میں مرتب کیا اور اسی عہد میں ابن اسحاق نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی مکمل سوانح عمری مرتب کی۔

مہدی

منصور کے بعد اس کا لڑکا محمد مہدی خلیفہ ہوا۔ مہدی اپنی طبیعت اور مزاج میں باپ سے بہت مختلف تھا۔ نرم دل تھا اور عیش پرست اور رنگین مزاج تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بدکردار انسان نہیں تھا۔ بلکہ فرض شناس حکمران تھا۔ اس نے ان تمام لوگوں کو جو منصور کے دَور میں ظلم وستم کا نشانہ بنے تھے معاف کر دیا اور ظلم و زیادتی سے جو مال حاصل کیا گیا تھا وہ بھی واپس کر دیا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ مہدی کی صورت اور سیرت دونوں پسندیدہ تھیں۔ وہ رعایا میں محبوب تھا۔ مظالم کی روک تھام، قتل وخونریزی سے احتراز، عدل وانصاف اور داد و دہش نے اس کو رعایا میں محبوب بنادیا تھا۔

مہدی کے حکم سے مکہ، مدینہ، یمن، بغداد اور دوسرے بڑے بڑے شہروں کے درمیان اونٹ اور خچروں کی ڈاک قائم کی گئی اور پوری مملکت میں کوڑھیوں کی دیکھ بھال کا سرکاری طور پر انتظام کیا گیا۔ مہدی نے خانۂ کعبہ اور مسجد نبویؐ میں توسیع بھی کرائی۔

منصور کے دور میں دوسری زبانوں سے مختلف مذاہب کی کتابوں کے جو ترجمے کیے گئے تھے ان کی وجہ سے مسلمانوں کے عقائد متاثر ہونا شروع ہوگئے اور ایک ایسا طبقہ پیدا ہونا شروع ہوگیا تھا جو صرف ظاہری طور پر مسلمان تھا لیکن در پردہ اسلام اور اسلامی حکومت کی بنیاد کھود رہا تھا۔ ان لوگوں کو مؤرخین نے زندیق لکھا ہے۔ مہدی نے زندیقوں کے عقائد کی تردید اور اسلام کی تائید میں کتابیں لکھوائیں اور اس طرح اس نے اسلامی عقائد کو تقویت دی۔

مہدی کا دس سالہ دور اگرچہ امن وامان کا دور تھا لیکن رومیوں سے سرحدی لڑائیاں اس دور میں بھی جاری رہیں۔ خلافت کی سرحدی فوجیں ہر سال موسم گرما میں ایشیائے کوچک کے رومی علاقوں پر حملے کرتی رہتی تھیں۔ ایسے ہی ایک حملے میں جو ۱۶۵ھ میں کیا گیا تھا مسلمان فوجیں رومی دارالحکومت قسطنطنیہ تک پہنچ گئی تھیں اور رومی حکومت کو سالانہ خراج دینے کا وعدہ کر کے صلح کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس حملے کی قیادت مہدی کے لڑکے ہارون نے کی تھی جو بعد میں ہارون الرشید کے نام سے خلیفہ ہوا۔

ہارون الرشید

مہدی کے بعد اس کا لڑکا ہادی[1] تخت خلافت پر بیٹھا لیکن سوا سال کی حکومت کے بعد ہی

(۱) ہم پڑھ چکے ہیں کہ حضرت علیؓ کی اولاد میں بعض لوگ خلافت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ امویوں کے بعد جب بنی ہاشم کی دوسری شاخ بنی عباس کی خلافت قائم ہوئی تو حضرت علیؓ کے حامی عباسیوں کے بھی خلاف ہوگئے۔ ہادی کے عہد میں امام حسنؓ کی اولاد میں ایک بزرگ ادریس حجاز سے نکل کر شمالی افریقہ کے اس حصے میں چلے گئے جو آج کل المغرب یا مراکش کہلاتا ہے اور یہاں ایک خودمختار حکومت کی بنیاد ڈالی جو ادریسی حکومت کہلاتی ہے۔ یہ حکومت ۷۸۵ء/۱۶۹ھ میں قائم ہوئی ور ۹۲۰ء/۳۰۹ء تک قائم رہی۔ اس حکومت کا صدر مقام فاس تھا جس کی بنیاد ادریس ہی نے ڈالی تھی۔ یہ حکومت عباسی خلافت کو تسلیم نہیں کرتی تھی لیکن یہ شیعہ نہیں تھی۔ ادریس وفات کے بعد جس جگہ دفن ہوئے وہ آج کل مولائے ادریس کہلاتی ہے اور مراکش کی ایک مقدس زیارت گاہ سمجھی جاتی ہے۔

اس کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا دوسرا بھائی ہارون تخت نشین ہوا۔ ہارون کی عمر اس وقت صرف ۲۲ سال تھی۔

عباسی خلفاء میں سب سے زیادہ شہرت ہارون الرشید کو حاصل ہوئی۔ اس کا ۲۳ سالہ دَورِ حکومت عباسی خلافت کا عہد زریں ہے۔ بغداد اپنے عروج پر تھا۔ فراغت اور خوشحالی عام تھی اور علم و فن کا گھر گھر چرچا تھا۔ تمدن اور ثقافت کی ترقی کے لیے ہارون الرشید کا دَور مثالی حیثیت رکھتا تھا۔

ہارون الرشید کی ذات میں متضاد اوصاف جمع تھے۔ ایک طرف اس کی زندگی عیش پرستانہ تھی تو دوسری طرف وہ بڑا دیندار، پابند شریعت، علم دوست اور علماء نواز تھا۔ روزانہ سو رکعت نفل پڑھتا اور ایک ہزار درہم غریبوں میں خیرات کرتا تھا۔ اس کو جہاد کا شوق اور شہادت کی تمنا تھی۔ وہ ایک سال حج کرتا اور ایک سال جہاد۔ جس سال حج کو جاتا تو ایک سو عالموں کو ساتھ لے جاتا اور اُن کا خرچ خود ادا کرتا اور جس سال حج کو نہیں جاتا تو تین سو عالموں کو اپنی طرف سے حج کرنے کے لیے بھیجتا۔

عالموں اور نیک لوگوں کی بڑی عزت کرتا تھا اور جب وہ اس کی کوتاہیوں پر تنقید کرتے یا ملامت کرتے تو وہ بُرا نہ مانتا اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیتا تھا۔

ایک مرتبہ ایک بزرگ ابن سماک سے ہارون نے نصیحت کی درخواست کی۔ انہوں نے فرمایا:

''خدا سے ڈرو اور اس پر یقین رکھ کہ کل تجھے خدا کے رُو برو جانا ہے اور وہاں جنت اور دوزخ میں سے ایک مقام اختیار کرنا ہے۔''

یہ سُن کر ہارون اتنا رویا کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ یہ حالت دیکھ کر ہارون کے حاجب فضل بن ربیع نے کہا:

''امیر المومنین خدا کے حقوق ادا کرتے ہیں اور اس کے بندوں کے ساتھ عدل کرتے ہیں۔ اس کے صلے میں انشاء اللہ ضرور جنت میں جائیں گے۔''

اس پر ابن سماکؒ نے ہارون سے فرمایا:

''امیر المومنین! اس دن فضل آپ کے ساتھ نہ ہو گا اس لیے خدا سے ڈرتے رہیے اور اپنے اعمال کی دیکھ بھال کیجئے۔''

یہ سن کر ہارون پھر رونے لگا۔

اسی طرح ایک مرتبہ ایک اور بزرگ فضیلؒ بن عیاض نے اس سے کہا:

''اے حسین چہرے والے! تُو اس اُمت کا ذمہ دار ہے۔ تجھ ہی سے اس کی باز پُرس ہوگی''

ہارون یہ سُن کر رونے لگا اور بالکل بُرا نہ مانا۔

ہارون الرشید کے قاضی القضاۃ قاضی ابو یوسف تھے۔ جن کو ہارون نے یہ کہہ کر مقرر کیا تھا کہ وہ ایک سچے اور مضبوط کردار کے انسان ہیں۔ سلطنت میں تمام قاضیوں کا تقرر وہی کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے عدالتوں سے خوب انصاف ہوتا تھا۔ مرنے سے پہلے انہوں نے لوگوں کو گواہ کر کے کہا:

''اے خدا! تُو جانتا ہے کہ میں نے تیرے بندوں میں کوئی ایسا حکم جاری نہیں کیا جو کتاب و سنت کے مطابق نہ ہو اور میں نے اپنی زندگی میں حرام کا ایک درہم بھی نہیں لیا اور نہ کسی سے بے انصافی اور زیادتی کی۔''

قاضی صاحب خلیفہ تک کے خلاف فیصلہ دے دیتے تھے۔

ہارون نے قاضی صاحب سے ایک کتاب لکھوائی تھی تاکہ اس میں ایسے طریقے بتائے جائیں جن سے رعایا پر ظلم نہ ہو سکے اور ناجائز طریقے پر ان سے محصول وصول نہ کیا جائے۔ ان کی اس تصنیف کا نام ''کتاب الخراج'' ہے۔ جب یہ مکمل ہوگئی تو ہارون الرشید اس کے مطابق حکومت کرنے لگا۔

دوسری زبانوں کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے کے جس کام کو منصور نے شروع کیا تھا ہارون نے اس کو اور زیادہ ترقی دی اور اس مقصد کے لیے ''بیت الحکمت'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس میں کام کرنے والے عالموں اور مترجموں کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔

رومیوں سے مسلمانوں کی چونکہ مسلسل لڑائیاں رہتی تھیں اس لیے ہارون الرشید نے اسلامی مملکت کو رومیوں کے اچانک حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایشیائے کوچک کی سرحدوں پر قلعہ بندیاں کیں اور شام کے ساحل کے ساتھ ساتھ چھاؤنیاں قائم کیں۔ اس سلسلے میں ہارون الرشید کا حملۂ روم تاریخ کا بڑا اہم واقعہ ہے۔ یہ رومی عباسی خلافت کی اطاعت کرتے تھے اور ان کو خراج دیتے تھے۔ ہارون الرشید کے زمانے میں رومی بادشاہ نقفور نے نہ صرف خراج دینے سے انکار کر

دیا بلکہ ہارون الرشید سے پچھلے سالوں میں وصول کیا ہوا خراج واپس کرنے کا مطالبہ بھی کیا۔

ہارون نے جب یہ خط دیکھا تو غصے سے سُرخ ہو گیا اور اس نے جواب میں لکھا:

''اے رومی کُتے تو اس کا جواب سنے گا نہیں بلکہ آنکھوں سے دیکھے گا''

یہ جواب بھیج کر ہارون ایک زبردست فوج لے کر حملہ آور ہوا اور رومیوں کو ایسی شکست دی کہ وہ پھر خراج ادا کرنے لگے۔ اس مہم کے دَوران ہارون نے قونیہ اور انقرہ کے شہر بھی فتح کر لیے تھے۔

برامکہ

عباسیوں کے زمانہ میں خلفاء نے پہلی مرتبہ اپنی مدد اور مشورہ کے لیے وزیر کا عہدہ قائم کیا پہلے بنی اُمیہ کے زمانے میں وزارت کا عہدہ نہیں تھا۔ ہارون کے زمانہ میں یحیٰی اور اس کے بیٹے فضل اور جعفر بڑے مشہور وزیر ہوئے ہیں۔ یہ لوگ چونکہ ایک شخص برمک کی اولاد میں تھے اس لیے برامکہ کے نام سے مشہور ہیں۔ برامکہ نسلاً ایرانی تھے۔

برامکہ سے زیادہ فیاض و سخی وزیر تاریخ میں بہت کم ہوئے ہیں۔ ان کی فیاضی کی شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی تھی۔ وہ کبھی کسی کا سوال رد نہیں کرتے تھے۔ عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی امداد کرتے تھے اور غریبوں میں اپنی دولت تقسیم کرتے رہتے تھے۔ ان کی فیاضیوں کے واقعات بڑے حیرت انگیز اور بڑے دلچسپ ہیں۔ ہارون الرشید کی خوش قسمتی تھی کہ اس کو اتنے اچھے وزیر مل گئے تھے۔ ان کی وجہ سے اس کی سلطنت کو چار چاند لگ گئے۔

ہارون کو خاص طور پر جعفر برمکی سے بڑی محبت تھی۔ وہ کبھی ایک دُوسرے سے جُدا نہیں ہوتے تھے۔ ہارون الرشید کا قاعدہ تھا کہ وہ بھیس بدل کر راتوں کو بغداد کی سڑکوں اور گلیوں میں پھرا کرتا تھا تاکہ لوگوں کے حالات معلوم کرے۔ اس وقت جعفر برمکی اور ایک حبشی غلام مسرور بھی اس کے ساتھ جاتے تھے۔ ان گشتوں میں بعض بڑے دلچسپ واقعات پیش آتے تھے جو تاریخوں میں موجود ہیں۔ لیکن خلیفہ اور وزیر کی یہ دوستی ہمیشہ قائم نہ رہ سکی اور جعفر سے ناراض ہو کر ہارون نے اس کو قتل کرا دیا۔ بعد میں ہارون اس واقعہ کو یاد کر کے رویا کرتا تھا اور کہتے ہیں کہ جعفر کے قتل

کے بعد لوگوں نے اس کو کبھی ہنستا ہوا نہیں دیکھا۔ مورخین نے جعفر کے قتل اور برامکہ [1] کے زوال کے مختلف اسباب لکھے ہیں، لیکن برامکہ کے زوال کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہارون الرشید کو ان کے غیر معمولی اختیارات، اثرات اور مقبولیت کی وجہ سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں وہ لوگ تخت خلافت پر قابض نہ ہو جائیں۔

اغالبہ

منصور کے بعد مراکش کا علاقہ عباسی خلافت کے اقتدار سے نکل گیا تھا۔ ہارون الرشید کے زمانے میں ایک اور علاقہ جو افریقہ کہلاتا تھا اور موجودہ طرابلس، تونس اور الجزائر پر مشتمل تھا نیم خود مختار ہو گیا۔ مرکز خلافت سے دور ہونے کی وجہ سے اس علاقہ کا انتظام چونکہ مشکل ہو رہا تھا اس لیے ہارون نے یہاں کی حکومت مستقل طور پر ایک شخص ابراہیم بن اغلب کے اور اس کی اولاد کے سپرد کر دی۔ اس طرح افریقہ میں ایک نئی حکومت کی بنیاد پڑ گئی جو اغالبہ یا خاندان اغلب کی حکومت کہلاتی ہے۔ یہ اغلبی حکومت عملاً خود مختار تھی لیکن عباسی خلافت کو تسلیم کرتی تھی اور ہر سال باقاعدگی کے ساتھ خراج دیا کرتی تھی جو اس کا ثبوت تھا کہ یہ حکومت عباسی خلافت کا ایک حصہ ہے۔

اغلبی خاندان کی یہ حکومت ۱۸۴ھ/۸۰۰ء سے ۲۹۶ھ/۹۰۹ء تک یعنی ایک سو سال سے زیادہ قائم رہی۔ اس کا دارالحکومت قیروان تھا جس کی بنیاد عقبہ بن نافع نے ڈالی تھی۔ اغلبی خاندان کے دورِ حکومت میں قیروان علوم وفنون کا شمالی افریقہ میں سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا لیکن اغلبی حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ جزیرہ صقلیہ کی فتح اور بحری قوت کی ترقی ہے۔ اس دور میں نہ صرف یہ کہ جزیرہ صقلیہ فتح کیا گیا بلکہ جنوبی اٹلی پر بھی مسلمانوں کا تسلط قائم ہو گیا تھا۔ اغلبی حکومت کا بحری بیڑا اتنا طاقت ور ہو گیا تھا کہ مغربی بحیرۂ روم میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

ہارون الرشید نے ۲۳ سال شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۴۷ سال تھی۔

جانشینی کے معاملہ میں جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں، اب تک یہ قاعدہ تھا کہ ایک خلیفہ کے انتقال کے بعد ایک ہی خلیفہ تخت نشین ہوتا تھا۔ لیکن ہارون الرشید نے یہ طریقہ بدل دیا اور اپنی

---

(۱) برامکہ کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے کتاب البرامکہ از عبدالرزاق کانپوری۔

سلطنت اپنے دو بیٹوں امین اور مامون میں تقسیم کر دی۔ امین کو مغربی ایران اور عراق سے افریقہ تک تمام مغربی ملک دے دیئے اور مامون الرشید کو ایران کا بڑا حصہ اور دریائے سندھ تک تمام مشرقی ملک مل گئے۔ ہارون کی وفات کے بعد مامون الرشید نے خراسان کے شہر مرو کو اور امین نے بغداد کو اپنا دارالحکومت بنالیا۔

ہارون الرشید جیسے عقل مند بادشاہ کی یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر اپنی مضبوط سلطنت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے کمزور کر دیا۔ مثل مشہور ہے کہ ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ امین اور مامون میں جلد ہی لڑائی شروع ہوگئی جس میں بڑی خونریزی ہوئی اور کئی سال تک عراق اور اس سے ملے ہوئے صوبوں میں بدامنی رہی۔ لیکن خوش قسمتی سے اس جنگ میں مامون کو، جو حکومت کی پوری پوری صلاحیت رکھتا تھا، کامیابی ہوئی۔ اس طرح عباسی سلطنت ایک بار پھر متحد ہوگئی۔ اگر مامون سلطنت کو پھر سے متحد کرنے میں کامیاب نہ ہوتا تو عباسیوں کا زوال پچاس سال پہلے ہی شروع ہو جاتا۔

مامون الرشید (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ)

ہارون الرشید کے بعد اگر کسی اور عباسی خلیفہ کا عہد ہارون کے دور کا مقابلہ کر سکتا ہے تو وہ مامون الرشید کا دورِ حکومت ہے۔

امین کے قتل ہونے کے بعد بھی مامون الرشید تقریباً ۶ سال تک مرو ہی میں رہا۔ اس زمانہ میں عراق خصوصاً شہر بغداد ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔ ان ہنگاموں کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مامون الرشید اپنے شیعہ اتالیق اور نگرانوں کی وجہ سے حضرت علیؓ کی فضیلت کا قائل ہو گیا تھا اور حضرت علیؓ کی اولاد کو خلافت کا زیادہ حق دار سمجھتا۔ اس معاملے میں وہ یہاں تک بڑھا کہ اس نے امام علی بن موسیٰ رضا کو جو شیعوں کے آٹھویں امام ہیں اپنا ولی عہد مقرر کر دیا۔ اس فیصلے نے عباسی شہزادوں میں بے چینی پیدا کر دی اور انہوں نے عراق میں بغاوت کر دی۔ مامون الرشید کو بالآخر اپنا فیصلہ منسوخ کرنا پڑا اور مرو چھوڑ کر بغداد آنا پڑا۔ ۲۰۴ھ میں بغداد پہنچنے کے بعد ہنگامے فرو ہو گئے اور مامون کی خلافت کے باقی چودہ سال امن وامان میں گزرے۔

مامون کے زمانہ میں طبرستان کا علاقہ بھی ہنگاموں کی زد میں رہا۔ یہاں ایک ایرانی حاکم

خرمی پہاڑی علاقوں پر قابض ہوگیا تھا۔ اس نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی تھی۔ وہ ایک تحریک کا علمبردار تھا جو بظاہر مذہبی رنگ میں تھی لیکن درحقیقت مسلمانوں کے خلاف ایک سیاسی تحریک تھی اور اس کا مقصد ایرانیوں کی حکومت قائم کرنا تھا۔ مامون کی کوششوں کے باوجود اس بغاوت پر قابو نہیں پایا جاسکا۔

مامون کے دَور کا ایک اور اہم واقعہ جزیرہ صقلیہ اور جزیرہ کریٹ کی فتح ہے۔ صقلیہ قیروان کے اغلبی حکمرانوں کی کوششوں سے فتح ہوا جو عباسی خلافت کے باجگذار تھے اور کریٹ کا جزیرہ اندلس سے نکلی ہوئی مسلمانوں کی ایک جماعت نے فتح کیا۔

مامون الرشید کے دَور کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کے زمانے میں ترکوں میں اسلام تیزی سے پھیلنا شروع ہوا۔ اشروسنہ اور کابل کے حکمرانوں نے اسی زمانے میں اسلام قبول کیا۔

مامون الرشید کو عدل و انصاف کا بڑا خیال تھا۔ وہ ہر اتوار کو صبح سے ظہر تک خود رعایا کی شکائتیں سنتا تھا۔ اس کی عدالت میں ایک معمولی آدمی شہزادوں تک سے اپنا حق لے سکتا تھا۔

ایک مرتبہ ایک شکستہ حال بوڑھی عورت نے دعویٰ کیا کہ مامون کے لڑکے عباس نے اس کی جائیداد پر قبضہ کرلیا ہے۔ جب مقدمہ پیش ہوا تو مامون نے عباس کو بڑھیا کے پاس کھڑا کر کے دونوں کے بیانات لیے۔ شہزادہ باپ کے ادب کی وجہ سے آہستہ آہستہ بولتا تھا اور بڑھیا کی آواز بلند تھی۔ وزیر اعظم احمد بن ابی خالد نے اس پر بڑھیا کو روکا کہ امیر المومنین کے سامنے بلند آواز سے باتیں کرنا ادب کے خلاف ہے لیکن مامون نے منع کیا اور کہا کہ وہ جس طرح کہتی ہے کہنے دو حق نے اس کی آواز بلند کردی ہے اور عباس کو گونگا کردیا ہے۔ دونوں کے بیانات سننے کے بعد مامون نے بڑھیا کے حق میں فیصلہ دیا اور اس کی جائداد واپس کردی۔

مامون کی انصاف پسندی کا ایک اور واقعہ بھی بڑا مشہور ہے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے اس پر بیس ہزار کا دعوٰی کیا۔ مامون کو قاضی کی عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ نوکروں نے اس کے لیے عدالت میں قالین بچھا دیا۔ قاضی القضاۃ نے یہ دیکھا تو نوکروں کو روک دیا اور کہا کہ عدالت میں دعویٰ کرنے والا اور ملزم دونوں برابر ہیں کسی کے ساتھ امتیازی برتاؤ نہیں کیا جاسکتا۔ مامون نے جب قاضی کی یہ حق پرستی دیکھی تو اس کی تنخواہ بڑھا دی۔ اب ہر آدمی اندازہ کرسکتا ہے کہ جس زمانہ میں ایسے ہمت والے قاضی ہوں اور ایسے انصاف پسند بادشاہ ہوں تو عام لوگ کیسے چین اور امن

کی زندگی گزارتے ہوں گے۔

مامون کے مزاج میں حد سے زیادہ سادگی اور انکساری تھی، غرور کا نام نہ تھا، اپنے ساتھیوں اور درباریوں میں نہایت سادگی اور بے تکلفی سے رہتا تھا۔ اس کے عہد کے مشہور قاضی القضاۃ یحیٰی بن اکثم کا بیان ہے کہ ایک رات مجھے مامون کے پاس سونے کا اتفاق ہوا۔ آدھی رات گئے مجھے پیاس معلوم ہوئی میں پانی پینے کے لیے اٹھا۔ مامون کی نظر پڑ گئی پوچھا:

''قاضی صاحب کیا بات ہے؟''

''امیر المومنین پیاس معلوم ہو رہی ہے۔'' قاضی نے جواب دیا۔

مامون یہ سن کر اٹھا اور خود جا کر آبدار خانہ سے پانی لے آیا۔ اس پر قاضی صاحب نے کہا:

''امیر المومنین، خادم یا خادمہ کو کیوں نہیں آواز دی''

''سب سو رہے ہیں'' مامون نے کہا۔

''تو میں خود پی لیتا۔'' قاضی صاحب نے جواب دیا۔

اس پر مامون نے جواب دیا کہ یہ بُری بات ہے کہ اپنے مہمان سے کام لیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: ''قوم کا سرداران کا خادم ہے۔''

مامون الرشید کو انتظام حکومت کا اتنا خیال تھا کہ وہ اپنی وسیع سلطنت کی ہر چیز اور کام سے واقف رہنا چاہتا تھا۔ اس نے اس مقصد کے لیے سارے ملک میں پرچہ نویس مقرر کر رکھے تھے جو ذرا ذرا سی بات کی خلیفہ کو اطلاع دیتے تھے۔ صرف بغداد میں اس کام کے لیے سترہ سو عورتیں مقرر تھیں جو اس کو خفیہ اطلاعات پہنچاتی رہتی تھیں۔

علوم و فنون کی ترقی کے لیے مامون الرشید کی کوششیں تاریخ کا زریں باب ہیں۔ وہ خود بھی ایک بڑا عالم تھا۔ خلفاء میں اس کے برابر کوئی دوسرا عالم نہیں ہوا۔ وہ حافظ قرآن تھا اور دینی علوم سے واقفیت کے علاوہ اس کو علم ہیئت اور ریاضی سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس نے ریاضی دانوں اور ہیئت دانوں کی مدد سے دو مرتبہ کرۂ زمین کی پیمائش کروائی۔

غیر زبانوں سے ترجمہ کا کام مامون الرشید کے زمانے میں اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ وہ ترجمہ کرنے والوں کو ترجمہ کی ہوئی کتابوں کے وزن کے برابر چاندی یا سونا انعام میں دیا کرتا تھا۔ فلسفہ اور عقلی علوم کے ترجمہ کے سلسلہ میں مؤرخین نے ایک بڑا دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ وہ

لکھتے ہیں کہ:

یہ وہ زمانہ تھا کہ عقلی علوم روما میں ایک مصیبت سمجھے جاتے تھے۔ ان سے متعلق کتابیں قسطنطنیہ کے ایک مکان میں بند کر دی گئی تھیں اور ہر بادشاہ اس مکان میں ایک تالے کا اور اضافہ کر دیتا تھا۔ مامون الرشید نے جب ان کتابوں کو بغداد بھیجنے کی خواہش کی تو قیصر نے اپنے مشیروں سے پوچھا کہ اگر یہ کتابیں بغداد بھیج دی جائیں تو مجھ پر دنیا میں کوئی وبال یا آخرت میں مواخذہ تو نہ ہوگا۔ اس پر ایک راہب نے جواب دیا: وبال اور مواخذہ نہیں بلکہ ثواب ملے گا کیونکہ یہ چیزیں جس منصب میں داخل ہو جائیں اس کی بنیادیں ہلا دیں۔ چنانچہ یہ کتابیں جو افلاطون، سقراط، ارسطو، جالینوس، اقلیدس اور بطلیموس کی تصانیف پر مشتمل تھیں بغداد روانہ کر دی گئیں۔

مامون الرشید کے عہد کا ایک اہم واقعہ فتنہ خلقِ قرآن ہے۔ فلسفہ کے مطالعہ اور غیر مسلم علماء کی صحبت کی وجہ سے مامون الرشید اس عقیدہ کا قائل ہوگیا تھا کہ قرآن مخلوق ہے اس نظریہ کی صداقت پر مامون کو اس حد تک یقین تھا کہ اُس نے خلقِ قرآن کے نظریہ کو اسلام اور کفر کا پیمانہ سمجھ لیا تھا۔ اس نے علماء کو مجبور کیا کہ یا تو وہ اس نظریہ کو تسلیم کریں یا پھر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اب تک آزادی رائے پر اگر کچھ پابندی تھی تو صرف سیاسی معاملات میں تھی لیکن مامون جیسے سمجھ دار اور صاحب علم حکمران نے خلقِ قرآن کے مسئلہ میں شدت اختیار کر کے مذہبی آزادی میں بھی مداخلت کر دی۔ مامون الرشید کا تو جلد ہی انتقال ہوگیا لیکن اس کے دو جانشینوں معتصم اور واثق کے زمانہ میں اس مسئلہ کی وجہ سے علماء پر اور خاص طور پر امام احمد بن حنبلؒ پر بہت سختیاں کی گئیں حالانکہ ان کا کہنا صرف یہ تھا کہ کتاب و سنت کے مطابق کسی شخص کو اس قسم کے عقیدے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

مامون الرشید کا ۴۸ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ اس نے بیس سال حکومت کی۔

معتصم (۲۱۸ھ تا ۲۲۷ھ)

مامون کے بعد اس کا بھائی معتصم باللہ تخت پر بیٹھا۔ معتصم کے زمانہ میں فوجی طاقت میں بڑا اضافہ ہوا۔ اور اس نے اس مقصد کے لیے ترکوں کی فوج تیار کی۔ معتصم کے عہد کا سب سے

مشہور واقعہ روم پر حملہ ہے۔ قصہ یہ ہے کہ معتصم دربار میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس کو معلوم ہوا کہ رومیوں نے سرحد پر حملہ کر کے بہت سے مسلمانوں کو قید کر لیا ہے۔ ان قیدیوں میں ایک بوڑھی عورت بھی تھی جو گرفتار ہونے پر اس کا نام لے کر مدد کو پکار رہی تھی۔ معتصم نے یہ سنا تو اس سے صبر نہ ہو سکا۔ فوراً لشکر کو تیار ہونے کا حکم دے دیا۔ اس موقعہ پر ایک نجومی نے حساب لگا کر بتایا کہ یہ گھڑی منحوس ہے اس لیے فوج کشی ملتوی کر دیجیے لیکن معتصم نے نہیں مانا اور حملہ کر دیا۔ اس کی فوجوں نے ایشائے کوچک کو تہہ بالا کر دیا اور اس وقت تک واپس نہیں لوٹا جب تک کہ اس بڑھیا کو رہا نہیں کرا لیا۔

معتصم اس مہم کے دوران عموریہ اور انقرہ کی قلعہ بندیوں کو ڈھاتا ہوا قسطنطنیہ کے قریب تک پہنچ گیا تھا اور وہ رومی دارالسلطنت کو فتح کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اس کو اپنے بھتیجے عباس کی بغاوت کی اطلاع ملی جس کی وجہ سے یہ مہم نامکمل چھوڑ کر معتصم کو بغداد واپس آنا پڑا۔ جب معتصم اس کامیاب مہم سے واپس لوٹا تو مشہور شاعر ابوتمام نے معتصم کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا اور کہا کہ تقدیر کے فیصلے ستارے نہیں کرتے تلوار کرتی ہے۔ (۱)

معتصم کے عہد کا ایک دوسرا اہم واقعہ بابک خرمی کی بغاوت کا خاتمہ ہے۔ بابک خرمی ایک غیر مسلم ایرانی تھا اور اس نے ایک ایسی تحریک شروع کی تھی جس کا مقصد مسلمانوں کو گمراہ اور بے دین کرنا تھا۔ اس اسلام دشمن تحریک کے ذریعہ اس نے بہت سے ایرانیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور گیلان اور آذربائیجان کے پہاڑی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ بابک خرمی کی یہ بغاوت مامون الرشید کے زمانہ ہی میں شروع ہو گئی تھی۔ اس کو بالآخر معتصم نے فرو کیا۔ بابک گرفتار کر لیا گیا اور قتل کر دیا گیا۔

معتصم نے بغداد سے شمال میں تقریباً ۷۵ میل دور دریائے دجلہ کے کنارے ''سامرا'' کے نام سے ایک شہر بسایا اور اس کو دارالخلافہ بنایا۔ اس شہر نے بڑی ترقی کی اور اپنی شاندار عمارتوں اور خوبصورتی میں بغداد کا مقابلہ کرنے لگے۔ سامرا ۲۲۱ھ سے ۲۷۹ھ تک دارالخلافہ رہا اس کے بعد دارالخلافہ پھر بغداد منتقل ہو گیا۔

(۱) شعر العجم حصہ نمبر ۱ باب تمہید

بعد خاص طور پر ایرانی اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ خلافت کی مضبوطی کے لیے یہ بات بڑی اچھی تھی کہ عرب اور ایرانی ایک دوسرے سے لڑنے کی بجائے اب خلافت کے استحکام میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ اس تعاون کو اخوت و مساوات انسانی کی اسلامی بنیاد پر مزید فروغ دیا جا سکتا تھا لیکن دربار سے اسلامی روح اور اسلامی نظریہ کو اسی وقت رخصت کیا جا چکا تھا جب خلافت کی جگہ ملوکیت قائم ہوئی تھی۔ اب سیاست کی بنیاد ملت اسلامیہ کے مفاد کی بجائے حکمران کی ذاتی مصلحت ہوتی تھی۔ عباسیوں نے ابتدائی دور میں اس ذاتی مصلحت کے تحت ایرانیوں کو آگے بڑھایا اور اب معتصم نے اسی ذاتی مصلحت کے تحت ایرانیوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے ڈر کر ترکوں کو آگے بڑھایا۔

عباسی خلافت کے زمانہ میں ترکوں نے بڑی تیزی سے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ معتصم نے اپنے ذاتی محافظ کے طور پر اور فوج کے لیے مشرقی سرحدوں سے ہزاروں کی تعداد میں ترکوں کو بھرتی کیا۔ ترک چونکہ فطری طور پر جنگجو اور دلیر ہوتے تھے اس لیے وہ جلد ہی فوجی نظام پر چھا گئے۔ متوکل کے زمانے میں ان کا زور اتنا بڑھ گیا کہ وہ امور سلطنت میں مداخلت کرنے لگے اور آخر کار خود متوکل ان کی سازش کا شکار ہو کر قتل ہوا۔ ترک فوجی اور ان کے افسروں میں سب مسلمان نہیں تھے۔ ان کی ایک خاصی بڑی تعداد اب تک غیر مسلم تھی۔ وہ نا تربیت یافتہ اور اجڈ تھے۔ ان کے اسی اجڈ پن کی وجہ سے معتصم کو بغداد چھوڑ کر "سامرا" منتقل ہونا پڑا تھا۔ ان میں جو مسلمان تھے ان کی صحیح معنوں میں اسلامی تعلیم و تربیت بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ نظریاتی طور پر اتنے پختہ مسلمان بھی نہیں تھے جتنے ایرانی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب حکمرانوں اور ایرانی امراء اور وزراء کی طرح یہ ترک بھی ہر بات ملت اسلامیہ کے مفاد کی بجائے ترکوں کے مفاد میں سوچنے لگے اور اس طرح اسلامی خلافت کے عرب، ایرانی اور ترک باشندے بلند اسلامی نصب العین کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے نسل اور وطنی بنیاد پر ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔

متوکل کے بعد ترک امراء کا اقتدار اور بڑھ گیا۔ اب وہ خلیفہ کا حکم سننے سے بھی انکار کرنے لگے۔ انہوں نے کئی خلفاء کو تخت سے اتار دیا اور بعض کو قتل بھی کیا۔ متوکل کے بعد آٹھ سال کی مختصر مدت میں چار خلفاء تخت پر بٹھائے اور اتارے گئے۔ اس طرح ترکوں نے مرکزی حکومت کو کمزور تو کر دیا، لیکن خود کوئی مضبوط حکومت قائم نہ کر سکے۔ جب سلطنت کے مختلف صوبوں نے یہ

بعد خاص طور پر ایرانی اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ خلافت کی مضبوطی کے لیے یہ بات بڑی اچھی تھی کہ عرب اور ایرانی ایک دوسرے سے لڑنے کی بجائے اب خلافت کے استحکام میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ اس تعاون کو اخوت و مساوات انسانی کی اسلامی بنیاد پر مزید فروغ دیا جاسکتا تھا لیکن دربار سے اسلامی روح اور اسلامی نظریہ کو اسی وقت رخصت کیا جاچکا تھا جب خلافت کی جگہ ملوکیت قائم ہوئی تھی۔ اب سیاست کی بنیاد ملت اسلامیہ کے مفاد کی بجائے حکمران کی ذاتی مصلحت ہوتی تھی۔ عباسیوں نے ابتدائی دور میں اس ذاتی مصلحت کے تحت ایرانیوں کو آگے بڑھایا اور اب معتصم نے اسی ذاتی مصلحت کے تحت ایرانیوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے ڈر کر ترکوں کو آگے بڑھایا۔

عباسی خلافت کے زمانہ میں ترکوں نے بڑی تیزی سے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ معتصم نے اپنے ذاتی محافظ کے طور پر اور فوج کے لیے مشرقی سرحدوں سے ہزاروں کی تعداد میں ترکوں کو بھرتی کیا۔ ترک چونکہ فطری طور پر جنگجو اور دلیر ہوتے تھے اس لیے وہ جلد ہی فوجی نظام پر چھا گئے۔ متوکل کے زمانے میں ان کا زور اتنا بڑھ گیا کہ وہ امور سلطنت میں مداخلت کرنے لگے اور آخرکار خود متوکل ان کی سازش کا شکار ہو کر قتل ہوا۔ ترک فوجی اور ان کے افسروں میں سب مسلمان نہیں تھے۔ ان کی ایک خاصی بڑی تعداد اب تک غیر مسلم تھی۔ وہ نا تربیت یافتہ اور اجڈ تھے۔ ان کے اسی اجڈ پن کی وجہ سے معتصم کو بغداد چھوڑ کر "سامرا" منتقل ہونا پڑا تھا۔ ان میں جو مسلمان تھے ان کی صحیح معنوں میں اسلامی تعلیم و تربیت بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ نظریاتی طور پر اتنے پختہ مسلمان بھی نہیں تھے جتنے ایرانی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب حکمرانوں اور ایرانی امراء اور وزراء کی طرح یہ ترک بھی ہر بات ملت اسلامیہ کے مفاد کی بجائے ترکوں کے مفاد میں سوچنے لگے اور اس طرح اسلامی خلافت کے عرب، ایرانی اور ترک باشندے بلند اسلامی نصب العین کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے نسل اور وطنی بنیاد پر ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔

متوکل کے بعد ترک امراء کا اقتدار اور بڑھ گیا۔ اب وہ خلیفہ کا حکم سننے سے بھی انکار کرنے لگے۔ انہوں نے کئی خلفاء کو تخت سے اتار دیا اور بعض کو قتل بھی کیا۔ متوکل کے بعد آٹھ سال کی مختصر مدت میں چار خلفاء تخت پر بٹھائے اور اتار دیے گئے۔ اس طرح ترکوں نے مرکزی حکومت کو کمزور تو کر دیا، لیکن خود کوئی مضبوط حکومت قائم نہ کر سکے۔ جب سلطنت کے مختلف صوبوں نے یہ

حالت دیکھی تو وہاں کے امیروں اور صوبے داروں نے اپنے اپنے علاقہ میں خودمختار [1] حکومتیں قائم کرلیں۔ یہ حکومتیں عباسی خلیفہ کو تسلیم کرتی تھیں، ان کی مسجدوں میں عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا لیکن عباسی خلیفہ کا کوئی حکم نہیں چلتا تھا۔

زوال کے اس دور میں جو اہم واقعات پیش آئے ان میں دو قابل ذکر ہیں۔ ان میں ایک واقعہ حبشیوں کی بغاوت کا ہے۔ عربوں کے پاس جو غلام تھے وہ زیادہ تر حبشی تھے۔ ایک ایرانی نے ان حبشی غلاموں کی مدد سے عراق میں ہنگامہ شروع کر دیا۔ حبشیوں کی تعداد ملک میں کافی تھی

---

(1) ان آزاد حکومتوں کے نام یہ ہیں:

i۔ صفاری (۲۵۳ھ تا ۲۹۸ھ) اس حکومت کا بانی یعقوب بن لیث صفار تھا۔ پورا جنوبی ایران اس کے قبضہ میں تھا۔ اس حکومت کا خاتمہ سامانیوں کے ہاتھ ہوا۔

ii۔ دولت علویہ طبرستان (۸۶۸ء/۲۵۰ھ تا ۹۲۸ء/۳۱۶ھ) اس کے بانی حسن بن زید علوی تھے اور یہ ایران کے شمالی حصے مازندران میں قائم ہوئی تھی جس کو اس زمانے میں طبرستان کہتے تھے۔ اس حکومت کا خاتمہ بھی سامانیوں نے کیا۔

iii۔ دولت طولونیہ، مصر (۸۶۸ء/۲۵۴ھ تا ۹۰۴ء/۲۹۲ھ) اس حکومت کا بانی ایک ترک احمد بن طولون (۲۵۴ء تا ۲۷۰ھ) تھا۔ مصر اور شام اس حکومت کے قبضے میں تھے۔ یہ حکومت مضبوط اور رعایا پرور تھی۔ قاہرہ کی مشہور مسجد جامع ابن طولون اسی دور میں تعمیر ہوئی۔

iv۔ دولت سامانیہ (۲۶۱ھ تا ۳۹۵ھ) اس حکومت کا حال اگلے باب میں آئے گا۔ یہ ایرانی حکومت تھی۔

v۔ آل حمدان (۹۰۵ء/۲۹۳ھ تا ۱۰۱۵ء/۴۰۶ھ) یہ عربوں کی حکومت تھی۔ پہلے اس کا مرکز موصل میں تھا پھر حلب (شام) ہوگیا۔ حمدانی حکمرانوں میں سیف الدولہ (۹۴۴ء/۳۳۳ھ تا ۹۶۷ء/۳۵۶ھ) کا نام قابل ذکر ہے۔ مسلمانوں میں خانہ جنگی شروع ہوجانے کی وجہ سے رومی زور پکڑ گئے تھے۔ سیف الدولہ کی حکومت اگرچہ چھوٹی سی تھی لیکن اس نے ایشیائے کوچک میں رومیوں کی اس پیشقدمی کو کامیابی سے روکا۔ اس کے علاوہ سیف الدولہ علم و ادب کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ عربی کا سب سے بڑا شاعر متنبی (۹۱۵ء تا ۹۶۵ء) اور مشہور فلسفی فارابی اس کے دربار سے وابستہ تھے۔

vi۔ دولت زیاریہ یا آل ڈمگیر (۳۱۹ھ تا ۴۳۰ھ) یہ ایرانی حکومت تھی اور ایران کے شمال مشرقی صوبہ جرجان یا گرگان میں قائم ہوئی۔

vii۔ دولت اخشیدیہ (۹۳۵ء/۳۲۳ھ تا ۹۶۸ء/۳۵۷ھ) یہ ترکوں کی حکومت تھی۔ طولونی حکومت کے خاتمہ کے بعد مصر اور شام پر پھر عباسی خلفاء کا اقتدار قائم ہوگیا تھا۔ لیکن چند برس کے بعد یہ علاقے پھر ان کے ہاتھ سے نکل گئے اور یہاں خیشدی حکومت قائم ہوگئی جس کا خاتمہ شمالی افریقہ کی فاطمی حکومت نے کیا۔ اخشیدیوں کا وزیر ایک حبشی ملک کافور تھا جو بڑا قابل اور علم دوست تھا۔

یہ حکومتیں زیادہ پائدار اور بڑی نہیں تھیں۔ بڑی اور پائیدار حکومتیں سامانیوں، بنی بویہ اور بنی فاطمہ کی تھیں جن کا حال ہم اگلے باب میں پڑھیں گے۔

وہ سب اس کے ساتھ مل گئے۔ ان حبشیوں نے جنوبی عراق اور خوزستان پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں پر بڑے مظالم کیے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ سے پچیس لاکھ بے گناہ شہری مارے گئے۔ یہ بغاوت ۲۵۵ھ سے ۲۷۰ھ تک یعنی پندرہ سال جاری رہی۔

اس دَور کا دوسرا اہم واقعہ قرامطہ کا فتنہ ہے۔ بصرہ کے نواح میں ایک شخص قرمطہ نے ملک کی بدامنی سے فائدہ اٹھا کر ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈال دی جس کے پیرو قرمطی یا قرامطہ کہلاتے ہیں۔ قرامطہ کے فتنہ کا آغاز ۲۷۸ھ میں ہوا اور پچاس سال سے زیادہ جاری رہا۔ جنوبی عراق اور شام ان کے ظلم و ستم اور لوٹ مار کا سب سے زیادہ نشانہ بنے۔ یہ لوگ یہاں تک بڑھ گئے تھے کہ ۳۱۷ھ میں مکہ کے حج کے موقعہ پر حاجیوں کا قتل عام کیا اور حجر اسود اٹھا کر اپنے دارالحکومت ہجر لے گئے جو بصرہ کے جنوب میں واقع تھا۔ بعد میں فاطمی حکمران عبیداللہ کے حکم پر حجر اسود واپس کر دیا۔

دَور زوال کے عباسی حکمرانوں میں بعض بہت اچھے اور قابل تھے اور انہوں نے زوال کو روکنے کی کافی کوشش کی۔ ان حکمرانوں میں ایک مہتدی ہے۔ اس نے عباسی خلافت کو زیادہ سے زیادہ اسلامی رنگ دینے کی کوشش کی۔ وہ کہتا تھا کہ مجھے عمر بن عبدالعزیز کے راستے پر چلنے دو تاکہ میں بنوعباس میں بھی عمر بن عبدالعزیز جیسی مثال پیدا کر سکوں۔ لیکن اجڈ ترکوں نے اور ان شاہی حکام اور امراء نے جو اسلامی پابندیوں سے گھبراتے تھے مہتدی کو کامیاب نہیں ہونے دیا اور یہ خلیفہ ترکوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ مہتدی کو گرفتار کرنے کے بعد ترکوں نے اس سے سوال کیا کہ تم لوگوں کو ایسے راستہ پر کیوں چلانا چاہتے ہو جس سے وہ ناواقف ہیں۔ مہتدی نے جواب دیا کہ میں لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اہل بیت نبویؐ اور خلفائے راشدین کے طریقے پر چلانا چاہتا ہوں۔ اس پر ترکوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سابقہ ایسے لوگوں سے تھا جو دنیا سے کنارہ کش اور آخرت کی طرف مائل تھے اور تمہارے ساتھی ترک، خزر وغیرہ ایسی قومیں ہیں جو اخروی فرائض سے ناواقف ہیں اور ان کی زندگی کا مقصد دنیاوی فائدے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ایسی حالت میں تم ان کو کیونکر راستہ پر چلا سکتے ہو۔[1]

---

(۱) تاریخ اسلام حصہ سوم مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی صفحہ ۳۰۹ مطبوعہ ۱۹۴۹ء

ترکوں کا یہ جواب اس بات کا ثبوت ہے کہ تیسری صدی ہجری کے وسط تک دربار کا ماحول کس حد تک غیر اسلامی ہو چکا تھا۔

خلیفہ معتمد کا بھائی موفق متوفی ۲۷۸ھ بھی اس دور کی اہم شخصیت ہے۔ وہ اگرچہ خلیفہ نہیں تھا لیکن حکومت کا اقتدار اسی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک اچھا سپہ سالار تھا۔ اس نے خلافت کی ساکھ قائم رکھنے کی پوری کوشش کی، حبشیوں کی بغاوت اسی نے فرو کی۔ اور ترکوں کو حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

معتضد

دورِ زوال میں جس خلیفہ نے سب سے زیادہ خدمات انجام دیں وہ موفق کا لڑکا معتضد ہے جو معتمد کے بعد تختِ خلافت پر بیٹھا۔ معتضد نے ترکوں کا زور توڑ دیا، ایک وسیع علاقے میں جو عرب عراق، مغربی ایران اور آرمینیہ پر مشتمل تھا پھر سے امن وامان قائم کر دیا اور عباسی حکومت کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دیا۔ اس کے عہد میں مصر وشام کی طولونی حکومت نے بھی عباسی خلافت کی اطاعت قبول کر لی اور اس کے جانشین مکتفی کے زمانے میں مصر وشام براہِ راست عباسی خلافت کے قبضے میں آ گئے۔ اپنے کارناموں کی وجہ سے معتضد کو سفاح ثانی یعنی عباسی خلافت کا دوسرا بانی کہا جاتا ہے۔

معتضد نے امن وامان قائم کرنے کے سلسلے میں کافی سختیاں کیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے مسلمانوں کی اخلاقی اور ذہنی اصلاح کی بھی کوشش کی۔ وہ ذاتی طور پر دیندار انسان تھا۔ اس نے نجومیوں اور قصہ خوانوں کو سڑکوں پر بیٹھنے سے منع کر دیا۔ فلسفہ کی کتابوں پر جو مسلمانوں میں گمراہی پھیلا رہی تھیں پابندی لگا دی۔ ایرانی آتش پرستوں کے زیر اثر بعض مسلمانوں میں بھی نوروز کے موقع پر آگ جلانے کی رسم رواج پا گئی تھی۔ معتضد نے اس رسم کو حکماً بند کر دیا۔ معتضد کے زمانہ میں عدالتیں بھی آزاد ہو گئی تھیں۔ اور امراء ہی نہیں خلیفہ بھی عدالت کی باز پرس سے نہیں بچ سکتا تھا۔

معتضد کے زمانے میں کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا گیا۔ پرانے ٹیکس بھی کم کر دیئے گئے، لیکن اس کے باوجود عباسی حکومت کا میزانیہ اتنا اچھا ہو گیا کہ اخراجات کے بعد ایک بڑی رقم بچ رہتی تھی۔

معتضد کے بعد یکے بعد دیگرے اس کے تین لڑکے مکتفی باللہ، معتضد باللہ اور قاہر باللہ کے نام سے تخت نشین ہوئے۔ مکتفی اچھا حکمران تھا لیکن اس کے بعد صورت حال پھر بگڑ گئی۔ اس کے جانشین معتضد باللہ نے پچیس سال حکومت کی لیکن سارا زمانہ ہنگاموں اور شورشوں کی نذر ہو گیا۔ یہ حکمران تن آسان، عیش پرست اور شراب و کباب کا رسیا تھا۔ چنانچہ دربار ناچنے اور گانے والیوں کا مرکز بن گیا۔ اس نے دربار کے اخراجات بے حد بڑھا لیے تھے۔ شاہی محل میں گیارہ ہزار خواجہ سرا تھے۔ معتضد اور مکتفی کے زمانے میں سرکاری خزانہ بھرا رہتا تھا۔ لیکن اب یہ حال ہو گیا کہ فوج کی کئی کئی ماہ کی تنخواہ چڑھ جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُمراء نے پھر زور پکڑا اور مقتدر باللہ کو معزول کر کے قتل کر دیا۔

مقتدر باللہ کے عہد کا ایک خاص واقعہ بُلغار میں اسلام کی اشاعت ہے۔ بُلغار روس میں دریائے والگا کے کنارے اس جگہ جہاں اب شہر کازان آباد ہے ترکوں کا ایک ______ شہر تھا۔ یہاں کے حکمران نے اسلام قبول کرنے کے بعد ایک وفد بغداد بھیجا تاکہ وہ بلغار کے علاقہ میں اشاعت اسلام اور مسلمانوں کو تعلیم دینے کے معاملے میں خلیفہ سے مدد طلب کرے۔ مقتدر باللہ نے درخواست قبول کرتے ہوئے ابن فضلان کی قیادت میں ایک جماعت بلغار بھیج دی۔ [1]

مقتدر باللہ کے جانشین اور بھائی قاہر باللہ کے عہد میں مقتدر کے دَور کی عیاشی کے خلاف سخت ردِعمل ظاہر ہوا۔ ناچنے اور گانے والی عورتوں کا پیشہ اور شراب نوشی قانوناً بند کر دی۔ گویوں کو قید اور ہیجڑوں کو جلا وطن کر دیا۔ لیکن یہ ایک جذباتی ردِعمل تھا اس کے پیچھے نہ کوئی فکر کام کر رہی تھی اور نہ کوئی جماعت تھی۔ قاہر باللہ مذکورہ بالا اقدامات کے باوجود نہ شراب چھوڑ سکا اور نہ حسین لونڈیوں کی صحبت ترک کر سکا۔

مسلمانوں کی گرتی ہوئی اخلاقی حالت کے خلاف اسی قسم کا ایک ردِعمل بغداد میں قاہر کے جانشین راضی باللہ کے عہد میں عوامی سطح پر بھی ہوا۔ امام احمد بن حنبل کے پیروؤں نے جو حنبلی کہلاتے تھے عوامی سطح پر احتساب شروع کر دیا۔ وہ فوجی افسروں اور عام لوگوں کے گھروں پر چھاپے مارتے۔ جہاں نبیذ نظر آتی اسے بہا دیتے۔ گانے والی عورتوں کو مارتے، آلاتِ موسیقی توڑ

(1) بلغار دریائے والگا کی وادی میں مسلمانوں کی پہلی مملکت تھی جو تقریباً دو سو سال تک قائم رہی۔

ڈالتے، مردوں کو عورتوں کے ساتھ چلنے سے روکتے۔ لیکن یہ تحریک بھی غیر منظم اور جذباتی نوعیت کی تھی۔ اس کے پیچھے نہ کوئی ٹھوس فکر تھی اور نہ کوئی منظم جماعت۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حنبلیوں کی یہ تحریک اصلاح حنبلیوں اور شافعیوں (امام شافعی کے پیرو) کے جھگڑے میں تبدیل ہو کر ختم ہو گئی۔

مختصر یہ کہ حکمرانوں کی عیش پرستی، امراء کی خودسری اور اخلاقی زوال کے نتیجے میں خلافت کی حدود پھر گھٹنا شروع ہو گئیں۔ راضی باللہ کا جانشیں متقی باللہ اگرچہ اسم با مسمیٰ تھا یعنی اپنے نام کی طرح نیک اور زاہد تھا لیکن اس کے علاوہ اس میں کوئی اور خوبی نہیں تھی۔ نظام حکومت درہم برہم ہو چکا تھا۔ بالآخر مغربی اور جنوبی ایران میں قائم ہونے والی حکومت بنی بویہ کے ایک حکمران معز الدولہ نے ۳۳۴ھ میں بغداد پر قبضہ کر لیا۔ خلافت اب بھی قائم رہی کیونکہ مسلمان خلافت کو اسلامی سیاسی نظام کا لازمی حصہ سمجھتے تھے اور ایک خلیفہ کے بعد دوسرا خلیفہ تخت خلافت پر بیٹھتا رہا لیکن ان خلفاء کو اختیار حاصل نہیں تھا، حکومت دوسروں کی تھی۔

یہ حالت دو سو سال تک رہی اس کے بعد عباسی خلفاء پھر آزاد ہو گئے لیکن ان کی حکومت عراق تک محدود رہی۔ وہ کوئی بڑی سلطنت قائم نہ کر سکے اور جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے عباسی خلفاء کی یہ آزاد حکومت بھی سوا سو سال قائم رہنے کے بعد تاتاریوں کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔

عباسی خلافت کے عروج کا زمانہ ۱۳۲ھ سے ۲۴۷ھ تک ہے۔ اس کے بعد زوال شروع ہو گیا اور ۳۳۴ھ میں بنی بویہ کے ہاتھوں عباسی خلفاء کی خود مختاری ختم ہو گئی۔

خلافتِ عباسیہ

۷۵۰ء/۱۳ھ تا ۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ

عہدِ عروج

خلیفہ	مدت
۱۔ ابوالعباس سفاح	۷۵۰ء/۱۳۲ھ تا ۷۵۴ء/۱۳۶ھ
۲۔ ابوجعفر منصور	۷۵۴ء/۱۳۶ھ تا ۷۷۵ء/۱۵۸ھ
۳۔ محمد مہدی	۷۷۵ء/۱۵۸ھ تا ۷۸۵ء/۱۶۹ھ
۴۔ موسیٰ ہادی	۷۸۵ء/۱۶۹ھ تا ۷۸۶ء/۱۷۰ھ
۵۔ ہارون الرشید	۷۸۶ء/۱۷۰ھ تا ۸۰۹ء/۱۹۳ھ
۶۔ امین الرشید	۸۰۹ء/۱۹۳ھ تا ۸۱۳ء/۱۹۸ھ
۷۔ مامون الرشید	۸۱۳ء/۱۹۸ھ تا ۱۸۳۳ء/۲۱۸ھ
۸۔ معتصم باللہ	۸۳۳ء/۲۱۸ھ تا ۸۴۲ء/۲۲۷ھ
۹۔ واثق باللہ	۸۴۲ء/۲۲۸ھ تا ۸۴۷ء/۲۳۲ھ
۱۰۔ متوکل علی اللہ	۸۴۷ء/۲۳۲ھ تا ۸۶۱ء/۲۴۷ھ

عہدِ زوال

خلیفہ	مدت
۱۱۔ منتصر باللہ	۸۶۱ء/۲۴۷ھ تا ۸۶۲ء/۲۴۸ھ
۱۲۔ مستعین باللہ	۸۶۲ء/۲۴۸ھ تا ۱۸۶۶ء/۲۵۲ھ
۱۳۔ معتز باللہ	۸۶۶ء/۲۵۲ھ تا ۸۶۹ء/۲۵۵ھ
۱۴۔ مہتدی باللہ	۸۶۹ء/۲۵۵ھ تا ۸۷۰ء/۲۵۶ھ
۱۵۔ معتمد علی اللہ	۸۷۰ء/۲۵۶ھ تا ۸۹۲ء/۲۷۹ھ
۱۶۔ معتضد باللہ	۸۹۲ء/۲۷۹ھ تا ۹۰۲ء/۲۸۹ھ
۱۷۔ مکتفی باللہ	۹۰۲ء/۲۸۹ھ تا ۹۰۸ء/۲۹۵ھ

۱۸۔مقتدر باللہ	۹۰۸ء/۲۹۵ھ تا ۹۳۲ء/۲۹۵ھ
۱۹۔قاہر باللہ	۹۳۲ء/۳۲۰ھ تا ۹۳۴ء/۳۲۲ھ
۲۰۔راضی باللہ	۹۳۴ء/۳۲۲ھ تا ۹۴۰ء/۳۲۹ھ
۲۱۔متقی للہ	۹۴۰ء/۳۲۹ھ تا ۹۴۴ء/۳۳۳ھ

عہد محکومی

۹۴۶ء/۳۳۴ھ تا ۱۱۵۲ء/۵۴۷ھ

خودمختاری کا دوسرا زمانہ

۱۱۵۲ء/۵۴۷ھ تا ۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ

باب ۱۱

بغداد کا عروج (۲)

عباسی خلافت کا زمانہ مسلمانوں کے تمدنی اور ثقافتی عروج کا زمانہ ہے۔

عباسی خلافت اگرچہ بنی امیہ کی خلافت کے مقابلے میں کم وسیع تھی کیونکہ اُندلس اور مراکش عباسیوں کے دائرہ اثر سے باہر تھے لیکن اس کے باوجود عباسی خلافت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت یا سیاسی وحدت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ہارون الرشید نے ابر کے ایک ٹکڑے کو گزرتے ہوئے دیکھ کر کہا: ''تو چاہے کہیں چلا جا لیکن برسے گا میری ہی سلطنت کے اندر۔'' یہ کچھ اسی قسم کی بات ہے جیسی موجودہ صدی کے آغاز میں سلطنت برطانیہ کے متعلق کہی جاتی تھی کہ سورج سلطنت برطانیہ میں کہیں نہیں ڈوبتا۔

(۱) بنی عباس کا زمانہ فتوحات کا زمانہ نہیں تھا۔ اس زمانے میں نئے نئے علاقے فتح نہیں ہوئے۔ بات یہ ہے کہ اسلامی حکومت اتنی وسیع ہوگئی تھی کہ اس کا سنبھالنا ہی مشکل تھا۔ دریائے سندھ سے بحر اوقیانوس تک پانچ ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ اُس زمانے میں جب ہوائی جہاز، ریلیں اور موٹریں نہیں تھیں یہ فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ لوگ یا تو پیدل یا گھوڑوں پر سفر کرتے تھے اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک کئی کئی مہینے میں پہنچتے تھے۔ اس زمانے میں بھی اگر دریائے سندھ سے مراکش تک ریل چلنے لگے تو اس گاڑی میں کراچی کے مسافر ایک ہفتے سے پہلے مراکش نہیں پہنچ سکتے۔

اس وسیع و عریض سلطنت میں ترک، پٹھان، سندھی، ایرانی، کرد، عرب، مصری بربر اور اندلسی بے شمار قومیں آباد تھیں۔ اسلام، عیسائیت، بدھ مت، ہندومت، یہودیت وغیرہ تمام مذاہب کے ماننے والے اسلامی مملکت میں تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی وسیع و عریض اور بے شمار لوگوں سے بھری ہوئی سلطنت کو سنبھالنا آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے عباسیوں کی توجہ فتوحات سے زیادہ امن قائم رکھنے کی طرف رہی۔ اس کے علاوہ اب مسلمانوں کا جوش جہاد اور وہ تازہ جوش جو شروع اسلام میں پیدا ہو گیا تھا ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ مسلمان اب سختی کی زندگی کی بجائے شہر کی آرام دہ زندگی

کے عادی ہونے لگے تھے۔ عباسیوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ملک کی خوش حالی میں اضافہ کیا اور علوم وفنون کو ترقی دی۔

عباسی خلافت کی حدود میں عرب، ایرانی، ترک، رومی، مصری، حبشی، بربر اور ہندوستانی غرض بے شمار قومیں آباد تھیں۔ ان تمام قوموں کے میل جول سے ایک نئی تہذیب نے جنم لیا جو اپنے زمانے کی سب سے شائستہ اور ترقی یافتہ تہذیب تھی اور اگرچہ اس میل جول کی وجہ سے مسلمانوں نے غیر اسلامی اثرات بھی قبول کیے لیکن غلبہ اسلامی اقدار کا رہا جس کی وجہ سے یہ تہذیب ایک اسلامی تہذیب کہلاتی ہے۔

ویسے عباسیوں کے زمانے میں بعض سخت لڑائیاں بھی ہوئی ہیں۔ یہ لڑائیاں رومیوں سے ہوئیں۔ پچھلے صفحوں میں بتایا جا چکا ہے کہ مسلمانوں نے شام، مصر اور ایشیائے کوچک کا بڑا حصہ رومیوں سے لے لیا تھا لیکن رومی سلطنت اس طرح ختم نہیں ہوئی تھی جس طرح ایرانیوں کی سلطنت ختم ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں سے ان کی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ عباسیوں کی سلطنت اگرچہ بنی امیہ کے مقابلے میں چھوٹی تھی لیکن ان کا ایک بڑا فوجی کارنامہ ہے کہ انہوں نے رومیوں کو اس قدر شکستیں دیں کہ بالآخر انہوں نے مسلمانوں کی اطاعت کر لی اور ہر سال خراج دینے لگے۔ مسلمانوں کو رومیوں پر اتنا زیادہ غلبہ اموی دور میں بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔

(۲) عباسی خلافت بنی امیہؔ کی طرح ایک خالص عرب خلافت نہیں تھی۔ اس دور میں ایرانی، ترک اور دوسری اقوام بھی مختلف حیثیتوں سے حکومت میں شریک ہو گئیں۔ خلیفہ اور اس کا خاندان عرب تھا، حکومت کے نظم ونسق میں ایرانیوں کا اور فوج میں ترکوں کا غلبہ تھا۔ اگرچہ ان قوموں کو اسلام کے مفاد سے زیادہ خلیفہ کا مفاد متحد کیے ہوئے تھا لیکن اتحاد کی یہ بنیاد اسلام ہی نے فراہم کی تھی اور خلیفہ اسلام ہی کے نام پر کام کرتا تھا۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عباسی خلافت عرب خلافت نہیں بلکہ اسلامی خلافت تھی۔

لیکن اس ظاہری اتحاد اور وحدت کے اندر نسلی، قبائلی اور وطنی عصبیتیں بدستور کام کر رہی تھیں۔ بلکہ یہ عصبیتیں جو بنی امیہ نے بھڑکائیں بنی عباس کے عہد میں پہلے سے بھی شدید تر ہو گئیں۔ عباسیوں نے اپنے مفاد کے لیے عربوں کو عربوں سے لڑوایا اور دوسری طرف عجمیوں کو عربوں کے خلاف بھڑکایا۔

بنی امیہ کے دَور میں ان کے عربی تعصب کی وجہ سے عجمی قوم پرستی (شعوبیت) کی جو آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی، بنی عباس کے زمانے میں وہ پوری قوت سے بھڑک اٹھی اور اس نے صرف عربی عصبیت کے خلاف نہیں بلکہ خود اسلام کے خلاف بھی زندقہ کا ایک محاذ قائم کر دیا۔ یہ محض قوم پرستانہ تحریک نہیں تھی بلکہ اپنے جلو میں زندقہ اور الحاد کے جراثیم بھی لائی تھی۔

شعوبی تحریک کا آغاز تو اس بحث سے ہوا کہ عربوں کو عجمی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے لیکن بہت جلد اس نے عربوں کی مخالفت کا رنگ اختیار کر لیا۔ اور عرب کی مذمت حتیٰ کہ قریش سمیت ان کے ایک ایک قبیلے کی مذمت میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔ انتہا پسند گروہ عربوں سے گزر کر خود اسلام پر حملے کرنے لگے اور عجمی حکام نے ان کی ہمت افزائی کی۔

زندقہ صرف اعتقادی گمراہیوں تک محدود نہ تھا بلکہ عملاً اخلاقی حدود سے آزادی اس کے ساتھ لازم وملزوم تھی۔ شراب، زنا، رشوت، زندقے کے لوازم تھے۔[1]

(۳) عباسی حکومت بھی اموی حکومت کی طرح ملوکیت تھی اور حقیقی معنوں میں خلافت نہیں تھی۔ یہاں بھی باپ کے بعد بیٹا یا اس کا کوئی قریبی عزیز حکمران ہوتا تھا۔ ملوکیت کے خاتمے اور خلافت کے احیاء کی کوشش کا خیال اب مسلمانوں کے سیاسی نظریات سے تقریباً خارج ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دَور میں عمر بن عبدالعزیز کی طرح کسی نے احیائے خلافت کی کوشش نہیں کی۔ اب احیائے خلافت کا مطلب یہ سمجھا جانے لگا کہ اگر نظام ملوکیت میں تبدیلی لائے بغیر حکمرانوں کو اسلامی احکام پر عمل کرنے پر آمادہ کر دیا جائے تو اسے احیائے خلافت کہا جا سکتا ہے۔ عوام میں صحیح اسلامی حکومت کے قیام کی جو خواہش تھی اس سے ابتدائی عباسی خلفاء نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ صحیح اسلامی حکومت قائم کریں گے۔ چنانچہ جب سفاح کے ہاتھ پر کوفہ میں بیعت ہوئی تو سفاح کے علاوہ اس کے چچا داؤد بن علی نے لوگوں کو یقین دلایا کہ:

''ہم اس لیے نہیں نکلے ہیں کہ اپنے لیے سیم وزر جمع کریں یا محلات بنائیں اور نہریں کھود کر لائیں۔ ہمیں جس چیز نے نکالا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا حق چھین لیا گیا تھا اور ہمارے چچا کی

(۱) سید ابوالاعلیٰ مودودی: خلافت وملوکیت۔ نیز ملاحظہ کیجیے تاریخ فقہ اسلامی از محمد خضری (اردو ترجمہ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ) صفحہ ۲۴۶۔

اولاد (آلِ ابی طالب) پر ظلم کیا جا رہا تھا اور بنی اُمیہ تمہارے درمیان بُرے طریقوں پر چل رہے تھے، تمہارے بیت المال میں بے جا تصرف کر رہے تھے۔ اب ہم پر تمہارے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ اور حضرت عباسؓ کا ذمہ ہے کہ ہم تمہارے درمیان اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سیرت کے مطابق حکومت کریں گے۔ [1]

لیکن عدل پر مبنی اسلامی حکومت قائم کرنے کا یہ وعدہ صرف وعدہ ہی رہا۔ بنی عباس نے بنی امیہ سے جس ظالمانہ طریقہ سے انتقام لیا وہ ایسا فعل ہے جو کبھی اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ خراسان کے فقیہہ ابراہیمؒ بن میمون نے عباسیوں کا اس لیے ساتھ دیا تھا کہ انہوں نے کتاب وسنت کے مطابق حکومت قائم کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن جب عباسیوں کی کامیابی کے بعد انہوں نے ابو مسلم خراسانی سے حدود اللہ کے قیام کا مطالبہ کیا اور کتاب وسنت کے خلاف کام کرنے پر ٹوکا تو ابو مسلم نے ان کو قتل کرا دیا۔ [2]

اس میں شک نہیں کہ بعد کے عباسی حکمرانوں نے اسلامی اقدار کے فروغ کے لیے کام کیا۔ اسلامی قانون کے نفاذ میں دلچسپی لی لیکن اس حکومت کی بھی بنیادی خرابی یہی تھی کہ وہ ملوکیت تھی۔ اُن کے ہاتھوں جو انقلاب ہوا اس سے صرف حکمران ہی بدلے، طرزِ حکومت نہ بدلا۔ انہوں نے اُموی دَور کی کسی ایک خرابی کو بھی دُور نہیں کیا بلکہ ان تمام تغیرات کو جُوں کا تُوں برقرار رکھا جو خلافتِ راشدہ کے بعد ملوکیت کے آ جانے سے اسلامی نظام میں رُونما ہوئے تھے۔ بادشاہی کا طرز وہی رہا جو بنی امیہ نے اختیار کیا تھا۔ فرق صرف یہ ہوا کہ بنی امیہ کے لیے قسطنطنیہ کے قیصر نمونہ تھے تو عباسی خلفاء کے لیے ایران کے کسریٰ۔ [3]

اب ہر بات کا انحصار بادشاہ کے طرزِ عمل پر تھا۔ بادشاہ جتنا اچھا اور برا مسلمان ہوتا تھا، اس کے اقدامات میں اسی نسبت سے اسلام کی جھلک نظر آتی تھی۔ خاندانی بادشاہت کا تصور اب پوری طرح چھا گیا تھا۔ منصور اور نفس ذکیہ میں خلافت کے حق کے مسئلہ پر جو طویل خط وکتابت ہوئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈیڑھ سو سال کے اندر اندر مسلمانوں کی ذہنیت میں کتنا انقلاب آ گیا تھا۔

---

(۱) خلافت وملوکیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۱۹۲ مطبوعہ لاہور دسمبر ۱۹۶۶ء

(۲) خلافت وملوکیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی، صفحہ ۱۹۴

(۳) خلافت وملوکیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی، صفحہ ۱۹۵۔

خاندان، قبیلہ اور نسل پر فخر، جس کی اسلام نے جڑ کاٹ دی تھی، اب وہی جاہلی عصبیتیں پھر اُبھر آئی تھیں۔ اس خط وکتابت سے ظاہر ہوتا ہے کہ دعوت حق کسی کا مقصد نہیں تھا۔ دونوں فریقوں نے سب سے زیادہ زور اپنے اپنے خاندان کی عظمت اور بزرگی ثابت کرنے پر دیا۔ منصور کو اگر ہم نظر انداز بھی کر دیں تو بھی تعجب ہوتا ہے کہ محمد بن عبداللہ (المعروف بہ نفس ذکیہ) جو حضرت حسنؓ کی اولاد میں سے تھے وہ اس فتنہ کا کس طرح شکار ہو گئے۔ حالانکہ ایک وقت وہ تھا جب حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ بن جانے پر ابوسفیان نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ کہہ کر ورغلانا چاہا کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان کا حق مار لیا ہے تو حضرت علیؓ نے جواب دیا تھا کہ:

''تمہاری یہ بات اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی پر دلالت کرتی ہے۔''[1]

(۴) عباسی دَور کے معاشرے پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ علماء کے اثر و رسوخ اور مذہب سے دلی لگاؤ کے باوجود معاشرے میں غیر اخلاقی اور غیر صحت بخش سرگرمیوں میں اموی دَور کے بعد مزید اضافہ ہوا۔ قبل از اسلام کے ایران میں کاہن، رمال اور نجومیوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ نہ صرف عوام الناس ان سے اپنی تقدیر کا حال معلوم کرتے تھے بلکہ بادشاہ اور علماء بھی اپنے فیصلے نجومیوں کے مشورے کے بغیر نہیں کرتے تھے۔ مختلف چیزوں سے اچھے بُرے شگون لیے جاتے تھے۔ اسلام نے یہ کہہ کر کہ اللہ کے علاوہ تقدیر کا حال کوئی نہیں بتا سکتا، نجومیوں اور رمالوں کے پیشہ پر کاری ضرب لگائی تھی۔ لیکن جب عباسی خلافت پر ایرانیوں کا اثر بڑھا تو نجومیوں اور رمالوں کا یہ کاروبار پھر چمک اٹھا اور یہ وبا اسلامی دنیا میں ایسی پھیلی کہ اب تک اس کے اثرات موجود ہیں۔

غلامی کا رواج اس دَور میں بھی تھا۔ اگرچہ اسلام میں صرف جنگ کی صورت میں غلام بنانے کی اجازت تھی، لیکن اب اس دَور میں نظام غلامی نے باقاعدہ کاروبار کی صُورت اختیار کر لی اور محض غلام حاصل کرنے کے لیے سرحدی علاقوں میں چھاپے مارے جانے لگے۔ غلاموں کے کاروبار اور تجارت میں یہودی سب سے آگے تھے لیکن اب خود مسلمانوں نے بھی اس کاروبار کو اختیار کر لیا جو اسلامی رُوح کے قطعی خلاف تھا۔ اب تمام بڑے اسلامی شہروں میں باقاعدہ بازار

(۱) خلافت وملوکیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ صفحہ ۹۷۔

لگنے لگے جہاں لونڈی غلاموں کی فروخت ہوتی تھی۔ بہرحال غلامی کے رواج کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ غلاموں سے وہ بدسلوکی نہیں کی جاتی تھی جس کی مثالیں روما کی قدیم تاریخ اور امریکہ کی جدید تاریخ میں ملتی ہیں۔ غلاموں سے بدسلوکی تو درکنار اسلامی دنیا میں حُسنِ سلوک کیا جاتا تھا اور یہ غلام اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر پہنچتے تھے اور لونڈیاں حکمرانوں کی مائیں بن جاتی تھیں۔ مامون الرشید اور معتصم جیسے عظیم حکمران لونڈیوں کے بطن سے تھے۔

موسیقی اور مصوری نے بھی سرکاری سرپرستی میں اس دَور میں ترقی کی۔ جان دار مخلوق کی تصویر بنانا، بُت پرستی سے مشابہت ہونے کی وجہ سے اسلام نے ممنوع قرار دیا تھا۔ اسی لیے مسلمان صناعوں اور فن کاروں نے اپنے ذوق جمال کے اظہار کے لیے تصویر کشی کی بجائے خوش نویسی کرنے، بیل بوٹے اور نقش ونگار بنانے کی طرف زیادہ توجہ دی۔ عباسی خلافت کے بعد اس فن نے بڑا عروج حاصل کیا اور مسلمانوں کا مخصوص فن بن گیا۔ لیکن عباسی دَور میں اموی دَور کی طرح اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ انسانی تصویر کشی کا مسلمانوں میں آغاز ہوگیا۔ ہم یہ نہیں جانتے کہ یہ تصویریں مسلمان بناتے تھے یا غیر مسلم لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے ان کو ناپسند نہیں کیا۔

عباسی دَور میں تصویر کشی سے زیادہ جس غیر اسلامی فن نے فروغ پایا وہ موسیقی تھی۔ شراب، موسیقی اور عورت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ غیر اسلامی معاشرے میں ان تین چیزوں کے بغیر زندگی بے لطف سمجھی جاتی ہے۔ مسلمان حکمرانوں نے ان میں سے سب سے پہلے موسیقی کی طرف توجہ دی اور پھر اس کے بعد نبیذ کے بہانے شراب اور لونڈی کے پردے میں عورت کی خواہش پوری کرنے کی کوشش کی۔ بہرحال عباسی دَور میں شراب نوشی اتنی محدود تھی کہ ہم اس دَور کے معاشرے کو یورپ اور امریکہ کی طرح شرابی معاشرہ نہیں کہہ سکتے اور زنان بازاری کی لعنت سے بھی مسلم معاشرہ ابھی تک پاک تھا لیکن موسیقی اپنی ساری دلکشیوں کے ساتھ دربار میں خاص طور پر اور امراء اور رؤسا کے حلقوں میں عام طور پر رواج پاچکی تھی۔[1] ابراہیم موصلی (۷۴۲ء تا ۸۰۴ء) اور اسحاق موصلی (۷۶۷ء تا ۸۵۰ء) اس دَور کے سب سے بڑے موسیقار تھے۔

---

(۱) اس جگہ یہ حقیقت پیش نظر رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں میں غیر اسلامی رسوم اور عادات زیادہ تر شاہی دربار کے راستہ سے آئے۔ اگر خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت کا نظام قائم نہ ہوتا تو حکومت پر عوام کی گرفت مضبوط ہوتی اور جمہور کے آگے جواب دہی کے خوف سے حکمران غیر اسلامی طور طریقے آسانی سے اختیار نہیں کرسکتے تھے۔

اسحق موصلی کے بارے میں معتصم کہا کرتا تھا کہ جب اسحق گاتا ہے تو اُسے اتنی مسرت ہوتی ہے جیسے کوئی نیا ملک فتح ہو گیا ہو۔

اس دَور کی خواتین میں دو نام سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ایک ہارون الرشید کی بیوی ملکہ زبیدہ جو امین الرشید کی ماں تھی اور دوسری سیدہ نفیسہ (متوفیہ ۸۲۴ء) جو مصر کی ایک عابدہ اور زاہدہ خاتون تھیں۔رابعہ بصری کے ساتھ جو اموی دَور میں تھیں۔مسلمان سیدہ نفیسہ کو بھی اولیاء اللہ کے مرتبہ کی ہستیاں سمجھتے ہیں۔ملکہ زبیدہ (۷۶۲ء تا ۸۳۱ء) نے اپنے رفاہی کاموں کی وجہ سے بڑا نام پیدا کیا۔مکہ معظمہ کی مشہور ''نہر زبیدہ'' جس کی وجہ سے مکہ میں پانی کی ضرورت صدیوں تک پوری ہوتی رہی اور اب بھی پوری ہوتی ہے اسی انسان دوست خاتون کی کوششوں سے تعمیر ہوئی۔

(۵) عباسی دَور کا نظام حکومت بڑی حد تک وہی تھا جو بنی امیہ کے زمانہ میں تھا۔صرف ایک بڑی تبدیلی ہوئی تھی اور وہ یہ کہ وزیر کا نیا عہدہ قائم کیا گیا تھا جو اموی دَور میں نہیں تھا۔اب وزیر، سلطنت کے تمام کاموں کا ذمہ دار ہوتا تھا اور وہ صرف خلیفہ کے آگے جواب دہ ہوتا تھا۔ کاتب اور حاجب کے عہدے اس دَور میں بھی قائم رہے۔احتساب کا محکمہ بھی قائم تھا۔عام طور پر اس محکمہ کا سربراہ صاحبِ شرطہ کہلاتا تھا جسے جدید اصطلاح میں انسپکٹر جنرل پولیس کہا جا سکتا ہے۔ امن قائم رکھنے کے علاوہ عوام کے اخلاق کردار کی نگرانی، منڈیوں اور بازار کے بھاؤ کی دیکھ بھال اور ناپ تول کی نگرانی بھی صاحب شرطہ کی ذمہ داری تھی۔شراب نوشی، جوا اور اسی قسم کی دوسری معاشرتی خرابیوں کی روک تھام بھی صاحب شرطہ کے فرائض میں داخل تھی۔

پوری مملکت مختلف صوبوں میں تقسیم تھی جن کی حدود بدلتی رہتی تھی۔اس دَور میں پہلی مرتبہ مرکزی خلافت کے تحت نیم خود مختار حکومتیں بھی قائم کی گئیں۔ان میں شمالی افریقہ کی اغلبی حکومت تھی جس کا مرکز قیروان تھا اور دوسری خراسان کی طاہری حکومت تھی جس کا مرکز نیشاپور تھا۔[1]

نظام عدالت بھی تقریباً وہی تھا جو اموی دَور میں تھا۔عباسی دَور کے قاضیوں نے بھی

---

(۱) اس حکومت کا بانی مامون الرشید کا ایرانی سپہ سالار طاہر تھا جس کو مامون الرشید نے ۲۰۵ھ میں خراسان کا مستقل والی مقرر کیا تھا۔طاہر کے بعد اس کی اولاد حکمران ہوئی۔متوکل کے انتقال کے بعد اس حکومت نے خود مختاری حاصل کر لی تھی۔طاہری خاندان کے حکمرانوں میں طاہر کے لڑکے عبداللہ نے اپنی سخاوت، تدبر، دانش مندی اور رعایا پروری کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی۔عبداللہ بن طاہر اپنے کارناموں کے لحاظ سے برامکہ سے کسی طرح کم نہیں۔طاہری حکومت ۲۵۹ھ میں ختم ہو گئی۔

انصاف اور عدل کے دامن کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ حکمران حتی الامکان قاضیوں کے فیصلہ میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔ مہدی نے اپنے محل میں ایک جداگانہ عدالت قائم کی تھی اور عام اعلان کرادیا تھا کہ جس کے ساتھ کوئی بے انصافی ہوئی ہو وہ اس کے سامنے مقدمہ پیش کرے۔ ایک مرتبہ قاضی نے خود مہدی کے خلاف بھی فیصلہ دیا تھا۔ ہارون الرشید کے زمانہ میں عدالتی نظام نے اس وقت زیادہ باقاعدہ شکل اختیار کرلی جب قاضی ابو یوسف کو خلیفہ کی پوری مملکت کا قاضی القضاۃ یعنی چیف جسٹس بنایا گیا اس وقت سے قاضیوں کے لیے ایک مخصوص لباس جو جبہ اور عمامہ پر مشتمل تھا مقرر کردیا گیا۔

فوجی تنظیم بھی بڑی حد تک اموی دَور کی طرح تھی۔ ہر دس سپاہی پر ایک عریف اور سو پر ایک قائد ہوتا تھا۔ سو سپاہیوں کا دستہ جماعت اور دس جماعتوں پر مشتمل تنظیم کردوس کہلاتی تھی۔ فوجی تنظیم اور فوج کی تعداد معتصم کے زمانہ میں عروج پر پہنچی۔

نیزہ، تلوار، تیر کمان، خود، زرع اور منجنیق خاص ہتھیار تھے۔ محاصرہ کے وقت منجنیق کے علاوہ جو گاڑیاں استعمال کی جاتی تھیں وہ عرادے، دبابے اور کباش کہلاتی تھیں۔ ان کو قلعہ یا فصیل کے دروازوں کو ٹکر مار کر توڑنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ محاصرہ کے دوران پچکاریوں سے ایک قسم کا تیل بھی جو نفط کہلاتا تھا پھینکا جاتا تھا اس کے بعد انگارے اور آگ پھینکی جاتی تھی جس سے دشمن کی قلعہ بندیوں میں آگ لگ جاتی تھی۔ انجینئروں کی ایک بڑی جماعت جو مہندسین کہلاتی تھی ہر محاصرہ میں فوج کے ساتھ ہوتی تھی۔ اسلحہ اور گھوڑے عام طور پر سرکاری خزانہ سے فراہم کیے جاتے تھے۔

(۶) اسی دَور میں زراعت نے بھی ترقی کی۔ بنوعباس کا زرعی نظام بھی قریب قریب وہی تھا جو اموی دَور میں تھا۔ یعنی زمینوں کا بہت بڑا حصہ خلیفہ، شاہی خاندان، وزیروں اور امیروں کے قبضہ میں تھا۔ سرکاری خدمات کے معاوضہ میں زمینیں جاگیر کی شکل میں دے دی جاتی تھیں۔ مہدی کے زمانہ میں محکمہ پیمائش و بندوبست قائم ہوا اور پوری مملکت کی زمینوں کی پیمائش کی گئی۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ کسانوں کے ساتھ زیادتی نہ ہوسکے، ان پر ٹیکس زیادہ نہ ہو اور اس کی وصول میں جبر اور ظلم سے کام نہ لیا جائے۔ ہارون الرشید نے قاضی ابو یوسف سے کتاب الخراج اسی مقصد کے تحت لکھوائی تھی۔ مصر اور عراق میں اس وقت دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام قائم تھا۔ جس طرح مصر کو تحفہ نیل کہا جاتا ہے اسی طرح عراق دجلہ اور فرات کا عطیہ ہے۔ چنانچہ مقدسی نے

لکھا ہے کہ:

''عراق بذاتِ خود کوئی زرخیز یا وسائل سے بھرپور مملکت نہیں ہے۔ اس کی عظمت اور خوشحالی کا دارومدار دجلہ اور فرات اور بحرِ ہند سے ہونے والی تجارت پر ہے''

عراق اور مصر کے اس نہری نظام کی عباسی دور میں نہ صرف حسبِ سابق پوری پوری دیکھ بھال کی گئی بلکہ نئی نئی نہریں نکال کر اس کی توسیع بھی کی گئی۔ مصر اور عراق کے علاوہ خوزستان، سیستان اور مرو کے قریب دریائے مرغاب کی وادی میں بھی نہری آبپاشی کا بہترین نظام قائم تھا جس نے ان علاقوں کو عراق اور مصر کی طرح دنیا کے انتہائی سرسبز وشاداب اور زرخیز خطوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ بصرہ اپنی کھجوروں کے لیے اور خوزستان اپنے گنے اور شکر کے لیے ساری دنیا میں مشہور تھا۔ لیموں اور سنگترے کی کاشت اسی زمانے میں اسلامی دنیا میں شروع ہوئی۔ یہ پھل ہندوستان سے لائے گئے تھے۔

(۷) چوتھی صدی ہجری کے مشہور سیاح مقدسی نے عراق کے بارے میں، جو خلافتِ عباسیہ کا قلب تھا، لکھا ہے:

''یہ خوش پوش اور شائستہ لوگوں کا ملک اور علماء کا مرکز ہے۔ اس میں وہ عظیم الشان شہر بصرہ ہے جس کو دنیا کہا جاتا ہے۔ یہیں بغداد ہے جس کی سارے عالم میں تعریف کی جاتی ہے۔ یہیں کوفہ اور سامرا جیسے اہم اور حسین شہر بسائے گئے۔ عراق میں قابل فخر چیزیں اتنی ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔''[1]

عراق بلکہ اسلامی دنیا کا سرتاج دارالخلافہ بغداد تھا۔ جس کو مدینۃ السلام یعنی سلامتی کا شہر کہا جاتا تھا۔ مقدسی نے بغداد کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''یہاں کے باشندے خوش لباس اور شائستہ ہیں۔ ان کا ذہن رسا اور فکر نازک ہے۔ ان میں علم کی گہرائی ہے۔ ہر بڑھیا اور عمدہ چیز یہاں ہے۔ ہر فن اور علم کے ماہر یہاں سے نکلتے ہیں۔ یہ شہر ہر قسم کی نفاست، سلیقہ اور فیشن کا گھر ہے''

خلیفہ منصور نے شہر کو دجلہ کے مغربی کنارے پر گول دائرہ کی شکل میں آباد کیا تھا۔ چاروں

---

(۱) اندازہ کیا گیا ہے کہ عباسی خلافت کے عروج کے زمانہ میں بغداد کی آبادی ۲۵ لاکھ تھی اور یہ دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔

طرف فصیل تھی جس میں چار دروازے تھے۔ یعنی باب الکوفہ، باب البصرہ، باب الشام اور باب الخراسان۔ شہر ایک باقاعدہ نقشہ کے تحت آباد کیا گیا تھا۔ وسط میں شاہی محل اور جامع مسجد تھی اور یہاں سے ہر سمت میں سیدھی سیدھی سڑکیں نکلتی تھیں۔ بعد میں شہر مشرقی کنارے پر بھی پھیل گیا۔ شہر کے دونوں حصوں کو ملانے کے لیے دریا پر کشتی کے کئی پُل تھے۔ نہروں کی کثرت کی وجہ سے پانی کی فراوانی تھی اور باغوں کی کثرت۔ جہاں نہروں کے گندے ہونے کا امکان تھا وہاں ان کو اوپر سے ڈھک دیا گیا تھا۔ کرخ کا محلہ جو چار میل لمبا اور دو میل چوڑا تھا نہ صرف بغداد کا بلکہ دنیا کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ یہاں ہر پیشے کے بازار الگ الگ تھے۔ کاغذ اور کتابوں کے بازار بھی تھے۔

بغداد میں کپڑے کی صنعت عروج پر پہنچ گئی تھی۔ یہاں کے کاریگر مختلف رنگوں کے ریشمی کپڑے، باریک ململ اور اُونی چادریں بنانے میں نامور تھے۔ ململ نفاست اور باریکی میں اپنی مثال آپ تھی۔ یہ مثل عام تھی کہ اگر کسی کو نفیس اور باریک کپڑے مطلوب ہوں تو وہ عراق پہنچے۔ زیور، چمڑے، خوشبودار تیل، عطر، صابن اور شیشہ کی صنعت نے بغداد میں خاص طور پر ترقی کی تھی۔ [1]

بغداد میں باغوں کی کثرت، شاندار محلات اور کوٹھیوں کے علاوہ پولو کھیلنے کا میدان بھی تھا۔ اور بعد میں ایک چڑیا گھر بھی بن گیا تھا۔ دریا کے کنارے چونکہ ٹھنڈ رہتی تھی اس لیے کشتی کی سیر امراء اور عوام کی خاص دلچسپی تھی۔ امیر لوگ گرمیوں کا زمانہ تہ خانوں میں گزارتے تھے۔ پانی ٹھنڈا کرنے کے لیے برف بھی استعمال کیا جاتا تھا جو شمال کے پہاڑوں سے لایا جاتا تھا۔

کوفہ: ریشمی، سُوتی اور اُونی کپڑے کے لیے مشہور تھا۔ خصوصاً یہاں کے عمامے یعنی پگڑیاں سارے عالم اسلام میں پسند کی جاتی تھیں۔ آلات موسیقی، اسلحہ سازی، زیور اور چمڑے کی صنعت بھی ترقی پر تھی۔ خزف سازی یعنی مٹی کے ظروف اور گلدان کی صنعت جن پر طرح طرح کے بیل بوٹے بنے ہوتے تھے کوفہ کی خاص صنعت تھی۔ مقدسی نے لکھا ہے کہ:

''یہاں کا پانی اچھا، عمارتیں خوشنما، بازار شاندار اور ارد گرد کھجور اور پھلوں کے باغ ہیں اور سب سے صحیح عربی کوفہ میں بولی جاتی ہے۔''

---

(۱) عباسی دور میں عراق کی صنعتی اور زراعتی ترقی کے لیے دیکھیے ''تہذیب وتمدن اسلامی'' از رشید اختر ندوی۔

عباسی خلافت کے عروج زمانہ میں کوفہ کا شہر بغداد کا ہم پلہ سمجھا جاتا تھا۔

بصرہ: کے متعلق مقدسی نے لکھا ہے:

''یہ شہر نہر ابلہ کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ مجھے بغداد کی نسبت بصرہ زیادہ پسند ہے کیونکہ یہاں معاشی آسانیاں زیادہ ہیں۔ حمام اچھے ہیں، علوم وفنون ترقی پر ہیں اور تجارت فروغ پر ہے''

بصرہ دراصل بین الاقوامی تجارت کا مرکز تھا۔ مشرق کا تمام سامان تجارت بصرہ کے راستے عراق میں آتا تھا۔ یہاں کے تاجر دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے تھے۔ وہ تمام چیزیں جن کے لیے کوفہ مشہور تھا بصرہ میں بھی بنائی جاتی تھیں۔

عراق کی دوسری صنعتیں جو بغداد، بصرہ اور کوفہ تقریباً ہر شہر میں موجود تھیں حسب ذیل تھیں:

قالین سازی: قالین اونی ہوتے تھے جن میں ریشم کی ملاوٹ ہوتی تھی۔ یہ قالین فرش پر بچھانے کے علاوہ دیواروں پر لٹکائے بھی جاتے تھے۔ قالینوں پر بیل بوٹوں کے علاوہ جانوروں کی تصویریں بنانے کا رواج بھی ہوگیا تھا۔

شیشہ سازی: آئینہ سازی اور شیشہ کے برتنوں کی صنعت نے بھی عباسی دَور میں بڑی ترقی کی۔ برتنوں پر جانوروں کی تصاویر اور مناظر بھی بنائے جاتے تھے۔ اگرچہ شیشہ سازی کا سب سے بڑا مرکز شام تھا لیکن عراق میں بھی یہ صنعت ترقی پر تھی اور یہاں کے بنائے ہوئے قندیل، جھاڑ فانوس اور جام دُور دُور جاتے تھے۔

لوہے کی صنعت میں اسلحہ سازی کے علاوہ کرسی، برتن، ترازو، باٹ، صندوق، چُھری چاقو، سائنس اور ریاضی کے آلات شامل تھے۔ موصل زنجیر، چاقو اور چھری کی صنعت کے لیے اور حرّان ریاضی اور سائنس میں کام آنے والے آلات اور اصطرلاب اور ترازو بنانے کے لیے خاص طور پر مشہور تھے۔

لکڑی کی صنعت میں کشتی سازی سب سے اہم حیثیت رکھتی تھی۔ عراق کے بڑھئی چھتیس (۳۶) مختلف قسم کی کشتیاں بناتے تھے۔ اُبلہ کشتی سازی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔

عراق کے شہروں کے علاوہ قیروان، اسکندریہ، فسطاط، دمشق، اصفہان، رے نیشاپور، ہرات، بخارا، خوارزم اور سمرقند بھی بڑے بڑے شہر تھے۔ جن میں سے بعض بصرہ اور کوفہ سے کم

نہیں تھے۔ یہ تمام شہر صنعت و حرفت اور تجارت کا مرکز تھے اور عباسی دَور میں اُن میں علمی سرگرمیاں بھی پورے زور شور سے شروع ہوگئی تھیں۔

(۸) دجلہ اور فرات تجارتی شاہراہوں کا کام کرتے تھے۔ بصرہ اگرچہ عراق کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی لیکن بڑے سمندری جہاز براہ راست بغداد تک جاسکتے تھے۔ اس کے بعد چھوٹی کشتیاں استعمال ہوتی تھیں۔ جو جہاز چین جاتے تھے وہ زیادہ بڑے ہوتے تھے۔ ان کے پیندے کی سطح پانی سے اتنی بلند ہوتی تھی کہ ان پر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں استعمال ہوتی تھیں جن میں دس دس قدمچے ہوتے تھے۔

روم، چین اور ہندوستان سے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ ہندوستان سے ہاتھی دانت، آبنوس کی لکڑی اور صندل اور چین سے کاغذ، دوات، سونے چاندی کے برتن اور ریشمی کپڑے درآمد کیے جاتے تھے۔ شمال کے علاقوں یعنی روس، قفقاز اور آرمینیہ سے تجارت کا مرکز موصل کا شہر تھا۔ اس شہر کے بارے میں مقدسی نے لکھا ہے کہ:

''یہاں کی عمارتیں خوش وضع، ہوا اچھی، پانی عمدہ بازار اچھے اور سرائیں آرام دہ ہیں۔ متعدد تفریح گاہیں ہیں۔''

موصل زنجیر، چاقو چھری اور پھل اور اچار مربع کی صنعت میں مشہور تھا۔

بحری تجارت کا ایک دوسرا بڑا مرکز سیراف کی بندرگاہ تھی۔ یہ شہر عباسی دَور میں اتنا آباد اور عمارتیں اتنی خوشنما اور بازار اتنے خوبصورت تھے کہ لوگ سیراف کو بصرہ پر ترجیح دیتے تھے۔ ساگون اور اینٹ کی بنی ہوئی اونچی اونچی کوٹھیاں تھیں جن میں ایک ایک کی قیمت پچاس پچاس ہزار روپے سے زیادہ تھی۔ سیراف کی بندرگاہ چین سے آنے والے جہازوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔

جزیرہ نمائے عرب میں عدن اور صحار کے بندرگاہ بڑے اہم تھے۔ عدن ملک یمن کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ یہاں سے جہاز ایک طرف ہندوستان اور چین تک اور دوسری طرف مشرقی افریقہ کے جنوبی بندرگاہوں تک جاتے تھے۔ باہر سے آنے والا سامان حجاز کے راستے یا بحیرہ احمر کے راستہ مصر اور پھر وہاں سے مراکش تک جاتا تھا۔ مقدسی نے لکھا ہے کہ:

''عدن ایک خوشحال شہر ہے۔ یاقوت، چمڑے، چیتے کی کھالوں اور غلاموں کی منڈی ہے۔ یہاں ایک خاص قسم کا کپڑا بنتا ہے''

بندرگاہ صحار کے متعلق مقدسی نے لکھا ہے کہ:

''بحر ہند کے کنارے اس سے زیادہ عظیم الشان شہر دوسرا نہیں۔ یہاں دولت اور تجارت یمن کے شہر زبید اور صنعا سے زیادہ ہے۔ مکانات اینٹ اور ساگون کے ہیں۔ بازار بارونق ہیں۔ ہندوستان اور چین کے جہاز یہاں آتے ہیں۔ شہر میں ایک نہر ہے۔ قحط کے زمانے میں یمن کی غلہ کی ضرورت اسی شہر سے پوری کی جاتی ہے۔ ایرانی چھائے ہوئے ہیں اور فارسی عام زبان ہے۔''

(۹) علوم وفنون اور تصنیف وتالیف جس کا آغاز بنی امیہ کے دَور میں ہوگیا تھا اس دور میں اپنے عروج کو پہنچ گئے۔ یونانی، فارسی، سریانی اور سنسکرت سے کتابوں کے بکثرت ترجمے کیے گئے۔ اس دَور میں تصنیف وتالیف کی کثرت کی ایک وجہ یہ تھی کہ مسلمان کاغذ بنانے کے فن سے واقف ہوگئے تھے۔ یہ فن انہوں نے ان چینی قیدیوں سے سیکھا جو بنی امیہ کے زمانے میں سمرقند کی فتح کے وقت ۷۰۴ھ میں گرفتار ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کتابیں جھلیوں، کھالوں، اور مختلف قسم کے پتوں پر لکھی جاتی تھیں۔

مزید مطالعہ کے لیے کتابیں

۱۔ تاریخ اسلام حصہ سوم و چہارم از شاہ معین الدین احمد ندوی۔

۲۔ تاریخ اسلام حصہ دوم از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

۳۔ تہذیب و تمدن اسلامی حصہ سوم از رشید اختر ندوی۔

۴۔ خلافت و ملوکیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

۵۔ المامون از شبلی نعمانی۔

۶۔ سیرت ائمہ اربعہ از رئیس احمد جعفری۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے تفصیلی حالات کے مطالعہ کے لیے شبلی کی سیرۃ النعمان اور ابوزہرہ مصری کی کتابوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے جن کا اردو میں ترجمہ ہوگیا ہے۔

۷۔ البرامکہ از عبدالرزاق کانپوری۔ اگرچہ خاندان برمکہ کی تاریخ ہے لیکن اس میں ہارون الرشید کے دَور کی تاریخ بھی آ گئی ہے۔ ابتدائی عباسی دَور کے مطالعہ کے لیے اچھی کتاب ہے۔

۸۔ تاریخ ادب عربی از احمد حسن زیات (اردو ترجمہ از عبدالرحمان طاہر سورتی)

۹۔ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول از سید ابوالحسن علی۔

باب ۱۲

علم وادب کی دُنیا

بنی عباس کے حالات پڑھنے سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ زمانہ فتوحات اور ملک گیری کا زمانہ نہیں تھا بلکہ تمدنی علمی اور ادبی ترقی کا زمانہ تھا۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ بنی عباس کا زمانہ ملکی فتوحات کا زمانہ نہیں تھا بلکہ علمی اور تمدنی فتوحات کا زمانہ تھا۔ بغداد کی عظمت تاریخ میں اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ ہارون الرشید اور مامون الرشید جیسے حکمرانوں کا دارالخلافہ تھا بلکہ بغداد کی عظمت اس لیے ہے کہ وہ اپنے زمانے میں علم وفن اور تہذیب وتمدن کا دنیا میں سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس زمانے کے علماء جب تک بغداد آ کر وہاں کے علماء سے تعلیم حاصل نہیں کرتے تھے وہ اپنے علم کو نامکمل سمجھتے تھے۔ یہاں دنیائے اسلام کے دُور دراز حصوں سے عالم، ادیب اور شاعر علم حاصل کرنے بھی آتے تھے اور اس لیے بھی آتے تھے کہ ان کی یہاں قدر کی جاتی تھی۔

بغداد کے علاوہ بصرہ اور کوفہ کے شہر بھی اس زمانے میں علم کے بہت بڑے مرکز تھے۔ مصر میں ایسا ہی ایک مرکز فسطاط تھا۔ بنی عباس کے آخری زمانے میں قیروان، رے، نیشاپور، مرو اور بخارا بھی علم وادب کے بڑے مرکز بن گئے تھے۔

دینی علوم

اسلامی حکومت کا جب آغاز ہوا تو شروع شروع میں تعلیم زبانی ہوتی تھی۔ بنی اُمیہ کے آخری زمانے سے کتابوں کے لکھنے کا کام شروع ہو گیا لیکن تصنیف وتالیف کا کام بنی عباس کے زمانے میں پورے زور وشور سے شروع ہوا۔ مسلمان علماء نے سب سے پہلے دینی علوم کی طرف توجہ کی۔ قرآن مجید کی تفسیریں لکھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اور باتیں جو حدیث کہلاتی ہیں جمع کیں۔ پھر فقہ کی کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ جب کوئی نیا مسئلہ پیش آئے تو قرآن اور حدیث کی روشنی میں اس کو کس طرح حل کیا جائے۔ فقہ کے عالم کو فقیہہ اور حدیث کے عالم کو محدث کہا جاتا ہے۔ تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ تاریخ، ادب اور شاعری پر بھی

کتابیں لکھی گئیں اور آخر میں فلسفہ، ہئیت، ریاضی اور طب وغیرہ پر کتابیں لکھی گئیں۔ یہ علوم مسلمانوں کے لیے نئے تھے اس لیے پہلے ان علوم پر دوسری زبانوں میں جو کتابیں تھیں ان کا ترجمہ کیا گیا۔ پھر مسلمانوں نے خود مستقل کتابیں لکھیں۔

عباسی دَور میں جو عالم اور ادیب پیدا ہوئے ان پر مسلمانوں کو فخر ہے اور وہ اتنے بڑے ہیں کہ آج تک ان کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ ہمیں آج اسلام کے متعلق جو معلومات ہیں وہ ان ہی کی لکھی ہوئی کتابوں سے ہیں اور تمام اسلامی علوم کی بنیاد یہی کتابیں ہیں۔

فقہ اسلامی یا قانون اسلامی کی تدوین اور احادیث کے مستند مجموعوں کی ترتیب و تالیف عباسی دَور کا عظیم ترین علمی کارنامہ ہے۔ وہ چار مدارس فقہ جن کو مذہب کہا جاتا ہے اور جنہوں نے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی اسی دَور سے تعلق رکھتے ہیں فقہ حنفی، فقہ مالکی، فقہ شافعی اور فقہ حنبلی۔ ان کے علاوہ فقہ جعفری بھی جس پر اثنا عشری شیعہ عمل کرتے ہیں اسی زمانہ میں مدون ہوا۔ مدارس فقہ کو مرتب کرنے والے علماء حسب ذیل ہیں:

امام ابوحنیفہؒ (۶۹۹ء/۸۰ھ تا ۷۶۷ء/۱۵۰ھ)

نعمان بن ثابت جو امام ابوحنیفہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ کوفہ کے رہنے والے تھے اور کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ انہوں نے جو فقہی قوانین مرتب کیے وہ ''فقہ حنفی'' کے نام سے مشہور ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ بڑے خوش اخلاق تھے اور دولت مند بھی تھے۔ وہ اپنی دولت سے شاگردوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ وہ کبھی کسی کی غیبت نہیں کرتے تھے اور اپنا کام ایمانداری سے انجام دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے ان سے کپڑا خریدا، اس کپڑے میں کچھ خرابی تھی۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس خرابی کو چھپایا نہیں اور خریدار سے کہا کہ اس خرابی کو جاننے کے بعد اگر تم خریدنا چاہو تو خرید لو۔

وہ اپنے روپے سے شاگردوں کی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ ان کے ایک شاگرد محمد بہت غریب تھے اور امام ابوحنیفہؒ کے پاس آ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے باپ آئے اور محمد کو گھر لے گئے اور ان سے کہا کہ ابوحنیفہؒ تو پیسے والے ہیں وہ ہر وقت پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن تم غریب ہو۔ اگر پڑھنے میں وقت صرف کیا تو پھر کما کر کھاؤ گے کیسے۔ اپنے باپ کی اس ہدایت

کے بعد محمد کئی دن تک غیر حاضر رہے۔ جب وہ سبق پڑھنے آئے تو امام ابوحنیفہؒ نے ان سے غیر حاضری کی وجہ پوچھی ——— انہوں نے بتادیا کہ میں غریب ہوں اور روز نہیں آ سکتا۔ اس پر امام صاحب نے ان کو ایک تھیلی دی اور کہا کہ جب یہ خرچ ہو جائے تو پھر لے جانا۔ اس طرح محمد نے اپنے استاد کی مدد سے اتنا علم حاصل کیا کہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں میں سب سے بڑھ گئے اور لوگ ان کو امام محمدؒ کہنے لگے۔

فقہ حنفی کی اشاعت سب سے زیادہ امام ابوحنیفہؒ کے دو شاگردوں قاضی ابو یوسف (۱۱۳ھ تا ۱۸۳ھ) اور امام محمد بن حسن شیبانی (۱۳۲ھ تا ۱۸۹ھ) کی وجہ سے ہوئی۔ قاضی ابو یوسف نے سب سے پہلے فقہ حنفی کی کتابیں لکھیں۔ ان کو چونکہ ہارون الرشید نے پوری خلافت عباسیہ کا قاضی القضاۃ بنادیا تھا اس لیے ان کی وجہ سے فقہ حنفی کو بہت فروغ ہوا۔ لیکن فقہ حنفی کی حقیقی بنیاد امام محمد کی تصانیف پر ہے۔ وہ آزاد کردہ غلام تھے اور پچیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔ شہر رے میں جب ان کا انتقال ہوا تو خود ہارون الرشید نے نماز جنازہ پڑھائی اور بڑے افسوس سے کہا کہ

''آج علم فقہ زمین میں دفن ہو گیا۔''

امام محمد قانون بین الممالک کے بانی اول سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ پیرس اور روما کے قانون دانوں نے ۱۳۸۹ھ میں ان کی بارہ سو دیں برسی بڑے اہتمام سے منائی۔

فقہ حنفی کے پیروؤں کی تعداد اس وقت سب سے زیادہ ہے۔ چین، ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان اور افغان اور ترک مسلمان عام طور پر فقہ حنفی کے پیرو ہیں۔

امام مالکؒ (۷۱۵ء/۹۳ھ تا ۷۹۵ء/۱۷۹ھ)

اس زمانے کے ایک اور زبردست عالم امام مالکؒ (۹۳ھ تا ۱۷۹ھ) ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کوفہ میں تھے اور امام مالکؒ قریب قریب اسی زمانے میں مدینہ میں تھے۔ وہ مدینہ میں رہنے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے اپنے زمانے میں سب سے بڑے عالم تھے۔ امام مالکؒ نے ''حدیثوں'' کا ایک مجموعہ بھی تیار کیا تھا جس کا نام ''موطا'' تھا۔ اس وقت حدیثوں کی جس قدر کتابیں ہیں ''موطا'' ان میں سب سے پرانی ہے۔

امام مالکؒ بھی امام ابوحنیفہؒ کی طرح لوگوں کی مدد کرتے تھے۔ ان کو یہ امداد خلفاء اور امراء

تحفے کے طور پر دیتے تھے اور وہ ان کو لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ امام مالکؒ بڑے دیانتدار اور اصول کے پکے تھے۔ وہ اپنے اصول کے مقابلے میں بڑے سے بڑے انسان کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیتے تھے۔

ایک مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید مدینہ آیا اور اس نے ان سے خواہش کی کہ وہ محل میں آ کر موطا کی کتاب اس کے لڑکوں کو پڑھا دیں۔ امام مالکؒ نے محل جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جس کو پڑھنے کا شوق ہو اس کو خود آنا چاہیے۔ اس پر ہارون الرشید اپنے دونوں بیٹوں امین اور مامون کو لے کر امام صاحب کے پاس آیا۔ وہاں بے شمار طلبہ موجود تھے یہ دیکھ کر خلیفہ نے کہا:
''اس بھیڑ کو الگ کر دیجیے۔'' امام مالکؒ نے جواب دیا۔ ''دو چار کے فائدے کے لیے تمام طلباء کا نقصان نہیں کیا جا سکتا۔'' چنانچہ ہارون الرشید اور اس کے لڑکوں کو تمام طلباء کے ساتھ پڑھنا پڑا۔ مؤطا پڑھنے کے بعد امام مالکؒ نے خلیفہ کو مدینہ کے فقیروں اور غریبوں کی طرف توجہ دلائی اور ہارون نے ان کی ہدایت پر تمام مستحقین کو روپیہ تقسیم کیا۔

فقہ مالکی کی سب سے اہم کتاب ''مدونہ'' ہے جو قیروان کے قاضی اور فاتح صقلیہ اسد بن فرات (متوفی ۲۱۳ھ) اور امام سحنون (متوفی ۲۴۰ھ) نے مرتب کی تھی۔ آج کل شمال اور مغربی افریقہ کے مسلمان زیادہ تر فقہ مالکی ہی پر عمل کرتے ہیں۔ اندلس کے مسلمان بھی اسی فقہ پر عمل کرتے تھے۔

امام شافعیؒ (۷۶۷ء/۱۵۰ھ تا ۸۲۰ء/۲۰۴ھ)

امام مالکؒ کے شاگرد محمد بن ادریس بھی جو امام شافعیؒ کے نام سے مشہور ہیں اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے سو کے قریب کتابیں لکھی تھیں۔ جن میں سے بہت سی اب بھی موجود ہیں۔ امام شافعیؒ کی عمر کا بیشتر حصہ مکہ، مدینہ، بغداد اور مصر میں گزرا ہے اور آخر میں مصر میں ہی وفات پائی۔ امام مالکؒ کے بعد وہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے۔ وہ بہت اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز تھے۔ ان کا شمار عربی زبان کے سب سے اچھے لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ کتاب الام اور الرسالہ ان کی بہت مشہور کتابیں ہیں۔

امام شافعیؒ کی کتاب الرسالہ کا اردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔

امام شافعیؒ کے فقہ کی اشاعت ان جلیل القدر علماء کی کوششوں کا نتیجہ ہے جو پان سو سال تک

مصر، عرب، شام، عراق اور ایران میں پیدا ہوتے رہے۔ اس زمانہ میں اس وسیع خطے میں جس قدر ممتاز اہل علم گزرے ہیں ان کی اکثریت شافعی تھی۔ آج کل انڈونیشیا، ملائشیا، حجاز، مصر و شام اور مشرقی افریقہ کے مسلمانوں کی اکثریت فقہ شافعی کی پیرو ہے۔ اسلامی دنیا میں فقہ حنفی کے بعد سب سے زیادہ پیرو فقہ شافعی کے ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ (۷۸۰ء/۱۶۴ھ تا ۸۵۵ء/۲۴۱ھ)

اس دَور کے چوتھے بڑے عالم امام شافعیؒ کے شاگرد امام احمد بن حنبلؒ ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ اپنے زمانہ میں حدیث کے سب سے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے ''مسند'' کے نام سے حدیثوں کی ایک بہت بڑی کتاب لکھی جس میں تقریباً چالیس ہزار حدیثیں ہیں۔ امام شافعیؒ کی طرح احمد بن حنبلؒ بھی غریب تھے۔ ان کو خلفاء اور امراء ہزاروں روپے دیتے تھے لیکن وہ اس میں سے اپنے اوپر کچھ بھی صرف نہیں کرتے تھے۔ یہ تمام رقم لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔

خلیفہ معتصم نے ایک مرتبہ ان پر بڑی سختی کی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بات جس کو امام احمد بن حنبلؒ غلط سمجھتے تھے ان سے منوالے لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر خلیفہ نے ان کو کوڑوں سے اتنا پٹوایا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ لیکن جس بات کو وہ جھوٹ سمجھتے تھے اسے سچ نہیں کہا۔ ان کی قربانیوں کی وجہ سے ان کو ساری اسلامی دنیا میں ایسی ہر دلعزیزی حاصل ہوئی کہ وہ دلوں کے بادشاہ بن گئے جب ان کا بغداد میں انتقال ہوا تو آٹھ لاکھ سے زیادہ لوگ جنازہ میں شریک تھے۔ اتنے لوگوں نے کبھی بڑے سے بڑے بادشاہ کے جنازہ میں بھی شرکت نہیں کی۔

عباسی خلافت کے دَورِ زوال میں فقہ حنبلی کے پیروؤں کا بغداد میں بڑا زور تھا۔ لیکن اب صرف عرب کے صوبہ نجد میں ان کی اکثریت ہے۔ حنبلی فقہ کے پیرو علماء میں سب سے زیادہ شہرت امام ابن تیمیہؒ نے حاصل کی جن کا تذکرہ اس کتاب میں آگے چل کر مملوکوں کے عہد کی تاریخ میں کیا گیا ہے۔

فقہ جعفری کے بانی امام جعفر صادق (۸۰ھ تا ۱۴۸ھ) ہیں جن کا تذکرہ عہد اموی میں کیا جا چکا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ دونوں امام جعفر صادق کے شاگرد رہ چکے تھے۔ پاکستان، ہندوستان، ایران اور عراق کے شیعہ باشندے فقہ جعفری پر عمل کرتے ہیں۔

امام بخاریؒ (۸۱۰ء/۱۹۴ھ تا ۸۷۰ء/۲۵۶ھ)

اس عہد کے محدثین میں محمد بن اسماعیل جو امام بخاریؒ کے نام سے مشہور ہیں بہت ممتاز ہیں۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اور ان کی زندگی کے واقعات کو بڑی تحقیق سے ایک کتاب میں جمع کیا۔ یہ کتاب صحیح بخاری کہلاتی ہے۔ اس کتاب کے لکھنے میں امام بخاریؒ کی زندگی کے تیس سال صرف ہوئے۔ لیکن یہ حدیثوں کی اتنی صحیح کتاب ہے کہ مسلمان اس کو قرآن مجید کے بعد دنیا کی سب سے صحیح کتاب سمجھتے ہیں۔ امام بخاریؒ اس زمانہ کے بہت سے علماء کی طرح تجارت کیا کرتے تھے۔ وہ بڑے دولت مند تھے لیکن سادہ زندگی گزارتے تھے اور اپنے روپے سے دوسروں کی مدد کیا کرتے تھے۔

امام بخاریؒ نے صحیح احادیث کا یہ مجموعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے تقریباً ڈھائی سو سال بعد مرتب کیا۔ اس سے پہلے امام مالکؒ بھی موطا کے نام سے حدیثوں کا ایک مستند مجموعہ مرتب کر چکے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے ڈیڑھ سو سال بعد مرتب ہوا تھا۔ لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ڈیڑھ سو سال تک حدیثوں کی کوئی کتاب لکھی نہیں گئی تھی صحیح نہیں۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ حدیثوں کو لکھنے کا کام خلافت راشدہ ہی کے زمانہ میں شروع ہو گیا تھا اور سو سال کے اندر اندر خود صحابہ کی زندگیوں میں بے شمار مجموعے مرتب ہو گئے تھے اور علماء مسجدوں میں ان کا درس دیتے تھے لیکن چونکہ اس زمانہ کے لوگ حفظ کرنے کو لکھنے کے مقابلہ میں زیادہ اچھا طریقہ سمجھتے تھے۔ اس لیے یہ کتابیں مشہور نہیں ہوئیں۔ اس کے علاوہ ان کتابوں میں ہر قسم کی حدیثیں موجود تھیں۔ وہ حدیث بھی جس کو صحیح سمجھا جاتا تھا اور وہ بھی جس کے صحیح ہونے پر شک تھا۔ درس دینے والے علماء تو غلط اور صحیح کا فرق سمجھا دیتے تھے لیکن مجموعوں میں صحیح غلط کا پہچاننا عام لوگوں کے لیے بہت مشکل تھا۔ امام بخاریؒ اور بعد کے محدثین نے اس مشکل کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ ان حدیثوں کا ایک مجموعہ تیار کر دیا جائے جو ہر لحاظ سے صحیح ہوں یعنی جن کو صحابہؓ اور ان کے بعد آنے والے بزرگ اور علماء صحیح سمجھتے آئے ہیں تاکہ اس طرح عام مسلمان بغیر کسی دقت کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح احکام معلوم کر سکیں۔ صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابیں جن کا ذکر آگے آئے گا اسی خیال سے لکھی گئیں۔

صحاح ستہ

حدیثوں کی ایک اور کتاب صحیح مسلم بھی اسی زمانہ میں لکھی گئی یہ امام مسلمؒ (۸۱۷ء/۲۰۶ھ تا ۸۶۵ء/۲۶۱ھ) کی لکھی ہوئی ہے اور صحیح بخاری کے برابر درجہ کی ہے۔

اسی زمانہ میں ایک اور محدث امام ترمذیؒ (۸۲۴ء/۲۰۹ھ تا ۸۹۳ء/۲۷۹ھ) نے جو امام بخاریؒ کے شاگرد تھے۔ ''شمائل'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس میں صحیح حدیثوں کی مدد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے صحیح ترمذی کے نام سے حدیثوں کی ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم، اور صحیح ترمذی کے علاوہ اس زمانہ میں حدیثوں کے تین اور مشہور اور مستند مجموعے مرتب کیے گئے جو اپنے مرتب کرنے والوں کے نام پر ابوداوٗد (۸۱۷ء/۲۰۲ھ تا ۸۸۸ء/۲۷۵ھ)، ابن ماجہ (۸۲۴ء/۲۰۹ھ تا ۸۸۶ء/۲۷۳ھ) اور نسائی (۲۲۱ھ تا ۹۱۵ء/۳۰۳ھ) کہلاتے ہیں۔ صحیح حدیثوں کی چونکہ یہ کُل چھ کتابیں ہیں اس لیے ان کو ''صحاح ستہ'' یعنی چھ صحیح کتابیں کہا جاتا ہے۔ اس طرح ان کتابوں کو اسلامی تعلیم کے سمجھنے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

محدثین کی ان کتابوں میں ایک طرف دینی معلومات جمع کر دی گئی ہیں اور دوسری طرف ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے زمانہ کے صحیح تاریخی واقعات جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اس طرح احادیث کی یہ کتابیں دین کے کام بھی آتی ہیں اور تاریخ میں بھی ان سے مدد ملتی ہے۔ ان میں جو تاریخی واقعات ہیں وہ تاریخ کی کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ صحیح ہیں۔

تاریخ وجغرافیہ

اس دور میں تاریخ اور سوانح عمریوں کی بھی بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں ایک، ابن ہشام (متوفی ۸۲۴ء/۲۱۳ھ) کی لکھی ہوئی ''سیرت النبیؐ'' ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات لکھے گئے ہیں۔ لیکن اس زمانے کے سب سے بڑے سوانح نگار ابن سعدؔ (۱۶۸ھ تا ۸۴۵ء/۲۳۰ھ) ہیں۔ انہوں نے ''طبقات'' کے نام سے ایک بہت بڑی کتاب لکھی ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ان کے صحابہؓ اور صحابہؓ کے بعد آنے والے ممتاز لوگوں کے جن کو ''تابعین'' کہا جاتا ہے حالات لکھے ہیں۔ اس طرح ''طبقات ابن سعد''

سے کئی سو ممتاز لوگوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔

اسلامی فتوحات کا حال ایک اور مورخ بلاذری (متوفی ۸۹۲ء/۲۸۴ھ) نے اپنی کتاب ''فتوح البلدان'' میں لکھا ہے۔ اس کتاب میں حضرت عمرؓ کے زمانہ کی فتوحات اور اس کے بعد اندلس وسط ایشیا اور سندھ وغیرہ کی فتوحات کا ذکر کیا ہے۔

لیکن اس زمانے کے سب سے بڑے مورخ ابن جریر طبری (۸۳۹ء/۲۲۴ھ تا ۹۲۳ء/ ۳۱۰ھ) ہوئے ہیں۔ انہوں نے چودہ موٹی موٹی جلدوں میں ایک تاریخی کتاب لکھی ہے جس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اپنے زمانہ تک تین سو برس کی تاریخ تفصیل سے لکھی ہے۔ ان دو کتابوں کے علاوہ وہ کئی بڑی بڑی کتابوں کے مصنف ہیں۔ طبری اسلامی تاریخ کے سب سے بڑے مصنف ہوئے ہیں۔ انہوں نے جتنی کتابیں لکھیں آج تک کسی نے نہیں لکھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ روزانہ ۱۴ صفحے لکھا کرتے تھے اور یہ سلسلہ تمام عمر جاری رہا۔

مسعودی

اس دور کے مصنفوں میں مسعودی (متوفی ۹۵۶ء/۳۴۵ھ) کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ وہ مورخ ہونے کے علاوہ ایک بڑے جغرافیہ دان اور بہت بڑے سیاح بھی تھے۔ مسعودی بغداد کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے ۳۰۵ھ سے کچھ پہلے اس شہر سے اپنا سفر شروع کیا۔ سب سے پہلے وہ ایران گئے وہاں سے مغربی پاکستان آئے۔ سندھ اور ملتان کی سیر کی۔ پھر وہ بھارت کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ کوکن اور مالابار کے علاقوں کی سیر کرتے ہوئے لنکا پہنچے۔ جب وہ لنکا پہنچے تو ان کو وطن سے نکلے ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ یہاں سے وہ ایک تجارتی قافلے کے ساتھ چین گئے۔ چین سے واپسی پر انہوں نے زنجبار کا رُخ کیا اور مشرقی افریقہ کے ساحلوں کی سیر کرتے ہوئے مدغاسکر تک پہنچے۔ یہاں سے جنوب عرب اور عمان ہوتے ہوئے اپنے وطن بغداد واپس آ گئے۔

آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پُرانے زمانے میں جب کہ ہوائی جہاز، ریلیں اور موٹریں نہیں تھیں اور ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک والوں سے بالکل ناواقف ہوتے تھے، سفر کرنا کتنا مشکل ہوتا ہوگا۔ خاص طور پر سمندر کا سفر تو بہت ہی خطرناک ہوتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بادبانی جہازوں کی سمندر کی طوفانی موجوں میں کیا حقیقت تھی لیکن ہمارے اس بہادر سیاح نے علم اور

معلومات حاصل کرنے کے لیے ان تمام خطروں کا مقابلہ کیا اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دنیا کے ایک بڑے حصہ کی سیر کر ڈالی اور اپنی سیاحت کا حال لکھ کر ملک ملک کی تہذیب وتمدن سے لوگوں کو واقف کرایا۔

مسعودی نے سفر کی مشکلوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''میں نے چین، روم، قلزم اور یمن کے سمندروں میں سفر کیا ہے۔ ان سمندری سفروں کے دوران مجھے طرح طرح کے خطروں سے اس کثرت سے مقابلہ کرنا پڑا کہ میں ان کا تفصیل سے ذکر نہیں کر سکتا۔ لیکن مشرقی افریقہ اور بھارت کے درمیان سمندر میں مَیں نے جو کچھ دیکھا وہ ناقابل بیان ہے۔ یہاں مجھے بیحد خوفناک اور کٹھن لمحوں سے گزرنا پڑا۔ یہاں مَیں نے ایک ایسی مچھلی دیکھی جو ایک سو گز لمبی ہے یا اس سے بھی زیادہ۔ جہاز ران اسے ''آوال'' کہتے ہیں۔ یہ مچھلی سمندر میں کہیں نہ کہیں نظر آجاتی ہے اور جب اس کا ایک پر کہیں نظر آتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کسی ڈوبتے ہوئے جہاز کا بادبان ہے۔ یہ مچھلی بعض اوقات سر نکال کر اس زور سے سانس لیتی ہے کہ پانی آسمان کی طرف تیر کی تیزی سے نکلنے لگتا ہے۔ دن ہو یا رات جہاز رانوں پر بنی رہتی ہے اور وہ اسے بھگانے کے لیے خوفناک آوازوں والے گولے ہوا میں چھوڑتے رہتے ہیں۔''

مسعودی نے جس مچھلی کا ذکر کیا ہے وہ غالباً وہی مچھلی ہے جسے آج کل وہیل کہا جاتا ہے۔

بغداد واپس پہنچنے کے بعد مسعودی کو پھر سفر کے شوق نے بے چین کیا۔ اب انہوں نے ایشیائے کوچک کا رُخ کیا اور وہاں سے شام اور فلسطین کی سیر کرتے ہوئے مصر پہنچے۔ وہ شاید اس کے بعد بھی سفر کرتے اور شمالی افریقہ اور اندلس وغیرہ جاتے لیکن ان کی زندگی نے وفا نہیں کی اور مصر پہنچنے کے چند سال بعد شہر فسطاط میں ان کا انتقال ہو گیا۔

وہ بیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔ لیکن افسوس کہ سوائے دو کتابوں کے اب ان کی اور کوئی کتاب نہیں ملتی۔ ان کتابوں کے نام مُروج الذہب اور التنبیہہ والاشراف ہیں۔

مسعودی کی کتابوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کو پڑھ کر چوتھی صدی ہجری کی زندگی آئینہ کی طرح ہمارے سامنے آجاتی ہے اور اس زمانہ کی تہذیب وتمدن کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ یہ بات اس زمانہ کے کسی مورخ میں نہیں ملتی۔

ابوالحسن اشعری

اس دور کے علماء میں ابوالحسن اشعری (۸۷۳ء/۲۷۰ھ تا ۹۳۵ء/۳۲۴ھ) کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ ایرانیوں اور دوسری غیر عرب قوموں کے مسلمان ہو جانے کی وجہ سے اور غیر مسلم باشندوں کے ساتھ میل جول اور ان کی کتابوں کے عربی میں ترجمے ہو جانے کی وجہ سے اس زمانے کے مسلمانوں میں غیر اسلامی خیالات پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ اور امام شافعیؒ وغیرہ نے ان خیالات کی روک تھام کی لیکن ان گمراہ کُن خیالات کا عقلی بنیاد پر جس نے کامیاب مقابلہ کیا وہ امام ابوالحسن اشعریؒ ہیں۔ انہوں نے پہلی مرتبہ دلائل سے اور عقلی بنیاد پر اسلامی عقائد اور نظریات کی صداقت ثابت کی اور ایک نئے علم کی بنیاد ڈالی جو علم کلام کہلاتا ہے اور جس کا مقصد عقلی دلائل سے اسلام کی سچائی ثابت کرنا ہے۔ وہ تقریباً ڈھائی سو کتابوں کے مصنف تھے جن میں الاُبانہ اور مقالات الاسلامیین بڑے معرکے کی کتابیں ہیں۔

علوم حکمت

عباسی دَور میں دینی علوم کے علاوہ دوسرے علوم مثلاً طب، ریاضی، فلکیات، علم کیمیا، فلسفہ اور دوسرے سائنسی علوم نے بھی ترقی کی۔ یہ علوم مسلمانوں نے پہلی مرتبہ یونانی، سنسکرت اور دوسری زبانوں سے عربی میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں سے سیکھے لیکن جلد ہی وہ ان علوم پر اس طرح حاوی ہو گئے کہ جیسے یہ ان کے اپنے علوم ہوں۔ انہوں نے اس معاملے میں رسول مقبولؐ کی اس حدیث پر عمل کیا کہ:

"حکمت مسلمانوں کی کھوئی ہوئی میراث ہے اس لیے وہ جہاں ملے حاصل کرلو۔"

چنانچہ مسلمانوں نے ان علوم میں ایسی ایسی کتابیں لکھیں کہ آج بھی وہ اپنے فن کی بنیادی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ ان مسلمان اور حکماء اور سائنس دانوں میں سے چند کے نام یہ ہیں:

محمد بن موسیٰ خوارزمی: جن کا انتقال ۸۳۵ء/۲۲۰ھ یا ۸۴۴ء/۲۳۰ھ میں ہوا، اس دَور کے سب سے بڑے ریاضی دان تھے۔ انہوں نے ریاضی، الجبر اور علم فلکیات پر بڑی معیاری کتابیں لکھیں اور ان علوم میں نیا اضافہ کیا۔ یورپ والوں نے گنتی کے ہندسوں اور صفر کا استعمال ان ہی کی کتابوں سے سیکھا۔

میکانک یعنی مختلف آلے بنانے کے فن کو تین بھائیوں نے جو بنو موسیٰ بن شاکر کہلاتے تھے بڑی ترقی دی۔ اور ان علوم پر ایسی کتابیں لکھیں جو پہلے کبھی نہیں لکھی گئیں۔ مامون الرشید کے زمانے میں کرۂ زمین کی پیمائش ان ہی بھائیوں نے کی تھی جن کے نام احمد، حسن اور محمد تھے۔ مشہور کیمیا دان جابر ابن حیان (متوفی ۱۶۱ھ) بھی اس دور میں ہوا ہے۔ یورپ کے بعض سائنس دانوں نے اس کو جدید علم کیمیا کا بانی کہا ہے۔ علم کیمیا پر اس نے جو کتابیں لکھیں وہ ایک ہزار صفحوں پر پھیلی ہوئی ہیں اور یورپ میں چھپ گئی ہیں۔ یورپ میں دور جدید سے پہلے جو سائنس دان ہوئے ہیں انہوں نے جابر کی ان کتابوں سے فائدہ اٹھایا اور یہی وجہ ہے کہ سائنس دانوں نے جابر کو جدید علم کیمیا کا بانی کہا ہے۔

علم طب میں سب سے زیادہ کمال محمد بن زکریا رازی (۸۶۴ء/۲۴۰ھ تا ۹۳۲ء/۳۲۰ھ) نے حاصل کیا۔ رازی نہ صرف اسلامی تاریخ میں سب سے بڑے طبیب مانے گئے ہیں بلکہ دنیا کے سب سے بڑے طبیبوں اور ڈاکٹروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے علم طب پر جو کتابیں لکھیں ان کا بعد میں یورپ کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور ان کی مدد سے یورپ نے علم طب سیکھا۔

فلسفہ میں یعقوب کندی اور فارابی (۸۷۳ء/۲۵۹ھ تا ۹۵۰ء/۳۳۹ھ) نے شہرت حاصل کی۔ کندی خلیفہ مامون الرشید اور اس کے جانشینوں کے زمانے میں تھا اور پہلا عرب فلسفی سمجھا جاتا ہے۔ فارابی نے فلسفہ کو اور ترقی دی اور معلم ثانی کے نام سے مشہور ہوا۔ معلم اوّل ارسطو کو سمجھا جاتا ہے جو قدیم زمانے میں یونان کا سب سے بڑا فلسفی تھا۔ کندی اور فارابی کی کتابوں نے بھی یورپ کے فلسفیوں کو متاثر کیا۔

ادب اور شاعری

ادب اور شاعری کی ترقی کے لحاظ سے بھی عباسی دور کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔ لغت اور گرامر یا علم نحو نے باضابطہ شکل اسی زمانے میں اختیار کی۔ اس علم کے سب سے بڑے ماہر اور مصنف خلیل نحوی (۷۱۲ء/۱۰۰ھ تا ۷۸۷ء/۱۷۵ھ)، سیبویہ (متوفی ۷۷۰ء/۱۷۷ھ) اور اصمعی (۷۴۰ء/۱۲۲ھ تا ۸۲۸ء/۲۱۶ھ) تھے۔ یہ تینوں عربی لغت اور نحو کے امام اور بانی ہیں۔

ادب میں سب سے بڑی شخصیت جاحظ (۷۷۵ء/۱۶۰ھ تا ۸۶۸ء/۲۵۵ھ) کی ہے جن کا عربی زبان کے سب سے بڑے ادیبوں میں شمار ہوتا ہے۔

ان کی کتاب الحیوان ان چار کتابوں میں شمار کی جاتی ہے جن پر عربی ادب کا دارومدار ہے۔عربی ادب کے ان چار شاہکاروں میں سے باقی تین بھی اس دور میں لکھے گئے۔یعنی ابن قتیبہ (۸۲۸ء/۲۱۳ھ تا ۸۸۹ء/۲۷۶ھ) کی ادب الکاتب اور عیون الاخبار اور مبرّد (۸۲۶ء/۲۱۰ھ تا ۸۹۸ء/۲۸۵ھ) کی الکامل فی الادب۔

سادہ طرزِ تحریر، خیالات کی گہرائی، شاعرانہ رنگینی اور ظرافت، جاحظ کی تحریر کی خصوصیات ہیں۔وہ نسلاً حبشی تھے اور عقائد کے لحاظ سے معتزلہ۔اس دور کے وہ واحد مصنف ہیں جنہوں نے ملوکیت کے نظام پر سخت حملے کیے۔ان کی کتابوں میں سے کتاب الحیوان اور کتاب البیان نے شہرت جاوید حاصل کی۔

ابن قتیبہ کی عیون الاخبار دس جلدوں میں ہے اور ادب کا ایسا نمونہ ہے جس کی بڑے بڑے ادیبوں نے تقلید کی۔عیون الاخبار اور مبرد کی الکامل فی الادب اس زمانہ کی معاشرت اور زندگی کے بارے میں معلومات کا بہت عمدہ مآخذ ہیں۔

عربی شاعری بھی اپنے عروج پر اس دور میں پہنچی۔اموی دور کے تین شاعر اخطل، جریر اور فرزوق کا پیچھے تذکرہ ہو چکا ہے۔یہ تینوں عربی کے صف اول کے شاعر سمجھے جاتے ہیں لیکن عباسی دور کے شعراء ان سب سے آگے بڑھ گئے۔ان شعراء میں ابوتمام (۷۹۶ء/۱۸۰ھ تا ۸۴۲ء/۲۲۸ھ)، ابوالعتاہیہ (۷۵۰ء/۱۳۰ھ تا ۸۲۵ء/۲۱۰ھ)، ابونواس (۷۶۲ء/۱۴۵ھ تا ۸۱۳ء/۱۹۶ء)، اور بحتری (۸۲۰ء/۲۰۴ھ تا ۸۹۷ء/۲۸۴ھ) سب سے نمایاں ہیں۔یہ شعراء یا تو قصیدہ گو تھے یعنی خلفاء اور امراء کی تعریف میں نظمیں کہتے تھے یا انہوں نے اس دور کی مادی اور عیش پرستانہ زندگی کی ترجمانی کی۔ان میں صرف ابوالعتاہیہ سب سے مختلف تھا کیونکہ اس کا موضوع دنیا کی بے ثباتی اور انسانی اخلاق تھا۔اس دور میں ایک عباسی شہزادہ ابن معتز (۸۶۱ء/۲۴۷ھ تا ۹۰۸ء/۲۹۶ھ) بھی ایک بلند پایہ شاعر تھا۔

مختصر یہ کہ عباسی دور میں بڑے بڑے اہل علم جس کثرت سے گزرے ہیں اسلامی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی بلکہ جدید دور کو چھوڑ کر ساری دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ہم نے صرف چند کے نام لکھے ہیں۔

باب ۱۳

تسبیح کے دانے بکھر گئے

خلافتِ عباسیہ کے عروج کے زمانہ تک (۲۴۷ھ) اندلس اور مراکش کے چھوٹے چھوٹے ملکوں کو چھوڑ کر باقی ساری اسلامی دنیا مغربی پاکستان اور فرغانہ سے لے کر قیروان تک عباسی خلافت کے تحت تھے۔ گویا مسلمان اس وقت تک سیاسی لحاظ سے بڑی حد تک متحد تھے، لیکن عباسی خلافت کے زوال کے بعد اس اتحاد اور وحدت کا خاتمہ ہوگیا۔ جس صوبہ دار کو جہاں موقع ملا وہاں اس نے خود مختار حکومت قائم کرلی۔ اس طرح ایک مرکزی حکومت کی جگہ کئی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ ان میں تین بڑی اور قابل ذکر حکومتوں کا حال ہم یہاں لکھتے ہیں۔

۱۔ سامانی (۲۶۱ھ تا ۳۹۵ھ)

یہ حکومت ۲۶۱ھ میں ماوراء النہر میں قائم ہوئی۔ اپنے مورثِ اعلیٰ اسد بن سامان کے نام پر یہ خاندان سامانی کہلاتا ہے۔ نصر بن احمد بن اسد سامانیوں کی آزاد حکومت کا پہلا حکمران ہے۔ ماوراء النہر کے علاوہ موجودہ افغانستان اور خراسان بھی اس حکومت میں شامل تھے۔ اس کا دارالحکومت بخارا تھا۔ سامانیوں نے ۳۹۵ھ تک یعنی کُل ایک سو ۳۴ سال حکومت کی۔ اس عرصہ میں ان کے دس حکمران ہوئے۔ ان میں سب سے مشہور اور اچھا حکمران اسمٰعیل سامانی (۲۷۹ھ تا ۲۹۵ھ) تھا۔ اسماعیل بڑا نیک مزاج اور عادل بادشاہ تھا۔ ایک مرتبہ اس کو معلوم ہوا کہ شہر رے میں جس ترازو کے باٹ سے خراج کی رقم تولی جاتی ہے وہ مقررہ وزن سے زیادہ وزنی ہے۔ اسمٰعیل نے فوراً معاملہ کی تحقیق کی۔ اطلاع صحیح نکلی۔ چنانچہ اسمٰعیل نے صحیح وزن مقرر کردیا اور حکم دیا کہ گزشتہ سالوں میں لوگوں سے جس قدر زیادہ رقم وصول کی گئی ہے وہ واپس کردی جائے۔

نصر دوم کا عہد علم وادب کی سرپرستی کی وجہ سے ممتاز ہے اور اس کے لڑکے نوح اول کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے بخارا میں ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا تھا جس میں ہر علم وفن کی کتابوں کے لیے علیٰحدہ علیٰحدہ کمرے مخصوص تھے۔ مشہور فلسفی اور طبیب ابن سینا نے یہاں کی

قیمتی اور نایاب کتابوں کی بڑی تعریف کی ہے۔نوح اول کے لڑکے منصور اوّل کے بارے میں سیاح ابن حوقل نے لکھا ہے کہ وہ اپنے دَور کا سب سے عادل بادشاہ ہے۔

سامانیوں کا ایک بڑا کارنامہ خانہ بدوش ترک قبائل کی یلغار سے مملکت کی حفاظت کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے شمالی سرحدوں پر جگہ جگہ چوکیاں قائم تھیں جن کو رباط کہا جاتا تھا۔ یہاں جہاد کے لیے ہروقت رضا کار موجود رہتے تھے۔

اسی دَور میں ترکوں میں اسلام تیزی سے پھیلا اور چوتھی صدی کے آخر تک مشرقی ترکستان یعنی کاشغر اور اس سے ملحق علاقے میں اور شمالی ترکستان سے لے کر روس میں والگا کی وادی میں اسلام پھیل گیا۔

سامانی عہد میں علم و ادب کی دل کھول کر سرپرستی کی گئی لیکن اس دَور کی بڑی خصوصیت ''فارسی زبان'' کی ترقی ہے۔ اب تک مسلمان جس قدر کتابیں لکھتے تھے وہ عربی زبان میں ہوتی تھیں۔ جو لوگ عرب نہیں تھے جیسے ایرانی اور ترک وہ بھی عربی ہی میں کتابیں پڑھتے اور لکھتے تھے۔ یہ لوگ فارسی اور ترکی کی بجائے شاعری بھی عربی میں کرتے تھے۔ سامانی بادشاہوں نے اب فارسی زبان کی سرپرستی شروع کر دی کیونکہ وہ خود فارسی بولتے تھے۔ چنانچہ فارسی کا پہلا بڑا شاعر رودکی، اسمٰعیل کے پوتے نصر (۳۰۱ھ تا ۳۳۱ھ) کے دربار کا شاعر تھا۔ اسی زمانہ میں طبری کی مشہور تاریخ اور تفسیر کا جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ مشہور فلسفی فارابی اور ابن سینا کا بھی ابتدائی تعلق سامانی دربار سے تھا۔ علماء میں علم کلام کے ماہر امام منصور ماتریدی متوفی ۳۳۰ھ اور صوفیوں میں ابونصر سراج متوفی ۹۸۸ء/۳۷۸ھ بھی اسی دَور سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی کتاب ''اللمع'' عربی میں ہے اور علم تصوف کی بنیادی کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں میں سیر و سیاحت کا شوق عام ہوگیا تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے تو وہ پہلے ہی سے دُور دُور کے ملکوں میں جاتے تھے۔ لیکن اب سیر و سیاحت اور معلومات حاصل کرنے کے لیے سفر کرنے کا شوق عام ہوگیا تھا۔ اُس زمانے میں سیر و سیاحت سے لوگوں کو جو دلچسپی تھی اس کا ایک ہم عصر شاعر اور سیاح ابن مہلہل نے اپنے شعروں میں بڑی خوبی سے ذکر کیا ہے جن کو پڑھ کر اس زمانے کے مسلمانوں میں پائے جانے والے شوق سیاحت

کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان اشعار کا مفہوم یہ ہے:

''ہم نے دنیا کے عجائبات اور زمانے کی نئی نئی باتیں دیکھیں۔ ہم نے چین سے مصر اور مصر سے طنجہ تک لوگوں کے حالات معلوم کیے۔ ہم تو وہ لوگ ہیں کہ بحر و بر ہمارے بے چین قدموں کے نیچے مسخر ہیں۔ ہمارے قدم برف کی ٹھنڈک اور ریت کی گرمی سے بخوبی آشنا ہیں۔ ہمارے اسپ تازی نے کس کس گھاٹ کا پانی نہ پیا۔ جب ایک خطۂ زمین سے جی بھر گیا تو ہم نے دوسرے کا رُخ کیا۔''

چوتھی صدی ہجری کے سیاحوں میں تین نام بہت نمایاں ہیں۔ ایک اصطخری، دوسرا مقدسی اور تیسرا ابن حوقل۔[1] ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ خراسان اور خاص طور پر ترکستان نے

---

(1) ابن حوقل ان ہی منچلے سیاحوں میں سے ایک تھا۔ وہ ۳۳۱ھ میں بغداد سے روانہ ہوا اور تیس سال تک اسلامی دنیا کا سفر کرتا رہا۔ مشرق میں وہ سندھ سے ملتان تک آیا اور مغرب میں وہ صقلیہ، اندلس اور افریقہ کے صحرائے اعظم کے پار مالی اور غانا تک گیا۔ آخر میں اس نے ایک سفرنامہ لکھا جس میں اپنے سفر کے دلچسپ حالات لکھے۔ اس سفرنامے میں اس نے مغربی پاکستان کے جو حالات لکھے ہیں یہاں ہم اس کا ذکر کریں گے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اب سے ایک ہزار سال پہلے ہمارا ملک کیسا تھا:

مکران کے متعلق وہ لکھتا ہے:

''زمین زیادہ تر ریگستان ہے اور زراعت بہت کم ہوتی ہے۔ گنا اور کھجوریں بہت ہوتی ہیں۔''

قزدار (قلات) کے متعلق لکھتا ہے:

''یہاں بڑی ارزانی اور شادابی ہے۔ انگور، انار اور دوسرے سرد میوے بکثرت ملتے ہیں لیکن کھجوریں نہیں ملتیں۔''

سندھ کے حالات اس نے بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔ وہ لکھتا ہے: ''سندھ کا پایہ تخت منصورہ ہے جسے برہمن آباد بھی کہتے ہیں۔ طول و عرض میں ایک میل ہے، باشندے مسلمان ہیں، گرمی ہوتی ہے، کھجوریں بہت ہیں مگر انگور، سیب، اخروٹ اور امرود نہیں ہوتے۔ گنا ہوتا ہے۔ سیب کے برابر ایک پھل ہوتا ہے جس کو لیموں کہتے ہیں اور بہت ترش ہوتا ہے۔ ایک اور پھل شفتالو کے برابر ہوتا ہے جس کو آم کہتے ہیں۔ یہاں ارزانی اور شادابی بہت ہے۔ لباس عراق والوں کی طرح ہوتا ہے لیکن شاہی لباس یہاں کے راجوں کی طرح ہے جو بال رکھتے ہیں اور کانوں میں بالا پہنتے ہیں۔''

''ارور (اردو جسے آلور بھی کہتے ہیں موجودہ قصبہ روہڑی کے مشرق میں پانچ میل کے فاصلہ پر آباد تھا۔ یہ شہر فتح سندھ کے تین سو سال بعد زلزلہ سے تباہ ہو گیا تھا اور اب صرف اس کے کھنڈر باقی ہیں۔ بہت دولت مند اور خوشحال شہر ہے۔ ہر قسم کی ارزانی ہے۔ تجارت کی گرم بازاری ہے۔ طول و عرض ملتان کے برابر ہے۔''

''دیبل (سندھ کے اس قدیم بندرگاہ کا ابھی تک پتہ نہیں چل سکا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کراچی کی جگہ دیبل تھا اور بعض کا خیال ہے کہ کراچی کے جنوب مشرق میں بھمبور کے قریب دیبل آباد تھا۔) بڑا شہر ہے لیکن بے برگ و گیاہ ہے۔ البتہ تجارت کا بڑا مرکز ہے۔''

ملتان کے متعلق ابن حوقل نے لکھا ہے کہ یہ شہر طول و عرض میں منصورہ کے برابر ہے۔ یہاں ایک مورتی ہے جس کی ہندو بڑی عزت کرتے ہیں اور دُور دُور سے اُس کی زیارت کو آتے ہیں۔ مندر ہاتھی کے دانت بیچنے والوں اور ٹھٹھیروں کے بازار کے درمیان رونق کی جگہ ہے۔

ملتان کا قلعہ بلند اور مضبوط ہے اور وہاں سرسبزی اور ارزانی کافی ہے مگر منصورہ سے کم۔

اس دور میں نہ صرف علم و ادب میں بلکہ صنعت و حرفت، تجارت، زراعت اور تہذیب و تمدن میں بہت ترقی کی اور یہ خطہ دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ اور مہذب ترین ملکوں کی صف میں آ گیا۔ چنانچہ مقدسی لکھتا ہے:

''خراسان اور ماوراء النہر (ترکستان) کا علاقہ تمام مملکتوں سے زیادہ جلیل القدر ہے۔ مُلک دولت مند ہے اور مملکت زندگی کے وسائل سے بھرپور ہے۔ یہاں مزروعہ علاقے، گھنے درخت، بہتے دریا اور عمدہ کانیں ہیں اور پھلوں کی کثرت ہے۔ لوگ پاکباز، فیاض اور مہمان نواز ہیں۔ عدل و انصاف قائم ہے۔ نہ بدعتیں ہیں اور نہ پولیس کی دست درازیاں۔ ملک بھر میں مدرسے ہیں اور یہاں علماء ہر ملک سے زیادہ ہیں۔ فقیہوں کو بادشاہ کا درجہ حاصل ہے اور مذہبی زندگی صراطِ مستقیم پر ہے۔ یہ مسلمانوں کی قابل فخر مملکت ہے اور اسلام کا پودا یہاں سرسبز و شاداب ہے۔ سامانی خوش سیرت اور منصف بادشاہ ہیں۔ لوگوں میں مثل مشہور ہے کہ اگر کوئی درخت سامانیوں سے بغاوت پر آمادہ ہو جائے تو بغیر سُوکھے نہیں رہ سکتا۔''

سمرقند، بخارا، خوارزم، بلخ، مرو، ہرات، نیشاپور اور رے سامانی مملکت کے سب سے بڑے اور خوشحال شہر تھے۔ ان شہروں کے بارے میں مقدسی نے لکھا ہے کہ:

''سارے مشرق میں سمرقند سے زیادہ پھلتا پھولتا کوئی شہر نہیں۔ نیشاپور مشرق کا سب سے عظیم الشان شہر ہے اور اسلامی دنیا میں اس کا ثانی نہیں۔ بلخ جنت خراسان ہے، باغات شہر کو گھیرے ہوئے ہیں اور شہر کے اکثر راستوں کے ساتھ نہریں اور نل گزرتے ہیں۔ رے صفائی اور خوبصورتی میں بے مثال ہے۔ یہاں علماء کی کثرت ہے کوئی واعظ ایسا نہیں جو قانون اسلام سے واقف نہ ہو اور کوئی حاکم ایسا نہیں جو عالم نہ ہو، محتسب راست بازی کے لیے مشہور ہیں۔ خطیب شہر کی تقریر میں ادب کی چاشنی ہے۔ رے اسلامی تمدن کا قابل فخر نمونہ ہے۔''

آخر میں سامانی حکومت بھی عباسیوں کی طرح کمزور ہوتی گئی۔ صوبہ دار باغی ہونے لگے ورخراسان اور غزنی کے علاقوں میں ان کے ایک سپہ سالار سبکتگین نے اپنی آزاد حکومت قائم کر لی

اور بخارا، سمرقند پر کاشغر کے بادشاہ ایلک [1] خان نے قبضہ کر کے سامانی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

۲۔ بنی بویہ (۳۳۴ھ تا ۴۴۷ھ)

سامانیوں کی طرح دوسری بڑی حکومت جو اس زمانہ میں قائم ہوئی وہ ''بنی بویہ'' کی تھی۔ اس خاندان کا مورث اعلیٰ ابوشجاع بویہ تھا۔ چونکہ اس خاندان کا تعلق مازندران کے علاقے دیلم سے تھا اس لیے بنی بویہ کو دیالمہ بھی کہا جاتا ہے۔

سامانیوں کی طرح یہ بھی ایک ایرانی خاندان تھا۔ اس حکومت کے بانی تین بھائی علی، حسن اور احمد تھے جنہوں نے بالترتیب عماد الدولہ، رکن الدولہ اور معز الدولہ کے لقب اختیار کیے اور ایران اور عراق میں علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم کیں۔ عماد الدولہ ان کا مرکزی سربراہ تھا۔ اس کے بعد یہی حیثیت رکن الدولہ کو حاصل ہوئی اور اس کے بعد عضد الدولہ اور اس کی اولاد کو۔ بغداد پر اسی خاندان کے حکمران معز الدولہ نے ۳۳۴ھ میں قبضہ کیا تھا۔ عراق کا پورا ملک اور خراسان چھوڑ کر باقی ایران بنی بویہ کے قبضہ میں تھا۔ بغداد، اصفہان اور شیراز بویہی سلطنت کے بڑے شہر تھے۔ سامانیوں کے زوال کے بعد رے پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔

بنی بویہ کا سب سے مشہور حکمران عضد الدولہ (۳۶۶ھ تا ۳۷۲ھ) ہے۔ عضد الدولہ بادشاہ بننے سے پہلے صوبہ فارس اور کرمان کا ۲۸ سال تک والی رہا۔ اس نے پہلے والی کی حیثیت سے اور پھر بادشاہ کی حیثیت سے رفاہِ عام کے بہت کام کیے اور سلطنت کو بڑی ترقی دی۔ اس نے ڈاک کا اتنا اچھا انتظام کیا کہ شیراز سے قاصد سات دن میں بغداد پہنچ جاتا تھا۔ حالانکہ دونوں شہروں کے درمیان تقریباً چھ سو میل کا فاصلہ ہے۔ صحرائے عرب اور صحرائے کرمان اس زمانہ میں ڈاکوؤں کا مرکز بن گئے تھے لیکن عضد الدولہ نے وہاں ایسا امن قائم کیا کہ مسافروں کے قافلے بلا

---

(۱) ایلک خانی خاندان کی حکومت کا زمانہ ۳۸۰ھ سے ۶۰۹ تک ہے۔ یہ خالص ترک خاندان تھا اور اس کا دارالحکومت شروع میں جھیل بالکش کے جنوب میں بلاساغون تھا پھر کاشغر ہوا اور سامانی حکومت کے خاتمہ کے بعد ۳۸۹ھ میں سمرقند دارالحکومت بن گیا۔ محمود غزنوی نے سمرقند فتح کرنے کے بعد ایک خانی حکومت سے تصفیہ کر لیا تھا کہ دریائے جیحون دونوں سلطنتوں کے درمیان حد قرار پائے گا۔ بعد میں ان حکمرانوں نے سلجوقی اور خوارزم شاہی سلطنت کی اطاعت کر لی تھی اور ان کی حکومت نیم خود مختار حیثیت رکھتی تھی۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق یہ حکمران جو مسلمان تھے علم و ادب کے سرپرست بھی تھے۔ چنانچہ مشہور سائنسدان حکیم عمر خیام کا ابتدائی تعلق اسی خاندان کے ایک حکمران شمس الملک (۴۶۰ھ تا ۴۷۲ھ) کے دربار سے تھا۔

کھٹکے سفر کرنے لگے۔

عضد الدولہ نے بغداد کو بڑی ترقی دی۔ نہریں کھدوائیں، دجلہ پر پل بنایا، شیراز میں آبپاشی کے لیے اس نے بہت بڑا بند تعمیر کیا جو بند امیر کے نام سے اب تک موجود ہے۔ اس کا ایک اور بڑا کارنامہ بغداد میں ایک عظیم الشان شفاخانہ کا قیام ہے۔ عوام کے لیے شفاخانے تعمیر کرنے کا رواج اگرچہ اموی خلیفہ ولید کے زمانے ہی سے شروع ہوگیا تھا لیکن عضد الدولہ کا شفاخانہ خاص طور پر قابل ذکر تھا۔ یہ شفاخانہ دجلہ کے کنارے ایک عالیشان عمارت میں تھا۔ یہ اتنا بڑا تھا کہ ساری دنیا میں کوئی شفاخانہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس میں ۲۴، اطباء مقرر تھے۔ جراح یعنی آپریشن کرنے والے، کحال یعنی آنکھوں کا علاج کرنے والے طبیب اور مرہم پٹی کرنے والے اس کے علاوہ تھے۔

اس شفاخانے کے خرچ کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کے لیے ساڑھے سات لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر وقف تھی۔

یہ شفاخانہ (۹۸۱ء/۳۷۱ھ تا ۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ) ڈھائی سو سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہا۔

عضد الدولہ کے بعد بنی بویہ کی حکومت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ عراق، رے اور فارس میں بویہی شہزادوں نے علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم کرلیں۔ ان میں ''رے'' کی حکومت اس لحاظ سے مشہور تھی کہ اس کے حکمران فخر الدولہ کو ایک بڑا قابل وزیر صاحب ابن عباد مل گیا تھا۔ صاحب (۳۷۳ھ تا ۳۸۵ھ) نے بارہ سال وزارت کی اور ایسی شہرت حاصل کی جیسی عباسی خلافت کے زمانہ میں برامکہ نے حاصل کی تھی۔ وہ صاحب تصنیف بھی تھا اور اس نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کا کتب خانہ اتنا بڑا تھا کہ ایک مرتبہ ایک سامانی بادشاہ نے اس کو وزیر بنانے کی خواہش کی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ میرے کتب خانے کو منتقل کرنے کے لیے چار سو اونٹوں کی ضرورت ہوگی۔

رے کی حکومت کا ۴۲۰ میں غزنی کے حکمران محمود غزنوی نے خاتمہ کردیا۔ اس کے بعد ۴۴۷ھ میں سلجوقیوں نے بغداد پر قبضہ کرکے بنی بویہ کی سلطنت کا ہر جگہ سے خاتمہ کردیا۔ بنی بویہ عقیدہ کے لحاظ سے شیعہ تھے اور محرم کے مہینہ میں تعزیہ نکالنے اور عاشورہ کی رسوم ادا کرنے کا اسلامی دنیا میں آغاز ان ہی کے حکمران معز الدولہ کے زمانے سے ہوا۔ بنی بویہ نے عباسی خلیفہ کو بے دست و پا کردیا اور اس کو مختلف طریقوں سے ذلیل کیا۔

علم وادب

بنی بویہ کے کئی حکمران اور وزیر علم وادب کے بڑے سرپرست تھے۔ عضد الدولہ اور صاحب ابن عباد خاص طور پر اس لحاظ سے مشہور ہیں۔ عربی زبان کا سب سے بڑا شاعر متنبی (۹۱۵ء تا ۹۶۵ء) اسی زمانہ میں ہوا ہے۔ اس نے عضد الدولہ اور صاحب کی تعریف میں قصیدے لکھے اور انعامات پائے۔

مشہور طبیب اور فلسفی بوعلی سینا (۳۷۰ھ تا ۴۲۸ھ) اسی زمانہ میں ہوا ہے۔ رازی کے بعد ابن سینا سب سے بڑا مسلمان طبیب ہوا ہے۔ طب میں اس نے جو کتاب لکھی اس کا نام ''قانون'' ہے اور فلسفہ کے موضوع پر جو سب سے بڑی کتاب لکھی اس کا نام ''شفا'' ہے۔ یہ دونوں کتابیں کئی کئی جلدوں میں ہیں اور عربی میں ہیں۔ بعد میں اس کی کتابوں کا لاطینی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوا اور فرانس، جرمنی اور اٹلی کے مدرسوں میں کئی سو سال تک اس کی کتابیں پڑھائی جاتی رہیں۔ اس نے علم طب میں مفید اضافے کیے۔ وہ بہت بڑا فلسفی بھی تھا۔

اس زمانہ کے سائنس دانوں میں ابن ہیثم (۹۶۵ء/۳۵۴ھ تا ۱۰۳۹ء/۴۳۰ھ) کا نام بھی قابل ذکر ہے وہ بصرہ کا رہنے والا تھا اور ابن سینا کا ہم عصر تھا۔ اس نے علم طبیعات اور سائنس سے متعلق کئی کتابیں لکھیں۔ یورپ کے محققین کا کہنا ہے کہ تصویر لینے والا کیمرہ جس نظریے کی بنیاد پر بنایا گیا وہ نظریہ سب سے پہلے ابن ہیثم نے ہی پیش کیا تھا۔ اس کی کتاب ''کتاب المناظر'' جس میں اس نے یہ نظریہ پیش کیا تھا بارہویں صدی میں عربی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کی گئی اور یورپ کے سائنس دانوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اس کے ان کمالات کی وجہ سے پاکستان میں نومبر ۱۹۶۹ء میں ابن ہیثم کا جشن ہزار سالہ منایا گیا۔

فلسفہ کی مشہور کتاب ''رسائل اخوان الصفا'' بھی اسی زمانہ میں لکھی گئی۔

بنی بویہ کے ان کارناموں کے باوجود ان کا دورِ حکومت مسلمانوں میں عقائد کی کمزوری اور اخلاق کی خرابی کا باعث ہوا۔ چنانچہ جب ہم اس دور کے سیاحوں کی کتابوں کو پڑھتے ہیں تو عراق اور ایران کے ان حصوں کے بارے میں جو بنی بویہ کے قبضہ میں تھے ویسی روشن تصویر ہمارے سامنے نہیں آتی جیسی سامانی دورِ حکومت میں نظر آتی ہے۔ مقدسی عراق کے بارے میں لکھتا ہے:

''عراق کے مفاخر اتنے ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا لیکن آج کل یہ فتنوں اور گرانی کا گھر بنا ہوا ہے، روز بروز حالت خراب ہوتی جارہی ہے۔ ظلم اور بھاری ٹیکسوں کی وجہ سے لوگ مصیبت میں ہیں اور بے حیائیاں زیادہ ہیں''

بغداد تقریباً اجڑ چکا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ سامرہ کی طرح برباد ہو جائے گا۔ فتنے، فساد، جہالت اور فسق و فجور کا بازار گرم ہے اور حکومت ظالم ہے۔

کوفہ ایک زمانہ میں بغداد کا ہم پلہ تھا لیکن اس وقت حالت خراب ہے اور بیرونی حصے اُجڑے ہوئے ہیں۔

بصرہ کی مقدسی نے تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ شہر اس کو بغداد کی نسبت زیادہ پسند ہے کیونکہ معاشی آسانیاں زیادہ ہیں اور علوم و فنون ترقی پر ہیں۔

مذہبی تعصب اور فرقہ بندی نے چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں میں مضبوطی سے جڑیں پکڑ لی تھیں اور عباسی دَور کے برخلاف جہاں مختلف عقائد رکھنے والے علماء باہم شیر و شکر نظر آتے تھے اب وہ دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ بغداد فرقہ وارانہ فساد کا گھر بن گیا۔ عراق عجم کے بارے میں جہاں ہمدان کا شہر واقعہ ہے مقدسی لکھتا ہے کہ باشندے متعصب حنبلی اور امیر معاویہؓ کے شدت سے معتقد ہیں اور دوسرے مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں۔ اس صوبہ میں اکثر بلوے ہوتے رہتے ہیں۔

اصفہان اور ہمدان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''بنی بویہ کے آئین نرالے اور رسم و رواج بیہودہ ہیں۔ آل بویہ کی دست درازیوں سے تنگ آکر لوگ ترکِ وطن کر گئے ہیں، لیکن آج کل ان کی حکومت بہتر ہے۔ وہ مسلمانوں کی میراث کو ضبط نہیں کرتے اور جب کسی کو مالی عطیہ دیتے ہیں تو اس کی موت تک جاری رکھتے ہیں۔''

خوزستان کے لوگوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

''یہاں کے لوگوں کو علم و ادب سے دلچسپی نہیں اور بچوں کو شروع سے کاروبار میں لگا دیتے ہیں۔ بدکاری عام ہے۔ وہ خوزستان کے پٹرول کے چشموں کا ذکر بھی کرتا ہے۔''

شیراز جو بعد میں علم و ادب کا مرکز بنا اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

''باشندے اگرچہ خوش اخلاق ہیں لیکن علم، ادب اور ظرافت سے خالی ہیں۔ خوزستان کی طرح شیراز میں بھی وہ بدکاری عام ہونے کی شکایت کرتا ہے۔''

سیراف کی بندرگاہ عہد عباسی میں اتنی آباد، عمارتیں اتنی خوشنما اور بازار اتنے دیدہ زیب تھے کہ لوگ اس کو بصرہ پر ترجیح دیتے تھے لیکن مقدسی لکھتا ہے کہ:

''بویہی تسلط کے بعد آبادی کم ہوگئی اور باشندے ہجرت کرکے عمان کے شہر صحار میں آباد ہوگئے۔ ۳۶۶ھ کے زلزلے میں شہر بالکل تباہ ہوگیا۔ مقدسی اس زلزلہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ:

''میں نے باشندوں سے پوچھا تمہاری سیرت کیسی تھی جو خدا نے تم پر رحم نہ کیا۔ بولے ہمارے یہاں زنا اور سُود خوری بڑھ گئی تھی۔ میں نے کہا اس تباہی سے تم نے عبرت پکڑی؟ بولے ''نہیں۔''

مقدسی لکھتا ہے کہ اہل فارس میں باوجود کثرت فسق و فجور سیرافیوں کی بدکاری ضرب المثل ہے۔

۳۔ سلطنتِ فاطمیہ (۲۹۷ھ تا ۵۶۷ھ)

اس زمانہ کی تیسری بڑی حکومت ''سلطنتِ فاطمیہ'' (۲۹۷ھ تا ۵۶۷ھ) ہے۔ یہ حکومت ۲۹۷ھ میں شمالی افریقہ کے شہر قیروان میں قائم ہوئی۔ اس سلطنت کا بانی عبید اللہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے تھا[1] اس لیے اسے ''سلطنت فاطمیہ'' کہا جاتا ہے۔ عبید اللہ تاریخ میں مہدی کے لقب سے مشہور ہے۔

عبید اللہ مہدی اور ان کے پیرو شیعہ فرقہ کی ایک شاخ ہیں۔ یہ لوگ امام جعفر صادق تک تو تمام اماموں کو مانتے ہیں لیکن اس کے بعد وہ امام جعفر صادق کے بڑے صاحبزادے اسمٰعیل کو امام مانتے ہیں جبکہ اثنا عشری عقیدے کے مطابق امامت کا سلسلہ امام جعفر صادق کے دوسرے صاحبزادے امام موسیٰ کاظم کی نسل میں چلتا ہے۔ فاطمی خلفاء چونکہ اسمٰعیل کی اولاد میں ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اس لیے وہ اسمٰعیلی کہلائے۔ آغا خانی خوجے اسی اسمٰعیلی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

اب تک جو حکومتیں قائم ہوئی تھیں وہ اگرچہ خود مختار تھیں لیکن سب بغداد کی خلافت کو تسلیم

---

(۱) بعض محققین کو اس سے اختلاف ہے۔

کرتی تھیں اور جمعہ کی نماز کے خطبہ میں عباسی خلیفہ کا نام پڑھتی تھیں لیکن فاطمی حکمرانوں نے عباسی خلفاء کا نام خطبہ سے نکال دیا اور خود خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس لیے ان کی حکومت کو خلافت فاطمیہ بھی کہا جاتا ہے۔

شروع شروع میں فاطمی حکومت شمالی افریقہ تک محدود رہی لیکن ان کے ایک حکمران المعز (۳۴۱ھ تا ۳۶۵ھ) نے ۳۵۸ھ میں مصر بھی فتح کر لیا۔ المعز فاطمی حکومت کا سب سے قابل حکمران ہے۔ وہ افریقہ سے مصر آ گیا۔ مصر کے موجودہ شہر قاہرہ کی بنیاد اسی کے زمانہ میں پڑی۔ یہ شہر فسطاط کے قریب آباد کیا گیا تھا اور فاطمیوں کا دارالحکومت تھا۔ اس کے عہد میں جامع ازہر کے نام سے قاہرہ میں ایک مسجد تعمیر کی گئی۔ بعد میں اس مسجد میں دینی مدرسہ[1] قائم کیا گیا۔ جامع ازہر کا یہ مدرسہ دنیا کا سب سے پرانا مدرسہ ہے جو اب تک موجود ہے اور دنیا کے ہر حصہ سے مسلمان طالب علم وہاں مذہبی تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں۔

المعز کے بعد اس کا لڑکا عزیز (۳۶۵ھ تا ۳۸۶ھ) تخت پر بیٹھا۔ وہ بھی ایک قابل حکمران تھا۔ اس کے زمانے میں شام، حجاز، یمن پر بھی فاطمیوں کا قبضہ ہو گیا اور اس طرح فاطمی حکومت اسلامی دنیا کی سب سے بڑی سلطنت بن گئی۔

فاطمیوں کے زمانہ میں مسلمانوں کی بحری قوت نے بڑی ترقی پائی۔ صقلیہ اور اٹلی کا جنوبی حصہ ان کے قبضہ میں تھا۔ فاطمی بیڑے جنیوا، روم اور نیپلز پر حملے کرتے رہتے تھے اور یورپ کے بحری بیڑے ان کے مقابلے میں ٹھیر نہیں سکتے تھے۔

عباسی خلافت کے زوال کے بعد اس وقت تک جو حکومتیں قائم ہوئیں ان میں فاطمی سلطنت نہ صرف سب سے بڑی اور طاقتور تھی بلکہ سب سے زیادہ پائیدار بھی تھی۔ یہ حکومت ۲۹۶ھ سے ۵۶۷ھ تک تقریباً پونے تین سو سال قائم رہی۔ ۵۶۷ھ میں شام کے حکمران نور الدین نے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ جس کے بعد مصر میں عباسی خلیفہ کا نام خطبہ میں لیا جانے لگا۔

فاطمیوں کے زمانہ میں علم و ادب میں سامانیوں یا [illegible] کی طرح ترقی نہیں ہوئی ہاں انہوں نے شہر قاہرہ کو بہت ترقی دی۔ اچھی اچھی عمارتیں بنائیں۔ اپنے محلوں کو خوبصورت سے

---

(۱) جامع ازہر نے ایک تعلیمی درس گاہ کی حیثیت [illegible] ۲۵ھ میں عزیز باللہ کے عہد میں حاصل کی۔

خوبصورت سامان اور کپڑوں سے آراستہ کیا۔ کپڑے اور شیشہ بنانے کے کام نے اس زمانہ میں بڑی ترقی کی۔ ان کے عہد کی کئی تعمیری یادگاریں آج بھی قاہرہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ شہرت جامع ازہر کو حاصل ہوئی۔

ناصر خسرو (۳۹۴ھ تا ۴۵۲ھ)

فاطمیوں کے زمانہ میں خراسان کا ایک بہت بڑا مصنف اور سیاح ناصر خسرو (۱۰۰۳ء/ ۳۹۴ھ تا ۱۰۶۰ء/ ۴۵۲ھ) مصر آیا تھا۔ اس نے اپنے سفرنامہ میں مصر و شام کے بڑے دلچسپ حالات لکھے ہیں۔ یہ زمانہ اگرچہ فاطمیوں کے زوال کا تھا لیکن پھر بھی اس سفرنامہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں خطے اس زمانہ میں کیسے ترقی یافتہ تھے۔ وہ لبنان کے شہر طرابلس الشام کے متعلق لکھتا ہے کہ یہاں کے مکانات چار اور چھ منزل کے ہیں۔ گلیاں اور بازار محلوں کی طرح صاف ستھرے ہیں۔ یہاں سمرقند سے اچھا کاغذ بنتا ہے۔ بیس ہزار آبادی ہے۔

صیدا کے متعلق لکھتا ہے: ''یہاں کا بازار ایسا سجا ہوا تھا کہ میں نے اسے دیکھ کر خیال کیا کہ سلطان کے استقبال کی وجہ سے سجایا گیا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شہر ہمیشہ ایسا ہی سجا ہوا رہتا ہے۔'' صور، رملہ اور تینس کے متعلق لکھتا ہے:

''شہر صور میں پانچ اور چھ منزل کی عمارتیں ہیں۔ فوارے بکثرت ہیں۔ بازار خوبصورت سامان سے پٹے پڑے ہیں۔ شام کے شہروں میں دولت مندی کے لحاظ سے یہ شہر ضرب المثل ہے۔'' رملہ میں اکثر عمارتیں سنگ مرمر کی ہیں جن پر نقاشی کی گئی ہے۔ یہاں سے بہتر انجینئر کہیں نہیں ہوتا۔

تینس کے شہر میں دو سو دکانیں صرف عطاروں کی ہیں۔ یہاں ایک خاص قسم کا ریشمی اور سوتی کپڑا بنایا جاتا ہے جو دوسری جگہ نہیں بنایا جاتا۔ گھاٹ پر ایک ہزار کشتیاں رہتی ہیں۔

موجودہ دور سے پہلے اونچی عمارتیں بنانے کا زیادہ رواج نہیں تھا لیکن قاہرہ کی عمارتوں کا ناصر خسرو نے جو حال لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلک بوس عمارتوں کے لحاظ سے اس زمانہ میں قاہرہ کو دنیا میں وہی حیثیت حاصل تھی جو آج کل نیویارک اور دوسرے امریکی شہروں کو حاصل ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ قاہرہ کی اکثر عمارتیں پانچ اور چھ منزل کی ہیں اور فسطاط (قاہرہ کا پرانا حصہ)

کی بعض عمارتیں سات سے چودہ منزل تک کی ہیں۔ مکانوں کے اندر باغ اور چمن ہیں اور لوگ چھتوں پر بھی سیر گاہیں بناتے ہیں۔ مکانات پاکیزگی اور لطافت میں جواہرات معلوم ہوتے ہیں۔ شہر میں کم از کم بیس ہزار دکانیں ہیں اور پچاس ہزار اونٹ پانی بھرتے ہیں۔ قندیلوں کا بازار سب سے اچھا ہے۔ بعض بازاروں میں دن رات قندیلیں روشن رہتی ہیں۔ شہر میں دو سو کاروان سرائے ہیں۔ سب سے بڑی سرائے کا کرایہ بیس ہزار دینار سالانہ وصول ہوتا ہے۔

صنعت کے متعلق لکھا ہے کہ مٹی کے برتن ایسے بنتے ہیں کہ ہاتھ رکھو تو عکس نظر آتا ہے۔ اسی طرح شیشہ بھی شفاف بنتا ہے۔

دولت سامانیہ

	۸۷۴ء/۲۶۱ھ تا ۱۰۰۵ء/۳۹۵ھ
۱۔ نصر اول	۸۷۴ء/۲۶۱ھ تا ۸۹۲ء/۲۷۹ھ
۲۔ اسمٰعیل	۸۹۲ء/۲۷۹ھ تا ۹۰۷ء/۲۹۵ھ
۳۔ احمد	۹۰۷ء/۲۹۵ھ تا ۹۱۳ء/۳۰۱ھ
۴۔ نصر دوم	۹۱۳ء/۳۰۱ھ تا ۹۴۲ء/۳۳۱ھ
۵۔ نوح اول	۹۴۲ء/۳۳۱ھ تا ۹۵۴ء/۳۴۳ھ
۶۔ عبدالملک	۹۵۴ء/۳۴۳ھ تا ۹۶۱ء/۳۵۰ھ
۷۔ منصور اول	۹۶۱ء/۳۵۰ھ تا ۹۷۶ء/۳۶۶ھ
۸۔ نوح دوم	۹۷۶ء/۳۸۷ھ تا ۹۹۷ء/۳۸۹ھ
۹۔ منصور دوم	۹۹۷ء/۳۸۷ھ تا ۹۹۹ء/۳۸۹ھ
۱۰۔ عبدالملک	۹۹۹ء/۳۸۹ھ تا ۱۰۰۵ء/۳۹۵ھ

بنی بویہ

۹۳۴ء/۳۲۰ھ تا ۱۰۵۵ء/۴۴۷ھ

۱۔ عماد الدولہ	۹۳۲ء/۳۲۰ھ تا ۹۴۹ء/۳۳۸ھ
۲۔ رکن الدولہ	۹۴۹ء/۳۳۸ھ تا ۹۷۷ء/۳۶۶ھ
۳۔ عضد الدولہ	۹۷۷ء/۳۶۶ھ تا ۹۸۳ء/۳۷۲ھ
۴۔ صمصام الدولہ	۹۸۳ء/۳۷۲ھ تا ۹۸۶ء/۳۷۶ھ
۵۔ شرف الدولہ	۹۸۶ء/۳۷۶ھ تا ۹۸۹ء/۳۷۹ھ
۶۔ بہاء الدولہ	۹۸۹ء/۳۷۹ھ تا ۱۰۱۱ء/۴۰۲ھ
۷۔ سلطان الدولہ	۱۰۱۱ء/۴۱۱ھ تا ۱۰۲۰ء/۴۱۱ھ
۸۔ شرف الدولہ دوم	۱۰۲۰ء/۴۱۱ھ تا ۱۰۲۵ء/۴۱۶ھ
۹۔ جلال الدولہ	۱۰۲۵ء/۴۱۶ھ تا ۱۰۴۳ء/۴۳۵ھ
۱۰۔ ابوکالیجار	۱۰۴۳ء/۴۳۵ھ تا ۱۰۴۸ء/۴۴۰ھ
۱۱۔ ملک الرحیم	۱۰۴۸ء/۴۴۰ھ تا ۱۰۵۵ء/۴۴۷ھ

خلافت فاطمیہ

۹۰۹ء/۲۹۷ھ تا ۱۱۷۱ء/۵۶۷ھ

۱۔ مہدی	۹۰۹ء/۲۹۷ھ تا ۹۳۴ء/۳۲۲ھ
۲۔ قائم	۹۳۴ء/۳۲۲ھ تا ۹۴۵ء/۳۳۴ھ
۳۔ منصور	۹۴۵ء/۳۳۴ھ تا ۹۵۲ء/۳۴۱ھ
۴۔ معز	۹۵۲ء/۳۴۱ھ تا ۹۷۵ء/۳۶۵ھ
۵۔ عزیز	۹۷۵ء/۳۶۵ھ تا ۹۹۶ء/۳۸۶ھ

۶۔حاکم	۹۹۶ء/۳۸۶ھ تا ۱۰۲۰ء/۴۱۱ھ
۷۔ظاہر	۱۰۲۰ء/۴۱۱ھ تا ۱۹۰۴ء/۴۲۷ھ
۸۔مستنصر	۱۰۳۵ء/۴۲۷ھ تا ۱۰۴ء/۴۸۷ھ
۹۔مستعلی	۱۰۹۴ء/۴۸۷ھ تا ۱۱۳۰ء/۵۲۴ھ
۱۰۔آمر	۱۱۰۱ء/۴۹۵ھ تا ۱۱۳۰ء/۵۲۴ھ
۱۱۔حافظ	۱۱۳۰ء/۵۲۴ھ تا ۱۱۴۹ء/۵۴۴ھ
۱۲۔ظافر	۱۱۵۹ء/۵۴۹ھ تا ۱۱۶۰ء/۵۴۹ھ
۱۳۔فائز	۱۱۵۴ء/۵۴۹ھ تا ۱۱۶۰ء/۵۵۵ھ
۱۴۔عاضد	۱۱۶۰ء/۵۵۵ھ تا ۱۱۷۱ء/۵۶۷ھ

مزید مطالعہ کے لیے

۱۔تاریخ اسلام حصہ سوم و چہارم از شاہ معین الدین احمد ندوی۔

۲۔تاریخ اسلام حصہ سوم از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

۳۔تاریخ فاطمین مصر از ڈاکٹر زاہد علی۔

۴۔اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں از خورشید احمد فاروق (ندوۃ المصنفین دہلی) یہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور سیاح مقدسی کے سفرنامہ کا خلاصہ ہے۔

۵۔سفرنامہ ناصر خسرو (اردو ترجمہ)

۶۔شعر العجم حصہ اول۔

۷۔حکمائے اسلام از عبدالسلام ندوی۔ چوتھی اور پانچویں صدی کے حکماء اور فلسفیوں (ابن سینا، البیرونی اور ابن ہیثم وغیرہ) کے حالات پر مفید کتاب ہے۔

باب ۱۴

غزنی کی سلطنت

ہم پڑھ چکے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی حکومت کا آغاز بنی امیہ کے زمانہ ہی میں ہوگیا تھا جب کہ محمد بن قاسم نے مکران، سندھ اور ملتان کو فتح کر کے ان علاقوں کو اسلامی خلافت میں شامل کیا تھا۔ خلافت بغداد کے زوال تک یہ علاقے اسلامی خلافت میں شامل رہے لیکن ان کی حیثیت سرحدی صوبوں کی تھی۔ عربوں کے زمانہ میں مسلمانوں نے یہاں سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔

پاکستان اور ہندوستان میں اسلامی فتوحات کا دوسرا دور محمد بن قاسم کے تین سو سال بعد شروع ہوا۔ اس مرتبہ مسلمان مکران کے راستے نہیں بلکہ درۂ خیبر کے راستے آئے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ:

جب سامانی حکومت کمزور ہوگئی تو اس کے صوبہ دار خود مختار ہوگئے۔ ان میں ایک صوبہ دار سبکتگین (۳۶۶ھ تا ۳۸۷ھ) نے غزنی میں جو افغانستان کے دارالحکومت کابل کے جنوب میں ایک شہر ہے، ۳۶۶ھ میں ایک آزاد حکومت قائم کرلی تھی۔ جو تاریخ میں دولتِ غزنویہ اور آل سبکتگین کے نام سے جانی جاتی ہے۔ بعد میں خراسان پر بھی سبکتگین کا قبضہ ہوگیا۔ اسی سبکتگین کے زمانہ میں مسلمان پہلی مرتبہ درہ خیبر کے راستہ پاکستان میں داخل ہوئے۔

اس زمانہ میں لاہور میں ایک ہندو راجہ حکومت کرتا تھا جس کا نام جے پال تھا۔ اس کی حکومت پشاور سے آگے کابل تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کی سرحدیں سبکتگین کی حکومت سے ملی ہوئی تھیں۔ راجہ جے پال نے جب دیکھا کہ سبکتگین کی حکومت طاقتور بن رہی ہے تو اس نے ایک بڑی فوج لے کر غزنی کی حکومت پر حملہ کر دیا۔ لیکن لڑائی میں سبکتگین نے اس کو شکست دے دی اور جے پال کو گرفتار کرلیا۔ جے پال نے سبکتگین کی اطاعت قبول کر کے اپنی جان بچائی اور سالانہ خراج دینے کا وعدہ کیا۔ اب سبکتگین نے جے پال کو رہا کر دیا اور وہ لاہور واپس آگیا۔ لیکن اس نے وعدہ کے مطابق خراج نہیں بھیجا جس کی وجہ سے سبکتگین نے حملہ کر دیا اور وادیٔ پشاور پر قبضہ کرلیا۔

محمود غزنوی (۳۸۷ھ تا ۴۲۱ھ)

سبکتگین کا بیس سال کی حکومت کے بعد انتقال ہو گیا۔ محمود غزنوی تخت پر بیٹھا۔ محمود خاندان سبکتگین کا سب سے بڑا بادشاہ ہوا ہے۔ وہ اسلامی تاریخ کے مشہور حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے۔ محمود بچپن ہی سے بڑا نڈر اور بہادر تھا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ کئی لڑائیوں میں حصہ لے چکا تھا۔ بادشاہ ہونے کے بعد اس نے اپنی سلطنت کو بڑی وسعت دی۔ محمود بڑا کامیاب سپہ سالار اور ایک بڑا فاتح تھا۔ شمال میں اس نے خوارزم اور بخارا پر قبضہ کر لیا اور سمر قند کے علاقے کے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ اس سے پہلے بخارا اور سمر قند کاشغر کے ایلک خانی حکمرانوں کے قبضہ میں تھے اور خوارزم میں ایک چھوٹی سی خودمختار حکومت آل مامون کے نام سے قائم تھی۔ جنوب میں اس نے رے، اصفہان اور ہمدان فتح کر لیے جو بنی بویہ کے قبضہ میں تھے۔ مشرق میں اس نے قریب قریب وہ تمام علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا جو اب مغربی پاکستان کہلاتا ہے۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ لاہور کی حکومت پہلے ہی اطاعت قبول کر چکی تھی لیکن وہاں کے راجہ بار بار خراج کی رقم بند کر دیتے تھے اور ہندوستان کے راجاؤں سے مدد لے کر محمود کے مقابلے پر آ جاتے تھے۔ محمود نے ان سب کو کئی بار شکست دی اور آخر تنگ آ کر ۴۱۲ھ میں لاہور کی حکومت کو براہ راست اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ محمود نے ان راجاؤں کے علاقوں پر بھی حملہ کیا جو لاہور کے راجہ کی مدد کیا کرتے تھے اور اس طرح اس نے قنوج اور کالنجر تک اپنی سلطنت بڑھا دی لیکن ان علاقوں پر براہ راست محمود نے حکومت قائم نہیں کی بلکہ راجاؤں سے اطاعت کا وعدہ لے کر غزنی واپس چلا گیا۔ محمود کا آخری بڑا حملہ سومنات پر ہوا۔ سومنات سے واپسی پر محمود نے منصورہ فتح کر کے سندھ کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ پاکستان اور بھارت پر محمود نے کل سترہ حملے کیے۔ ان حملوں کی وجہ سے محمود کو بڑی شہرت حاصل ہوئی لیکن سچی بات یہ ہے کہ ان حملوں سے اسلام کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔ محمود کی فوجیں دہلی، متھرا، قنوج کالنجر اور سومنات تک پہنچ گئیں لیکن وہ لڑائی لڑ کر مال غنیمت لوٹ کر اور اطاعت کا وعدہ لے کر واپس چلی جاتی تھیں۔ یہ راجہ بار بار باغی ہو جاتے تھے اور محمود کو پھر واپس آنا پڑتا تھا۔ محمود کی یہ لشکر کشی خلافت

راشدہ اور بنی امیہ کے زمانے کی فتوحات سے بالکل مختلف تھی۔ ان کے زمانے میں جو ملک فتح ہوئے ان پر مسلمانوں نے باقاعدہ حکومت قائم کر دی تھی اور ایک ایسا نظام قائم کر دیا تھا جو پہلے سے بہتر تھا لیکن محمود نے سوائے پنجاب کے اور کسی علاقے کو اپنی سلطنت کا جز و نہیں بنایا۔ اس کی وجہ سے محمود کو بار بار لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ روپیہ بیکار ضائع ہوا۔ لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں اور ہندو یہ سمجھنے لگے کہ مسلمان صرف جنگجو اور لٹیرے ہیں۔ یہ رائے ایرانی اور رومی باشندے عربوں کے بارے میں قائم نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ عربوں نے جو بھی علاقہ فتح کیا وہاں مستحکم حکومت قائم کی۔

عدل وانصاف

محمود ایک بڑا فاتح اور سپہ سالار ہونے کے علاوہ ایک رعایا پرور بادشاہ بھی تھا۔ اس کے عدل وانصاف کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ ایک سوداگر نے سلطان محمود سے اس کے لڑکے شہزادہ مسعود کی شکایت کی اور کہا کہ میں پردیسی سوداگر ہوں اور مدت سے اس شہر میں پڑا ہوا ہوں۔ گھر جانا چاہتا ہوں لیکن نہیں جاسکتا کیونکہ شہزادہ نے مجھ سے ساٹھ ہزار دینار کا سودا خریدا ہے اور قیمت نہیں ادا کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ شہزادہ مسعود کو قاضی کے سامنے بھیجا جائے۔ محمود کو سوداگر کا واقعہ سن کر نہایت رنج ہوا اور مسعود سے کہلا بھیجا کہ یا تو سوداگر کا تصفیہ کر دے یا اس کے ساتھ کچہری میں قاضی کے سامنے حاضر ہو تا کہ شرعی حکم جاری کیا جائے۔ جب سلطان کا پیغام مسعود تک پہنچا تو اس نے فوراً اپنے خزانچی سے پوچھا کہ خزانے میں کس قدر نقد موجود ہے اس نے عرض کیا کہ بیس ہزار دینار شہزادے نے کہا کہ یہ رقم سوداگر کو دے کر بقیہ کے لیے تین دن کی مہلت مانگو اور سلطان کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ میں نے بیس ہزار دینار اس وقت ادا کر دیے ہیں اور تین دن میں بقیہ بھی ادا کر دوں گا۔ سلطان نے کہلا بھیجا کہ میں کچھ نہیں جانتا جب تک تم سوداگر کا روپیہ نہ ادا کرو گے میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ مسعود کو جب یہ جواب ملا تو اس نے اِدھر اُدھر سے قرض لے کر دوسری نماز کے وقت تک ساٹھ ہزار دینار نقد سوداگر کو ادا کر دیے۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایران کے کسی علاقہ میں جسے حال ہی میں محمود نے فتح کیا تھا سوداگروں کا ایک قافلہ لٹ گیا۔ اس قافلہ میں ایک بڑھیا کا لڑکا بھی تھا۔ بڑھیا نے جب

محمود سے اس کی شکایت کی تو اس نے کہا کہ وہ علاقہ بہت دُور ہے اس لیے اس کا انتظام مشکل ہے۔ بڑھیا بھی ہمت والی تھی اس نے جواب دیا کہ جب تم کسی علاقہ کا انتظام نہیں کر سکتے تو نئے نئے ملک کیوں فتح کرتے ہو۔ محمود نے جب بڑھیا کا یہ جواب سنا تو وہ بڑا شرمایا۔ بڑھیا کو تو روپے پیسے دے کر رخصت کر دیا لیکن اس علاقہ کا ایسا انتظام کیا کہ سوداگروں کے قافلے کو لوٹنے کی پھر کوئی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

علم وادب

محمود غزنوی علم وادب کا بھی بہت بڑا مربی اور سرپرست تھا۔ عباسی خلفاء کے بعد تاریخ میں دو چار ہی بادشاہ ملیں گے جو محمود کی طرح علم وفن کے مربی اور سرپرست ہوں۔ اس کی اس قدردانی کی وجہ سے اس کے دربار میں بڑے بڑے قابل لوگ جمع ہو گئے۔ ان میں صرف شاعروں کی تعداد چار سو تھی۔ ان شعراء میں سب سے مشہور فردوسیؔ ہے۔

فردوسی نے شاہنامہ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس شاہنامے میں نہ تو محمود کی فتوحات کا حال ہے اور نہ مسلمانوں کے شاندار کارناموں کا۔ اس میں تو اسلام سے پہلے کے ایرانی بادشاہوں کے جھوٹے سچے حالات بڑھا چڑھا کر لکھے گئے ہیں۔ لیکن اتنی خوبی سے لکھے گئے ہیں کہ یہ شاہنامہ فارسی شاعری کا ایک شاہکار سمجھا جاتا ہے اور دنیا اسے آج تک دلچسپی سے پڑھتی ہے۔

محمود نے فارسی زبان کی سامانیوں سے بھی زیادہ سرپرستی کی جس کی وجہ سے اب فارسی زبان نے بھی ترقی کرنا شروع کر دی۔

محمود کے دَور کا ایک بہت بڑا محقق البیرونیؔ (۳۶۲ھ تا ۴۴۰ھ) تھا۔ البیرونی اپنے زمانے کا سب سے بڑا محقق اور سائنس دان تھا۔ اس نے ریاضی، علم ہیئت تاریخ اور جغرافیہ میں ایسی ایسی عمدہ کتابیں لکھیں جو اب تک شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان میں ایک کتاب ''الہندؔ'' ہے۔ اس میں اس نے ہندوؤں کے مذہبی عقائد، ان کی تاریخ اور پاکستان اور ہند کے جغرافیائی حالات بڑی تحقیق سے لکھے ہیں۔ اس کتاب سے ہندوؤں کی تاریخ سے متعلق جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان میں سے بہت سی معلومات ایسی ہیں جو اور کہیں سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اس کتاب

کو لکھنے میں اس نے بڑی محنت کی۔ ہندو برہمن اپنا علم کسی دوسرے کو سکھاتے نہیں تھے لیکن البیرونی نے کئی سال مغربی پاکستان رہ کر سنسکرت زبان سیکھی اور ہندوؤں کے علوم میں ایسی مہارت پیدا کی کہ برہمن تعجب کرنے لگے۔ البیرونی کی ایک مشہور کتاب قانونِ مسعودی ہے۔ جو اس نے محمود کے لڑکے سلطان مسعود کے نام پر لکھی۔ یہ علم فلکیات اور ریاضی کی بڑی اہم کتاب ہے۔ اس کی وجہ سے البیرونی کو ایک عظیم سائنس دان اور ریاضی دان سمجھا جاتا ہے۔

محمود نے شہر غزنی کو بھی بڑی ترقی دی۔ جب وہ بادشاہ ہوا تو یہ معمولی شہر تھا لیکن محمود نے اپنی تیس سال کی حکومت میں غزنی کو دنیا کا ایک عظیم الشان شہر بنا دیا۔ یہاں اس نے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی ایک بہت بڑا مدرسہ بنایا اور ایک عجائب گھر بھی بنایا۔ اس نے قنوج کی فتح کی یادگار کے طور پر ایک مینار بھی بنایا جو اب تک غزنی میں موجود ہے۔

محمود غزنوی کے بعد غزنی کی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ محمود کے لڑکے مسعود کے آخری زمانے میں سلجوقی ترکوں نے جو وسط ایشیا سے آئے تھے غزنوی سلطنت کے شمال اور مغربی حصوں پر قبضہ کر لیا۔ اب سلاطین غزنی کے قبضہ میں صرف وہ علاقے رہ گئے جو اب مشرقی افغانستان اور مغربی پاکستان پر مشتمل ہیں۔

دورِ زوال کے غزنوی حکمرانوں میں سلطان ابراہیم (۴۵۱ھ تا ۴۹۲ھ) کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اس نے اپنے چالیس سالہ دورِ حکومت میں سلطنت کو بڑا مستحکم کیا۔ سلجوقیوں سے اچھے تعلقات قائم کیے اور ہندوستان میں مزید فتوحات کیں۔ اس کے عہد میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو پنجاب سے بے دخل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ ابراہیم نے دہلی تک تمام علاقہ غزنی کی سلطنت میں شامل کر لیا اور اس کی فوجوں نے بنارس تک کامیاب حملے کیے۔

ابراہیم بڑا دیندار اور رعایا پرور حکمران تھا۔ رات کو غزنی کے محلوں میں گشت کرتا اور محتاجوں اور بیواؤں کو تلاش کر کے ان کی مدد کرتا۔ وہ اعلیٰ درجہ کا خوشنویس تھا۔ ہر سال ایک قرآن مجید لکھتا جسے ایک سال مکہ معظمہ بھیجتا اور دوسرے سال مدینہ منورہ۔ اس کو محلات بنانے سے زیادہ ایسی عمارتیں بنانے کا شوق تھا جن سے لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ چنانچہ اس کے عہد میں چار سو سے زیادہ مدرسے، خانقاہیں، مسافر خانے اور مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ اس نے غزنی کے شاہی محل میں ایک بہت بڑا دواخانہ قائم کیا تھا جس سے لوگوں کو مفت دوائیں ملتی تھیں۔ اس دواخانے میں خاص طور

پر آنکھ کی بیماریوں کی بڑی اچھی دوائیں تھیں۔

۱۱۵۰ء/۵۴۵ھ میں غزنی پر علاقہ غور کے ایک حکمران علاؤ الدین نے قبضہ کر کے شہر میں آگ لگا دی جس کی وجہ سے دنیا کا یہ عظیم الشان شہر جل کر خاک ہو گیا۔ علاؤ الدین کے اس ظالمانہ کام کی وجہ سے لوگ اس کو ''جہانسوز'' یعنی دنیا کا جلانے والا کہتے ہیں۔ اس کے بعد غزنوی خاندان کے آخری دو حکمرانوں کا دارالسلطنت لاہور ہو گیا۔ ۵۸۲ء میں غور کے ایک دوسرے حکمران شہاب الدین نے لاہور پر قبضہ کر کے آل سبکتگین کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

غزنوی حکمرانوں کا دور پاکستان کی تاریخ میں خاص طور پر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مغربی پاکستان تقریباً دو سو سال تک غزنی کی سلطنت کا ایک حصہ رہا اور اس زمانے میں اس خطے میں اسلامی تہذیب کی جڑیں مضبوط ہوئیں۔ کوہ سلیمان کے علاقے میں رہنے والے پٹھانوں نے اسی زمانے میں اسلام قبول کیا اور لاہور پہلی مرتبہ علم و ادب کا مرکز بنا۔ اس زمانے میں فارسی زبان کے کئی ادیب اور شاعر یا تو لاہور میں پیدا ہوئے یا یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ یہاں کے شاعروں میں مسعود سعد سلیمان اور رونی بہت مشہور ہیں۔ ان کا شمار فارسی کے صف اول کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ یہ دونوں شاعر سلطان ابراہیم اور اس کے جانشینوں کے زمانے میں تھے۔

لاہور کے علماء میں حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ (۴۰۰ھ تا ۴۶۵ھ) بہت مشہور ہیں۔ وہ ایک بڑے ولی ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے لاہور کے علاقہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور بہت سے ہندو مسلمان ہوئے۔ حضرت ہجویریؒ آج کل داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے اسلامی دنیا کے بہت بڑے حصہ کی چالیس سال تک سیر کی اور آخر میں لاہور آ کر رہنے لگے۔ ان کی قبر اب تک لاہور میں موجود ہے۔

حضرت ہجویریؒ ''کشف المحجوب'' نامی ایک کتاب کے مصنف ہیں۔ یہ علم تصوف میں فارسی زبان کی پہلی کتاب ہے اور تصوف کی سب سے اچھی کتابوں میں سے ہے۔ یہ کتاب انہوں نے لاہور میں لکھی تھی۔ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔

عہدِ غزنوی کا تذکرہ ختم کرنے سے پہلے اس دور کی دو اور عظیم ہستیوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ان میں ایک ابوسعید ابوالخیر (۹۶۷ء/۳۵۷ھ تا ۱۰۴۹ء/۴۴۰ھ) ہیں۔ جو اپنے عہد کے بڑے صوفی اور ولی تھے۔ ان کی شہرت زیادہ تر رباعیوں کی وجہ سے ہے کیونکہ وہ فارسی زبان کے

پہلے بڑے رباعی گو شاعر ہیں۔ ان کی یہ رباعیاں آج بھی مقبول ہیں اور خدا سے محبت اور اخلاقی تعلیم ان کا خاص موضوع ہے۔

دوسری شخصیت سنائی (۴۶۵ھ تا ۵۴۵ھ) کی ہے۔ سنائی غزنویوں کے آخری دور کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور فارسی میں صوفیانہ شاعری کے بانی ہیں۔ ان کا کلام سوز و گداز اور اخلاقی تعلیم سے بھرا ہوا ہے۔ ابوسعید ابوالخیر کا تعلق خراسان سے تھا اور سنائی کا شہر غزنی ہے۔

عربی زبان کا مشہور ادیب بدیع الزماں ہمدانی (متوفی ۱۰۰۷ء/۳۹۸ھ) بھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ہرات کا رہنے والا تھا۔ اس کی کتاب ''مقامات'' عربی انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ سمجھی جاتی ہے۔

سلطنتِ غزنویہ

(۹۷۶ء/۳۶۶ھ تا ۱۱۸۶ء/۵۸۲ھ)

۱۔ سبکتگین	۹۷۶ء/۳۶۶ھ تا ۹۹۷ء/۳۸۷ھ
۲۔ محمود	۹۹۷ء/۳۸۷ھ تا ۱۰۳۰ء/۴۲۱ھ
۳۔ مسعود اول	۱۰۳۰ء/۴۲۱ھ تا ۱۰۴۰ء/۴۳۲ھ
۴۔ مودود	۱۰۴۰ء/۴۳۲ھ تا ۱۰۴۸ء/۴۴۰ھ
۵۔ عبدالرشید	۱۰۴۸ء/۴۴۰ھ تا ۱۰۵۲ء/۴۴۴ھ
۶۔ فرخ زاد	۱۰۵۲ء/۴۴۴ھ تا ۱۰۵۹ء/۴۵۱ھ
۷۔ ابراہیم	۱۰۵۹ء/۴۵۱ھ تا ۱۰۹۹ء/۴۹۲ھ
۸۔ مسعود دوم	۱۰۹۹ء/۴۹۲ھ تا ۱۱۱۴ء/۵۰۸ھ
۹۔ شہزاد	۱۱۱۴ء/۵۰۸ھ تا ۱۱۱۴ء/۵۰۸ھ
۱۰۔ ارسلان شاہ	۱۱۱۵ء/۵۰۹ھ تا ۱۱۱۸ء/۵۱۲ھ
۱۱۔ بہرام شاہ	۱۱۱۸ء/۵۱۲ھ تا ۱۱۵۲ء/۵۵۵ھ
۱۲۔ خسرو شاہ	۱۱۵۲ء/۵۴۷ھ تا ۱۱۶۰ء/۵۵۵ھ

۱۳۔ خسرو ملک ۱۱۶۰ء/ ۵۵۵ھ تا ۱۱۸۶ء/ ۵۸۳ھ

ملتان کی فتح	۱۰۰۵ء/ ۳۹۶ھ
پشاور کی جنگ۔ انند پال کی شکست۔	۱۰۰۸ء/ ۳۹۹ھ
قنوج کی راجہ کی اطاعت	۱۰۱۷ء/ ۴۰۸ھ
کالنجر کے راجہ کی اطاعت	۱۰۲۲ء/ ۴۱۳ھ
سومنات پر حملہ	۱۰۲۵ء/ ۴۱۵ھ

مزید مطالعہ کے لیے

۱۔ آئینہ حقیقت نما اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

۲۔ محمود غزنوی از پروفیسر حبیب (اردو ترجمہ)

۳۔ محمود غزنوی از نصیر احمد جامعی۔

۴۔ آثار الکریم از حکیم سید شمس اللہ قادری (حیدر آباد دکن) یہ عہد غزنویہ کی علمی وادبی تاریخ ہے۔

۵۔ شعر العجم حصہ اول از شبلی نعمانی۔

باب ۱۵

سلجوقی ترک

عباسی خلافت کے زوال کے بعد اسلامی دنیا دو سو سال تک چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم رہی جیسا کہ پچھلے صفحوں میں بتایا جا چکا ہے۔ لیکن اس کے بعد سلجوقی ترکوں نے اسلامی دنیا کے بڑے حصے کو ایک بار پھر متحدہ کر دیا۔ یہ سلجوقی نسلاً ترک تھے اور اسلام قبول کرنے کے بعد وسط ایشیا کے میدانوں سے نکل کر خراسان میں آباد ہو گئے تھے۔ جس زمانے میں یہ خراسان میں آباد ہوئے وہاں غزنوی سلطنت قائم تھی۔

جب اس حکومت کو زوال ہوا تو غزنوی حکمرانوں سے سلجوقیوں کی خراسان میں خوب لڑائیاں ہوئیں۔ سلجوقی سردار کا نام طغرل (۴۲۹ھ تا ۴۵۵ھ) تھا۔ طغرل بڑا قابل سپہ سالار تھا۔ اس نے ۱۰۳۷ء/۴۲۹ھ میں دندانیقان کی جنگ میں غزنوی حکمران مسعود کو شکست دے کر خراسان میں سلجوقی حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ خراسان میں حکومت مضبوط ہو جانے کے بعد طغرل نے مغرب کا رُخ کیا اور ایران فتح کرتا ہوا ۴۴۷ء میں بغداد میں داخل ہو گیا جو اس وقت بنی بویہ کے قبضے میں تھا۔

طغرل کا شمار تاریخ کے بڑے بڑے فاتح اور سپہ سالاروں میں ہوتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں اتنی بڑی سلطنت قائم کر دی جو سامانیوں، بنی بویہ اور بنی فاطمہ سب کی حکومتوں سے بڑی تھی۔ اس نے اس وسیع سلطنت پر ۲۶ سال تک بڑی اچھی طرح حکومت کی۔

طغرل کے بعد اس کا بھتیجا الپ ارسلان (۴۵۵ھ تا ۴۶۵ھ) تخت نشین ہوا۔ الپ ارسلان نے آرمینیا، ایشیائے کوچک، شمالی شام اور ماوراء النہر کو فتح کر کے سلجوقیوں کی سلطنت کو اور وسیع کر دیا اس کے نام کا خطبہ مکہ اور مدینہ میں بھی پڑھا جانے لگا جو اس سے پہلے فاطمیوں کے قبضہ میں تھے۔ الپ ارسلان نے ایشیاء کوچک کے شہر ''ملازکرد'' کے پاس رومی شہنشاہ کو جو زبردست شکست دی اس کی وجہ سے اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ عربوں کے زمانے میں ایشیائے کوچک پوری طرح فتح نہیں ہوا تھا۔ آدھے ملک پر مسلمان قابض تھے اور آدھا رومیوں کے قبضے میں تھا جن کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا۔ جب عباسی سلطنت کو زوال ہوا تو ایشیائے کوچک میں رومیوں کا زور بڑھ گیا اور انہوں نے پورا علاقہ مسلمانوں سے چھین لیا۔ رومیوں نے جب یہ دیکھا کہ سلجوقیوں نے ایک بڑی سلطنت قائم کرلی ہے جو رومی سلطنت کے لیے خطرہ ہوسکتی ہے تو رومی شہنشاہ ارمانوس دو لاکھ فوج لے کر الپ ارسلان سے لڑنے کے لیے چلا۔ الپ ارسلان کے پاس صرف پندرہ ہزار فوج تھی اور وہ مقابلہ کے لیے تیار نہ تھا اس لیے اس نے سب سے پہلے صلح کی کوشش کی لیکن ارمانوس نے جواب دیا کہ "صلح تمہارے پایہ تخت رے میں پہنچ کر ہوگی"۔ رومی بادشاہ کے اس جواب کے بعد الپ ارسلان بھی لڑائی کے لیے تیار ہوگیا۔ جمعہ کا دن تھا۔ سلطان نے پہلے نماز پڑھی اور خدا سے فتح کی دُعا مانگی۔ اس کے بعد رومیوں کو شکست ہوئی اور ارمانوس گرفتار ہوگیا۔ جب وہ الپ ارسلان کے سامنے پیش ہوا تو سلطان نے اس کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا اور اس شرط پر اس کو رہا کردیا کہ وہ آئندہ ضرورت پڑنے پر اپنی فوج سے الپ ارسلان کی مدد کیا کرے گا، اور جس قدر مسلمان اس کی قید میں ہیں ان سب کو رہا کردے گا۔ ملازکرد مشرقی ترکی میں جھیل وان کے شمال میں واقع ہے۔

ملازکرد کی جنگ تاریخ کی فیصلہ کن لڑائیوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں پُورا ایشیائے کوچک مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا اور اس خطہ نے بتدریج ترکوں کے وطن کی حیثیت اختیار کرلی۔

الپ ارسلان نے دس سال حکومت کی۔ وہ بڑا فیاض نیک اور عادل بادشاہ تھا۔ اس کے زمانہ میں سارے ملک کے فقیروں اور محتاجوں کے نام رجسٹر میں درج تھے اور حکومت کی طرف سے ان کی مدد کی جاتی تھی۔

ایک مرتبہ الپ ارسلان کو اطلاع ملی کہ اس کے ایک غلام نے ایک دیہاتی کا تہبند چھین لیا ہے۔ الپ ارسلان نے اس جرم میں غلام کو سُولی پر چڑھا دیا۔ اس کی اس سختی کا نتیجہ یہ تھا کہ سارے ملک میں امن وامان تھا اور جرم ختم ہو گئے تھے۔

ملک شاہ (۴۶۵ھ تا ۴۸۵ھ)

الپ ارسلان کے بعد اس کا لڑکا ملک شاہ اٹھارہ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ اس کے زمانہ

میں سلجوقی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ مغرب میں شام فتح ہوا اور جنوب میں یمن اور عمان سلجوقی سلطنت کے ماتحت آ گئے اور مشرق میں چین تک سلطنت کی حدود پھیل گئیں۔ ملک شاہ نے بیس سال حکومت کی۔

ملک شاہ سب سے بڑا اور سب سے اچھا سلجوقی حکمران تھا۔ اس نے رعایا کی آسائش کے لیے رفاہِ عام کے بہت سے کام انجام دیئے۔ بہت سے ٹیکس ختم کر دیئے۔ جگہ جگہ سڑکیں نکلوائیں، سرائیں اور پُل تعمیر کیے۔

اس کو انصاف کا بڑا خیال تھا۔ اس کے زمانہ میں کسی پر ظلم نہیں ہوسکتا تھا اور اگر کسی پر ظلم ہو جاتا تو مظلوم خود آ کر ملک شاہ سے فریاد کر سکتا تھا۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ اس کے فوجیوں نے ایک بیوہ بڑھیا کی گائے پکڑ کر ذبح کر لی۔ بڑھیا کو جب اس کا پتہ چلا تو وہ شہر اصفہان کے اس پُل پر آ کر کھڑی ہوگئی جہاں سے ملک شاہ گزرتا تھا۔ جب بادشاہ اس پُل پر سے گزرا تو بڑھیا نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور کہا:

''بتاؤ تم میرا انصاف اس پُل پر کرو گے یا پُل صراط پر۔''

ملک شاہ گھوڑے سے اُتر پڑا اور کہا ''پُل صراط کی مجھ میں طاقت نہیں اسی پُل پر فیصلہ کروں گا۔''

اب بڑھیا نے اپنا قصہ سنایا۔ ملک شاہ نے بڑھیا کی فریاد سُن کر مجرم فوجیوں کو سخت سزا دی اور بڑھیا کو انعام دے کر مالا مال کر دیا۔

ملک شاہ کے عدل و انصاف کے ایسے کئی واقعات تاریخوں میں موجود ہیں۔

نظام الملک طوسی (۴۰۸ھ تا ۴۸۵ھ)

ملک شاہ نے اپنی سلطنت کا سارا انتظام اپنے وزیر نظام الملک (۱۰۱۸ء/۴۰۸ھ تا ۱۰۹۲ء/۴۸۵ھ) کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ وزیر اپنی خوبیوں میں برامکہ پر بھی بازی لے گیا۔ سلطان الپ ارسلان کے زمانہ میں وہی وزیر تھا۔ اس کی بزرگی کی وجہ سے ملک شاہ اسے بابا کہا کرتا تھا۔ نظام الملک کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تعلیم کی ترقی پر بہت توجہ دی۔ اس نے سلطنت کے ہر حصہ میں بڑے بڑے مدرسے قائم کیے جو اس کے نام پر نظامیہ کہلاتے تھے۔ ان مدرسوں میں سب سے بڑا بغداد کا مدرسہ نظامیہ تھا۔ اس مدرسہ کے خرچ کے لیے بہت بڑی

جائداد وقف تھی۔ تعمیر پر دو لاکھ دینار خرچ ہوئے تھے اور تمام طلباء کو وظیفہ دیا جاتا تھا۔

ملک شاہ نے جب دیکھا کہ نظام الملک مدرسوں پر بے شمار دولت صرف کر رہا ہے تو ایک دن اس نے کہا:

''بابا آپ مدرسوں پر جو روپیہ خرچ کر رہے ہیں اگر وہ فوج پر خرچ کیا جائے تو دنیا فتح کی جاسکتی ہے''

نظام الملک نے جواب دیا: ''بیٹا تم جو فوج بھرتی کرو گے اس کے تیر چند گز سے زیادہ دُور نہیں جاسکیں گے لیکن میں اہل علم کی جو فوج تیار کر رہا ہوں اس کی دعاؤں کے تیر آسمان کے بھی پار چلے جائیں گے۔''

علماء اور ادیبوں کی قدردانی کے علاوہ نظام الملک غریبوں اور محتاجوں کی بھی امداد کرتا تھا۔ وہ خیرات بھی بہت کرتا تھا اور اذان سنتے ہی سارا کام بند کر دیا کرتا تھا اور نماز کے لیے اٹھ جاتا تھا۔

نظام الملک کی عادت تھی کہ جب وہ گھر سے نکلتا تھا تو روپوں کی تھیلیاں غلاموں کے ساتھ ہوتی تھیں اور راستہ میں جس محتاج پر نظر پڑتی تھی اس کو انعام دیتا جاتا تھا۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ اس کی سواری کسی سبزی فروش کی دوکان کی طرف سے نکلی وہ تعظیماً اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ میں محتاج ہوں، موجودہ آمدنی اہل وعیال کے لیے کافی نہیں ہے۔ نظام الملک نے غلام کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے ایک تھیلی دے دی۔ سبزی فروش نے اس پر دُعا دی اور دکان سے اٹھ کر دوسرے راستہ پر جا بیٹھا اور ایک کپڑے سے پاؤں چھپا کر لنگڑا بن گیا، اور نظام الملک سے کہا کہ میں اپاہج ہوں لڑکے بچے بہت ہیں روٹیوں سے محتاج ہو رہا ہوں۔ وزیر نے غلام کو اشارہ کیا۔ اس نے پھر ایک تھیلی دے دی۔ چنانچہ سبزی فروش زر نقد لے کر یہاں سے بھی اٹھا اور آگے بڑھ کر نئے روپ میں نظام الملک کو سلام کر کے کہنے لگا کہ مجھ پر دنیا تنگ ہو رہی ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کا بار سر پر ہے۔ نظام الملک نے اس مرتبہ بھی کچھ دے دیا۔ اس کے بعد آواز بدل کر چوتھی مرتبہ سامنے آیا اور بیان کیا کہ میں اسپیجاب کا باشندہ ہوں اور غازی ہوں۔ افسوس کہ میری فوج نے شکست کھائی اور بڑی مشکل سے بچ کر یہاں تک آیا ہوں۔ اس مرتبہ بھی نظام الملک نے انعام کا حکم دیا مگر یہ کہہ کر کہ ''اے بوڑھے سبزی فروش مفلوج لنگڑے [illegible]

غازی اسپیجابی اپنا انعام لے۔''

نظام الملک کے پاس ہر شخص ہر وقت آسانی کے ساتھ پہنچ سکتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک عورت شکایت لے کر آئی نظام الملک اس وقت دسترخوان پر تھا۔ حاجبوں نے روک دیا۔ نظام الملک کو خبر ہوگئی۔ اس نے حاجبوں کو تنبیہہ کی اور کہا میں نے تم کو غریبوں اور فریادیوں کی خدمت کے لیے رکھا ہے۔ معزز لوگ تو خود پہنچ جاتے ہیں۔

ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ جس زمانہ میں بادشاہ اور وزیر ایسے ہوں جو غریب سے غریب آدمی کی شکایت سننے کو تیار رہتے ہوں تو اس زمانہ میں لوگ کیسے امن سے رہتے ہوں گے۔

اس اچھے وزیر کو ملک شاہ کے انتقال سے چند ماہ قبل ایک شخص نے جو باطنی فرقہ [1] سے تعلق رکھتا تھا قتل کردیا۔ نظام الملک نے سیاست نامہ اور دستور الوزراء کے نام سے دو کتابیں لکھی تھیں۔ یہ کتابیں جو فارسی میں ہیں نظام الملک کے سیاسی تدبر کا شاہکار ہیں اور مسلمانوں کے سیاسی نظریات کا عمدہ نمونہ ہیں۔

الپ ارسلان اور ملک شاہ کے دورِ حکومت پر، جب کہ ان کا وزیر اعظم نظام الملک طوسی تھا، تبصرہ کرتے ہوئے ایک انگریز مؤرخ سر پرسی سائیکس نے حسب ذیل تبصرہ کیا ہے:

''تاریخ دَور میں ایک وسیع وعریض مملکت پر کبھی اس سے بہتر حکومت نہیں کی گئی جیسی کہ الپ ارسلان اور ملک شاہ کے تیس سالہ دَورِ حکومت میں ہوئی۔'' [2]

---

(۱) باطنی ایک اسماعیلی فرقہ ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ شریعت میں ہر ظاہر کے ایک باطنی معنی بھی ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس فرقہ کو باطنی کہا جاتا ہے۔ سلجوقی دَور میں اس فرقہ کا سب سے بڑا رہنما حسن بن صباح (متوفی ۱۱۲۴ء) تھا۔ اس نے ملک شاہ کے آخری دَور میں گیلان کے پہاڑوں میں ایک مقام پر جس کو ''الموت'' کہا جاتا تھا اپنا ایک خفیہ مرکز قائم کرلیا تھا۔ یہاں اس نے ایک مصنوعی جنت بنائی تھی اور قاتلوں کی ایک جماعت تیار کی تھی جن کو فدائی کہا جاتا تھا۔ حسن بن صباح جن لوگوں کو اپنے مذہب کے لیے خطرناک سمجھتا تھا ان کو ان فدائیوں کے ذریعہ قتل کرادیتا تھا۔ وہ ان فدائیوں کو یہ لالچ دیتا تھا کہ اگر تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے تو تم کو جنت میں پہنچا دیا جائے گا اور یہ جنت وہی ہوتی تھی جو اس نے الموت میں بنائی تھی۔

باطنیوں نے اس طریقہ سے بڑے بڑے ممتاز مسلمانوں کو قتل کردیا۔ ان کا سب سے پہلا نشانہ نظام الملک طوسی بنا۔ مشہور مجاہد سلطان صلاح الدین پر بھی انہوں نے حملہ کیا لیکن وہ بچ گیا۔ ملک شاہ کے بعد سلجوقی سلطان سنجر کو بھی انہوں نے قتل کی دھمکی دی اور مشہور عالم اور مفسر قرآن امام رازی کو بھی قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔

ملک شاہ کے بعد جب سلجوقیوں کا زوال شروع ہوا تو ان باطنیوں نے ایران کے بہت سے پہاڑی علاقوں میں اپنی باقاعدہ حکومت قائم کرلی۔ اس حکومت کو ۱۲۵۶ء میں منگول حکمران ہلاکو خاں نے ختم کیا اور قلعہ الموت کو ڈھادیا۔

(۲) تاریخ ایران (انگریزی از سر پرسی سائیکس۔

ملک شاہ کے بعد اس کے لڑکوں محمود اور برکیارُق میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اس آپس کی لڑائی میں سلطنت کمزور ہوگئی اور شام، حجاز اور ایشیائے کوچک یا تو سلجوقیوں کے قبضہ سے بالکل نکل گئے یا مرکزی حکومت کے تسلط سے آزاد ہوگئے۔ سلجوقیوں کی یہ خانہ جنگی اسلامی دنیا کے لیے بڑی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس کی وجہ سے ایک طرف ترکستان اور خراسان کا علاقہ غُز ترکوں نے تاخت وتاراج کردیا، دوسری طرف فلسطین پر یورپ کی مسیحی اقوام قابض ہوگئیں اور تیسری طرف خود اندرون ملک باطنیوں نے زور پکڑلیا۔ بالآخر ۱۳ سال کی خانہ جنگی کے بعد ملک شاہ کے ایک لڑکے محمد (۴۹۸ھ تا ۵۱۱ھ) نے سلجوقی سلطنت کے بڑے حصے میں پھر ایک مستحکم حکومت قائم کردی۔ اب سلجوقی سلطنت اتنی وسیع تو نہیں تھی جتنی ملک شاہ کی تھی لیکن پھر بھی اپنے زمانے کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ عراق، آرمینیہ، ایران، ترکستان اور افغانستان کا مغربی حصہ اب بھی اس سلطنت میں شامل تھا۔

سلجوقیوں کا آخری طاقتور حکمران محمد کا بھائی سنجر (۵۱۱ھ تا ۵۵۲ھ) تھا۔ اس نے چالیس سال سے زیادہ حکومت کی۔ ترکستان اور خراسان کا علاقہ اس کی براہ راست حکومت میں تھا اور باقی مملکت یعنی مغربی ایران اور عراق میں اس کے بھائی اور ان کی اولاد سنجر کی طرف سے حکومت کرتے تھے۔

سنجر ایک عادل اور نیک طبیعت حکمران تھا۔ وہ علم و ادب کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ اس کے دربار میں ادب اور شاعری کا ویسا ہی چرچا رہتا تھا جیسا ہارون الرشید، مامون الرشید اور محمود غزنوی کے درباروں میں رہتا تھا۔ ایک ہمعصر مؤرخ نے لکھا ہے:

''سنجر علماء کا احترام کرتا تھا، اولیاء اللہ سے عقیدت رکھتا تھا۔ اس کے زمانے میں خراسان دارالعلم بن گیا اور وہاں کے بڑے بڑے شہر مدرسوں، کُتب خانوں، علماء اور ارباب کمال سے بھر گئے۔''

امیر معزی (متوفی ۱۱۴۷ء/۵۴۲ھ) اور فارسی کا سب سے بڑا قصیدہ گوشاعر انوری متوفی ۵۴۷ھ اس کے درباری شاعر تھے۔

سنجر اپنی وسیع سلطنت پر آرام سے حکومت کررہا تھا کہ ۱۱۴۰ء/۵۳۶ھ میں شمال مشرق کی طرف سے ایک غیر مسلم ترک قوم نے جو قرہ خطائی کہلاتی تھی حملہ کردیا۔ سنجر نے سمرقند کے قریب مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور ماوراء النہر کا سارا علاقہ سنجر کے قبضہ سے نکل گیا۔ سنجر اب

بھی باقی سلطنت کو سنبھالے رہا لیکن بارہ سال بعد ایک نومسلم ترک قبیلہ جو غُز کہلاتا تھا اور بلخ کے نواح میں آباد تھا باغی ہوگیا۔ سنجر نے ۵۴۸ھ میں ان کے مقابلے میں بھی شکست کھائی اور غزوں کے ہاتھوں قید ہوگیا۔

غزوں نے اپنی اس کامیابی کے بعد سارے خراسان میں تباہی مچادی۔ لوگوں کا قتل عام کیا، مسجدیں اور مدرسے ڈھادیئے اور شہر اور بستیاں اجاڑ دیں۔ منگولوں کے حملے سے قبل اسلامی دور میں خراسان پر ایسی تباہی کبھی نہیں آئی تھی۔ خراسان کی اس تباہی کا شاعر انوری نے ایک نظم میں جو فارسی زبان کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے بڑا دردناک نقشہ کھینچا ہے۔

چار سال کے بعد سنجر غزوں کی قید سے رہا ہوا۔ لیکن اس رہائی کے فوراً بعد اس کا انتقال ہوگیا۔

سنجر کے بعد سلجوقیوں کا زوال شروع ہوگیا۔ ماوراء النہر پہلے ہی ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اب خراسان اور عراق عرب بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ہاں ان کا ایک خاندان کرمان میں ۱۱۸۷ء/ ۵۸۳ھ تک، دوسرا خاندان کردستان میں ۱۱۹۴ء/ ۵۹۰ھ تک اور تیسرا خاندان ایشیائے کوچک میں ۱۳۰۰ء/ ۷۰۰ھ تک حکومت کرتا رہا۔

سلاجقۂ روم

ان چھوٹی چھوٹی سلجوقی حکومتوں میں ایشیائے کوچک کی حکومت جو سلاجقۂ روم کی حکومت کے نام سے مشہور ہے، سب سے بڑی اور پائیدار تھی۔

اس حکومت کا بانی ایک سلجوقی سردار سلیمان تھا جس نے ۱۰۷۷ء/ ۴۷۰ھ میں ترکی کے شمال مغربی کونے میں نائیسیا کے شہر کو فتح کرکے اسے دارالحکومت بنالیا تھا۔ شروع میں یہ حکومت ملک شاہ کی مرکزی حکومت کے تحت تھی لیکن ملک شاہ کی وفات کے بعد جو خانہ جنگی ہوئی اس میں آزاد ہوگئی۔

سلاجقۂ روم کی اہمیت اسی وجہ سے ہے کہ اس زمانے میں یورپ کی قوموں نے مل کر بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے جو صلیبی جنگیں شروع کیں ان کا پہلا نشانہ روم کے یہی سلجوقی ترک بنے۔ یہ صلیبی لشکر عام طور پر ایشیائے کوچک کے راستے شام اور فلسطین کی طرف جاتے تھے۔ سلجوقیوں نے یورپ کی متحدہ فوجوں کے ان حملوں کا پوری قوت سے مقابلہ کیا اور اس طرح انہوں نے عالم اسلام کے دفاع میں بالعموم اور بیت المقدس کی حفاظت میں بالخصوص بڑی مدد کی۔ یورپ

کی پہلی صلیبی یلغار کے سلسلے میں سلطان قلیج ارسلان سلجوقی (۱۰۹۲ء/ ۴۸۵ھ تا ۱۱۰۶ء/ ۵۰۰ھ) نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا اور اگرچہ سلجوقیوں کو نائیسیا کا شہر چھوڑنا پڑا لیکن قلیج ارسلان نے صلیبی فوج کی بیت المقدس کی طرف پیش قدمی میں زیادہ سے زیادہ رکاوٹ ڈالی اور اُن کو کئی بار شکستیں دیں۔ اس کے ان کارناموں کی وجہ سے ترک قلیج ارسلان کو اپنا بہت بڑا ہیرو سمجھتے ہیں۔

نائیسیا کے بعد سلجوقیوں کا دارالحکومت قونیہ ہوگیا جو آخر وقت تک ان کا صدر مقام رہا۔ سلاجقۂ روم میں عزیز الدین کیکاؤس (۶۰۷ھ تا ۶۱۶ھ) اور علاؤ الدین کیقباد اولی (۶۱۶ھ تا ۶۳۴ھ) کا دَور سب سے شاندار تھا۔ اس زمانے میں روم کی سلجوقی سلطنت پورے عروج پر پہنچ گئی اور علمی اور تمدنی حیثیت سے بھی کافی ترقی ہوئی۔ مشہور شاعر جلال الدین رومی، علاؤ الدین کیقباد کے زمانے ہی میں قونیہ آکر آباد ہوئے تھے۔

کارنامے

سلجوقیوں کے تین دارالحکومت تھے۔ طغرل کا دارالحکومت شہر رَے تھا، الپ ارسلان اور سنجر کا مرو اور ملک شاہ کا دارالحکومت اصفہان۔ ان تینوں شہروں نے اس زمانہ میں بڑی ترقی کی، یہاں عالیشان عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ مدرسے، شفاخانے اور مسجدیں بنائی گئیں۔ مرو نے خاص طور پر بڑی ترقی کی اور علم وادب کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ یہاں کے کتب خانے دُور دُور مشہور تھے۔

سلجوقیوں کے زمانہ میں ترقی کے بڑے بڑے کام ہوئے۔ کردستان اور کرمان کے صوبوں کو جو بہت پسماندہ تھے خاص طور پر بڑی ترقی دی گئی۔ اس دَور میں دریائے سیحوں سے دریائے فرات تک کے وسیع علاقہ میں جس میں ترکستان، افغانستان، ایران اور عراق کے ملک شامل ہیں سو سال تک کامل امن وامان رہا۔ ایسا امن اس خطے کو تاریخ میں بہت کم ملا۔ وزیر اعظم نظام الملک نے اس بات پر فخر کرتے ہوئے اپنی کتاب سیاست نامہ میں لکھا ہے:

"اگرچہ بعض خلفاء کی سلطنت اس سے (سلجوقی سلطنت) زیادہ وسیع تھی لیکن ان کا زمانہ کسی وقت بھی بغاوتوں سے خالی نہیں رہا۔ لیکن الحمد للہ اس زمانہ میں کوئی نہیں ہے جو بغاوت کا خیال دل میں لائے اور اطاعت سے انکار کر سکے۔"

ایرانی باشندے سلجوقیوں کے متعلق کہا کرتے تھے کہ جن وحشی ترکوں سے ہم کو اندیشہ تھا اور جن کی حکومت کو ہم ایک آفت ناگہانی سمجھتے تھے ان کے آنے سے ملک کی قسمت بدل گئی۔

سلجوقیوں کا ایک اور بڑا کارنامہ مدرسوں کا قائم کرنا ہے۔ پہلے تعلیم کا انتظام مسجدوں کے اندر ہوتا تھا، لیکن سلجوقی دَور میں لائق وزیر اعظم نظام الملک نے مدرسوں کے لیے باقاعدہ عمارتیں بنانا شروع کیں۔ چنانچہ چند سال کے اندر اندر سرکاری امداد سے ساری سلطنت میں مدرسوں کا جال بچھا دیا گیا۔ سلجوقیوں سے پہلے دنیا کے کسی حصہ میں اس کثرت سے مدرسے کبھی قائم نہیں کیے گئے تھے۔

سلجوقی دَور میں علم و ادب کی بھی خوب سرپرستی کی گئی اور اسلامی دنیا علمی حیثیت سے اس عہد میں اپنے انتہائی نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ فارسی زبان کو خوب ترقی ہوئی اور اب فارسی نثر میں بھی کتابیں لکھی جانے لگیں۔ فارسی شاعری کے لحاظ سے تو یہ دور عہد زریں ہے۔ امیر معزیؔ، انوریؔ، نظامیؔ اور خاقانیؔ جو فارسی زبان کے درجہ اوّل کے شاعر ہوئے ہیں اسی دَور میں تھے۔ ان میں نظامیؔ (۱۱۴۱ء/ ۵۳۵ھ تا ۱۲۰۲ء/ ۵۹۹ھ) اور خاقانیؔ (۱۱۰۷ء/ ۵۰۰ھ تا ۱۱۸۵ء/ ۵۸۲ھ) گنجہ کے رہنے والے تھے جو آج کل سوویٹ یونین کی ریاست آذربائیجان میں ہے۔ ان کا تعلق آذربائیجان کے سلجوقی دربار سے تھا۔

غزالیؒ (۴۵۰ھ تا ۵۰۵ھ)

سلجوقی دَور میں جو اہل علم ہوئے ہیں ان میں امام غزالیؒ (۱۰۵۹ء/ ۴۵۰ھ تا ۱۱۱۱ء/ ۵۰۵ھ) کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ ایک بلند پایہ عالم دین، صوفی اور فلسفی تھے۔ وہ نیشاپور میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے لیکن انہوں نے تعلیم حاصل کرنے میں ایسی ذہانت کا ثبوت دیا کہ ۲۸ سال کی عمر ہی میں ان کے علم و فضل کی شہرت دُور دُور پہنچ گئی اور وہ ابھی ۳۴ سال کے بھی نہیں ہو پائے تھے کہ وزیر اعظم نظام الملک نے ان کو بغداد کے مدرسہ نظامیہ کا صدر مدرس مقرر کر دیا۔ بغداد میں امام غزالیؒ کی بڑی قدر ہوئی اور بڑے بڑے امراء اور رؤساء ان کے عقیدت مندوں میں داخل ہو گئے۔ ان کا اثر و رسوخ اتنا بڑھ گیا کہ ان کے جاہ و جلال کے سامنے امراء، وزراء اور خود دربار خلافت کی شان و شوکت بھی ماند پڑ گئی۔ امام غزالیؒ کو اگرچہ دنیاوی حیثیت سے بڑا عروج حاصل ہو گیا تھا لیکن ان کا دل مطمئن نہیں تھا۔ وہ اس زمانہ کے طور

طریقوں، رسم ورواج اور خیالات سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اخلاقی اور ذہنی حیثیت سے مسلمانوں کی حالت خراب ہوگئی تھی اور مسلمانوں کی زندگی صدر[1] اول کی طرح مثالی نہیں رہی تھی۔ امام غزالیؒ کو امیر اور غریب دونوں سے شکایت تھی۔ وہ حق کی تلاش کرنا چاہتے تھے۔ ان کی بے اطمینانی اتنی بڑھی کہ ایک دن سب کچھ چھوڑ کر بغداد سے نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے گیارہ سال تک شام، فلسطین اور حجاز کے مقدس مقاموں میں، مسجدوں میں اور صحراء میں تنہائی کی زندگی گزار کر عبادت اور ریاضت کی اور غور وفکر میں وقت گزارا۔ خدا نے ان کی یہ محنت قبول کی اور ان کے دل کو مطمئن کر دیا۔ وہ آخر کار اس نتیجہ پر پہنچے کہ ''دنیا میں نبوت کے علم سے بڑھ کر کوئی علم نہیں جس سے روشنی حاصل کی جائے۔'' اب انہوں نے ریاضت اور صحرا نوردی ختم کر دی اور بغداد واپس آ کر لوگوں کی اصلاح اور تصنیف تالیف کا کام شروع کر دیا۔ انہوں نے زوردار کتابیں لکھ کر ان گمراہیوں کو دُور کیا جن میں بہت سے مسلمان اہل علم یونانی فلسفہ کے اثر کی وجہ سے مبتلا تھے۔ امام غزالیؒ نے فلسفہ سے مفید کام لیا اور اس سے اسلامی عقائد اور نظریات کو تقویت دی۔ انہوں نے بتایا کہ حکومت میں، بادشاہوں میں، سرکاری عہدیداروں میں، تاجروں میں، علماء میں اور عوام میں کیسی کیسی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں اور یہ سب لوگ اسلام کی صحیح تعلیم سے کس قدر دُور جا چکے ہیں۔ امام غزالیؒ کی کتابوں نے ایک انقلاب پیدا کر دیا اور ان سے لوگوں کو اپنی زندگی سنوارنے میں بڑی مدد ملی۔ ان کے ایک شاگرد ابن تومرت نے مراکش پہنچ کر ان خیالات کے مطابق ایک حکومت کی بنیاد بھی ڈالی جو ''خلافت موحدین'' کہلاتی ہے اور جس کا حال آگے آئے گا۔

امام غزالیؒ کئی سو کتابوں کے مصنف ہیں۔ دنیا کے بہت کم مصنفوں نے اس کثرت سے اور اتنی اچھی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی سب سے مشہور کتاب احیاء العلوم ہے۔ اس کتاب کا مسلمانوں کی زندگی پر صدیوں تک اثر رہا۔ یورپ کے فلسفیوں اور عالموں کے خیالات بھی اس کتاب سے متاثر ہوئے۔ اصل کتاب عربی میں ہے لیکن اس کا اردو میں ترجمہ ہوگیا ہے۔ امام غزالیؒ نے ایرانیوں کے لیے جن کی زبان فارسی تھی فارسی زبان میں بھی ایک کتاب لکھی۔ اس

---

(1) وہ دَور جب صحابہ، تابعین اور ان کے فوراً بعد آنے والے لوگ جو تبع تابعین کہلاتے ہیں زندہ تھے۔ یہ زمانہ دوسری صدی ہجری کے آخر میں یعنی ہارون الرشید کے عہد خلافت کے اختتام پر ختم ہو جاتا ہے۔

کتاب کا بھی اردو میں کیمیائے سعادت کے نام سے ترجمہ ہو گیا ہے۔ اس کتاب میں احیاء العلوم کے خیالات کو مختصر اور آسان طریقے پر بیان کیا گیا ہے۔

عبدالقادر جیلانیؒ (۴۷۰ھ تا ۵۶۱ھ)

عہد سلجوقی کی علمی دنیا میں دوسری بڑی ہستی مشہور ولی عبدالقادر جیلانیؒ (۱۰۷۷ء/۴۷۰ھ تا ۱۱۶۶ء/۵۶۱ھ) کی ہے۔ ان کے بچپن کا قصہ کہ انہوں نے اپنی ماں کے حکم پر کس طرح عمل کیا اور ڈاکوؤں کے سامنے بھی جھوٹ نہیں بولے بہت مشہور ہے اور اسلامی دنیا کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے۔

عبدالقادر جیلانیؒ ولی ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑے مصلح بھی تھے۔ انہوں نے تعلیم اور تقریر کے ذریعہ ہزاروں لوگوں کی اصلاح کی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ پر پانچ ہزار عیسائی اور یہودی اسلام لائے اور ایک لاکھ مسلمانوں نے ان کے سامنے بُرے کاموں کے کرنے سے توبہ کی۔

وہ بڑے بیباک اور ہمت والے تھے۔ بڑے سے بڑے آدمی کو بھی ٹوک دیتے تھے۔ ایک مرتبہ بغداد میں خلیفہ نے ایک ظالم شخص کو قاضی مقرر کر دیا۔ عبدالقادر جیلانیؒ کو جب معلوم ہوا تو عام جلسہ میں اس پر اعتراض کیا اور خلیفہ سے کہا کہ:

''تم نے ایک ظالم کو قاضی مقرر کر دیا۔ جب تم سے خدا پوچھے گا تو کیا جواب دو گے۔ خلیفہ کو جب معلوم ہوا تو اس نے قاضی کو فوراً برطرف کر دیا۔''

عبدالقادر جیلانیؒ بادشاہ نہیں تھے، لیکن ان کی فیاضی بادشاہوں سے بڑھی ہوئی تھی۔ ان کے عقیدت مند ان کو جو کچھ دیتے تھے وہ سب بھوکوں اور ضرورت مندوں پر خرچ کر دیتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر ساری دنیا کی دولت میرے قبضہ میں ہو تو میں بھوکوں اور غریبوں پر خرچ کر دوں۔

عمر خیام اور رُومی

فارسی کا مشہور شاعر عمر خیام (۱۰۴۸ء/۴۴۰ھ تا ۱۱۳۲ء/۵۲۶ھ) جس کی رباعیاں بہت مشہور ہیں، وہ بھی اسی سلجوقی دور میں ہوا ہے۔ وہ ملک شاہ اور سنجر کے زمانہ میں تھا۔ خیام اگرچہ شاعر کی حیثیت سے مشہور ہے لیکن وہ حقیقت میں اپنے زمانہ کا سب سے بڑا ریاضی دان تھا۔ اس نے ایک کیلنڈر تیار کیا تھا جو تقویم جلالی کہلاتا تھا۔ یہ کیلنڈر انگریزی کے موجودہ کیلنڈر سے بھی زیادہ صحیح تھا۔ اس کے علاوہ ریاضی کی ایک شاخ علم جبر و مقابلہ (الجبرا) میں مسلمانوں میں

آخری اضافہ عمر خیام ہی نے کیا۔

سلجوقی دَور کے ایک اور بڑے آدمی جلال الدین رومی (۱۲۰۷ء/ ۶۰۴ھ تا ۱۲۷۳ء/ ۶۷۲ھ) ہیں۔ ان کا تعلق سلجوقیوں کے اس زمانہ سے ہے جب ان کی حکومت صرف ایشیائے کوچک میں رہ گئی تھی۔ مولانا روم پیدا تو بلغ میں ہوئے تھے لیکن جب بائیس سال کی عمر ہوئی تو اپنے والد کے ساتھ ایشیائے کوچک کے شہر قونیہ میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ایشیائے کوچک کا علاقہ اس زمانہ میں روم کے نام سے مشہور تھا اس لیے وہ مولانا روم یا رومی کہلاتے ہیں۔ قونیہ میں انہوں نے ایک کتاب لکھی جو مثنوی کہلاتی ہے۔ یہ کتاب شعروں میں ہے اور شاہنامہ کی طرح آج تک شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ لیکن مثنوی میں شاہنامہ کی طرح بے سرو پا باتیں نہیں ہیں بلکہ اس میں بڑی عقلمندی اور سمجھ کی باتیں ہیں۔

ان ہستیوں کے علاوہ سلجوقی دَور میں اور بھی کئی عظیم مصنف اور اہل قلم ہوئے ہیں، جنہوں نے علم وفن کی دنیا میں نئی نئی راہیں نکالیں اور جن کا نام آج بھی زندہ ہے۔ مثلاً جار اللہ زمخشری (متوفی ۱۱۴۴ء/ ۵۳۸ھ) جو لغت اور ادب کے امام تھے۔ وہ کشاف کے نام سے قرآن کی ایک تفسیر کے مصنف بھی ہیں جو عقلی اور ادبی نقطہ نظر سے ایک بلند پایہ تفسیر سمجھی جاتی ہے۔

محمد بن عبدالکریم شہرستانی (۱۰۷۶ء/ ۴۶۹ھ تا ۱۱۵۳ء/ ۵۴۸ھ) اپنے زمانے کے بہت بڑے ماہر علم کلام تھے۔ ان کی کتابوں میں سب سے مشہور الملل والنحل ہے جس میں انہوں نے اپنے زمانے کے تمام مذہبوں اور فلسفیانہ عقائد سے بحث کی ہے۔

اس دَور کے حکماء میں عمر خیام کے بعد سب سے اہم شخصیت خازنی کی ہے۔ اور اس کی کتاب میزان الحکمت قرون وسطیٰ میں علم طبیعیات پر لکھی ہوئی کتابوں میں درجۂ اول کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ خازنی نے فلکی مشاہدے بھی کیے اور اپنے ان تجربوں کو ایک کتاب میں قلم بند کیا جو زیج سنجری کہلاتی ہے۔ خازنی سنجر کے زمانے میں تھا۔

ادیبوں میں حریری (۱۰۵۴ء/ ۴۶۶ھ تا ۱۱۲۲ء/ ۵۱۶ھ) کا نام بہت ممتاز ہے۔ اس کی کتاب مقامات عربی انشاء پردازی کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ عہد غزنوی میں ہمدانی نے جو طرز انشاء شروع کیا تھا حریری نے اس کو عروج پر پہنچا دیا۔ حریری عراق کا باشندہ تھا۔

• اس دَور کی ایک اور عظیم شخصیت عبداللہ انصاری (۱۰۰۶ء/ ۳۹۶ھ تا ۱۰۸۸ء/ ۴۸۱ھ)

کی ہے جو پیر ہرات کے نام سے مشہور تھے۔ وہ ایک عالم باعمل، صوفی اور شاعر تھے۔ ان کی صوفیانہ شاعری نے بعد کے بلند پایہ صوفی شاعروں پر، جیسے سنائی اور رومی ہیں بہت اثر ڈالا۔ ان کے "رسالہ مناجات" کے بارے میں ایک انگریز مستشرق نے لکھا ہے کہ "یہ مختصر کتاب دانش و حکمت اور سچی خدا ترسی کا ایک خزانہ ہے"

معاشرہ

سلجوقی دور کے ان تمام کارناموں کے ساتھ ایک دوسرا پہلو بھی قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ تمام سیاسی، علمی اور تمدنی ترقیوں کے باوجود اس دور میں اخلاقی لحاظ سے مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ پانچ سو سال کی مسلسل ترقی اور دولت کی فراوانی نے اب مسلمانوں کو آرام طلب اور عیش پسند بنا دیا تھا۔ عیش پسندی نے خود غرضی کا جذبہ پیدا کیا اور جب خود غرضی پیدا ہوئی تو لوگ دوسروں کا حق مارنے لگے اور اس طرح مسلمانوں میں بددیانتی اور دوسری اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئیں جن سے حضرت عمرؓ ڈرتے تھے اور جس کا اظہار آپ نے اس وقت کیا تھا جب مدائن کی فتح کے بعد کسریٰ کا خزانہ مدینہ پہنچا تھا۔

اس کے علاوہ غیر مسلموں سے میل جول اور فلسفہ اور دوسرے مذاہب کی کتابوں کے عربی میں ترجمے ہو جانے سے مسلمانوں کے عقائد بھی متاثر ہوئے اور ان میں گمراہ کن خیالات پھیلنے لگے۔ اس بات نے ایک طبقہ میں اسلام پر ایمان کو کمزور کر دیا اور جب ایمان کمزور ہو گیا تو عمل میں بھی فرق پڑا۔

سلجوقی دور کے مصنفوں کی تحریروں سے ہمیں اس اخلاقی زوال کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ امام غزالیؒ نے اپنی مشہور کتاب احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ:

"رعایا اس وجہ سے ابتر ہو گئی کہ سلاطین کی حالت بگڑ گئی اور سلاطین کی حالت اس وجہ سے بگڑ گئی کہ علماء کی حالت بگڑ گئی اور علماء کی خرابی اس وجہ سے ہے کہ جاہ و مرتبہ کی محبت نے ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔"

سلطنتِ سلجوقیہ

عہدِ عُروج

(۱۰۳۷ء/۴۲۹ھ تا ۱۱۵۷ء/۵۵۲ھ)

۱۔ طغرل ۱۰۳۷ء/۴۲۹ھ تا ۱۰۶۳ء/۴۵۵ھ

۲۔ الپ ارسلان ۱۰۶۳ء/۴۵۵ھ تا ۱۰۷۲ء/۴۶۵ھ

۳۔ ملک شاہ ۱۰۷۲ء/۴۶۵ھ تا ۱۰۹۲ء/۴۸۵ھ

۴۔ محمود ۱۰۹۲ء/۴۸۵ھ تا ۱۰۹۴ء/۴۸۷ھ

۵۔ برکیارق ۱۹۰۴ء/۴۸۷ھ تا ۱۱۰۴ء/۴۹۸ھ

۶۔ محمد ۱۱۰۴ء/۴۹۸ھ تا ۱۱۱۷ء/۵۱۱ھ

۷۔ سنجر ۱۱۱۷ء/۵۱۱ھ تا ۱۱۵۷ء/۵۵۲ھ

ملازکرد کی جنگ ۱۰۷۱ء/۴۶۵ھ

عباسی خلفاء

(جو بنی بویہ اور سلجوقی حکمرانوں کے ماتحت تھے)

۱۔ مستکفی باللہ ۱۹۴۴ء/۳۳۳ھ تا ۹۴۵ء/۳۳۴ھ

۲۔ مطیع للہ ۹۴۵ء/۳۳۴ھ تا ۹۷۴ء/۳۶۳ھ

۳۔ طائع اللہ ۹۷۴ء/۳۶۳ھ تا ۹۹۱ء/۳۸۱ھ

۴۔ قادر باللہ ۹۹۱ء/۳۸۱ھ تا ۱۰۳۱ء/۴۲۲ھ

۵۔ قائم بامراللہ ۱۰۳۱ء/۴۲۲ھ تا ۱۰۷۴ء/۴۶۷ھ

(اس خلیفہ کے عہد میں طغرل سلجوقی ۴۴۷ھ میں بغداد میں داخل ہوا اور بنی بویہ کا غلبہ ختم ہوا)

۶۔ مقتدی بامراللہ ۱۰۷۴ء/۴۶۷ھ تا ۱۰۹۴ء/۴۸۷ھ

۷۔ مستظہر باللہ	۱۰۹۴ء/۴۸۷ھ تا ۱۱۱۸ء/۵۱۲ھ
۸۔ مسترشد باللہ	۱۱۱۸ء/۵۱۲ھ تا ۱۱۳۴ء/۵۲۹ھ
۹۔ راشد باللہ	۱۱۳۴ء/۵۲۹ھ تا ۱۱۳۵ء/۵۳۰ھ
۱۰۔ مقتضی لامراللہ	۱۱۳۵ء/۵۳۰ھ تا ۱۱۶۰ء/۵۵۵ھ

(اس کے عہد میں ۱۱۵۲ء/۵۴۷ھ میں عباسی خلفاء سلجوقی اقتدار سے آزاد ہوئے)

مزید مطالعہ کے لیے

۱۔ تاریخ اسلام حصہ چہارم از شاہ معین الدین احمد ندوی۔

۲۔ تاریخ اسلام حصہ سوم از اکبر شاہ خان نجیب آبادی۔

۳۔ نظام الملک طوسی از عبدالرزاق کانپوری۔ یہ کتاب اگرچہ وزیر اعظم نظام الملک کے حالات میں ہے لیکن اس میں سلجوقی دَور کی سیاسی، علمی اور معاشرتی تاریخ سے متعلق قیمتی اور مفید معلومات ہیں۔ عمر خیام اور حسن بن صباح اور باطنی تحریک کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔

۴۔ سلاجقہ از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ سلاجقہ کے آغاز سے ملک شاہ کے دَور تک کی تاریخ ہے۔

۵۔ شعر العجم از شبلی نعمانی حصہ اول۔

۶۔ تاریخ دعوت وعزیمت حصہ اول از سید ابوالحسن علی ندوی۔
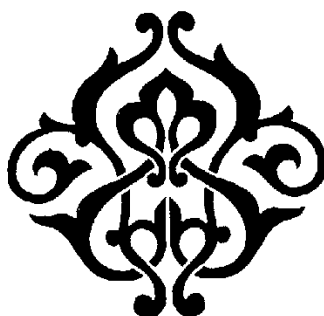
باب ۱۶

پٹھان میدانِ عمل میں

غزنی کی سلطنت کے خاتمہ کے بعد غوری خاندان کی جو حکومت قائم ہوئی وہ اگرچہ صرف پچاس سال قائم رہی لیکن تاریخ اسلام میں اس کو اس وجہ سے بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اس زمانہ میں شمالی ہند میں اور مشرقی پاکستان میں پہلی مرتبہ اسلامی حکومت کی بنیاد پڑی۔

غوری خاندان کی حکومت کو تاریخ میں ''آل شنسب'' کی حکومت بھی کہا جاتا ہے۔ شروع میں یہ خاندان غزنی کی حکومت کا باجگذار تھا اور کابل اور ہرات کے درمیان غور کے پہاڑی علاقہ پر اس کی حکومت تھی۔ اس علاقہ کا مرکز فیروز کوہ تھا۔ غور کے باشندے نسلاً پٹھان تھے۔ اب تک اسلامی تاریخ میں جن قوموں نے نمایاں کردار ادا کیا تھا وہ عرب، ایرانی، ترک اور بربر تھے۔ غوریوں کے دورِ حکومت میں پٹھان پہلی مرتبہ اسلامی تاریخ میں ایک عظیم قوم کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔

سلطان ابراہیم غزنوی (۴۵۱ھ تا ۴۹۲ھ) کے بعد غور کے حکمران ملک عزالدین حسین نے خود مختاری حاصل کر لی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سیف الدین سوری حکمران ہوا۔ اس نے بہرام شاہ غزنوی (۵۱۲ھ تا ۵۴۷ھ) کے زمانہ میں غزنی پر حملہ کیا اور شہر پر قبضہ کر کے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ لیکن بہرام شاہ نے جلد ہی غزنی کو اس سے چھین لیا اور سیف الدین کو قتل کرا دیا۔ جب سیف الدین کے بھائی علاؤ الدین حسین کو جسے بعد میں جہاں سوز کے نام سے پکارا گیا، اطلاع ملی تو اس نے بھائی کا انتقام لینے کے لیے غزنی پر حملہ کر دیا۔ شہر کو آگ لگا دی اور سات دن تک قتل عام کیا جس کا عہد غزنوی والے باب میں تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

۵۵۱ھ میں علاؤ الدین جہاں سوز کا انتقال ہو گیا۔ غور کے علاقے میں اب تک قرامطہ اور اسمٰعیلی فرقہ کا بہت اثر تھا۔ علاؤ الدین جہاں سوز بھی ان کا ہم عقیدہ تھا۔ لیکن جب اس کا لڑکا سیف الدین ثانی جو راسخ العقیدہ مسلمان تھا تخت پر بیٹھا تو اس نے غور کے علاقے سے قرامطہ کا اثر ختم کر دیا۔

غور کے خاندان نے حقیقی اہمیت دو بھائیوں غیاث الدین اور شہاب الدین محمد غوری کے زمانے میں حاصل کی جو سیف الدین ثانی کے چچازاد بھائی تھے اور سیف الدین کے انتقال کے بعد یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ غیاث الدین غوری نے ۱۱۷۳ء/۵۶۷ھ میں غزنی کو مستقل طور پر فتح کرلیا اور شہاب الدین محمد غوری کو سلطان معزالدین کا خطاب دے کر غزنی میں تخت پر بٹھایا۔ غیاث الدین نے اس دوران ہرات اور بلخ بھی فتح کرلیے اور ہرات کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔

سلطان شہاب الدین غوری اگرچہ اپنے بھائی کا نائب تھا لیکن اس نے غزنی میں ایک آزاد حکمران کی حیثیت سے حکومت کی اور پاکستان اور شمالی ہندوستان کو فتح کرکے تاریخ میں مستقل مقام پیدا کرلیا۔ ۵۹۸ھ میں اپنے بھائی کے انتقال کے بعد وہ پوری غوری سلطنت کا حکمران بن گیا۔

غزنی کا علاقہ پاکستان کی سرحد سے ملا ہوا تھا اس لیے شہاب الدین محمد غوری کی فوجی کاروائیاں اسی خطے سے شروع ہوئیں اور وہ مشہور عالم درۂ خیبر سے زیادہ درۂ گومل کے راستے پاکستان میں داخل ہوا۔ اس نے سب سے پہلے ملتان اور اوچھ پر حملے کیے جو غزنویوں کے زوال کے بعد ایک بار پھر اسمٰعیلی فرقہ کے گڑھ بن گئے تھے۔ یہ اسمٰعیلی ایک طرف مصر کے فاطمی خلفاء کے ساتھ اور دوسری طرف ہندوستان کے ہندوؤں سے قریبی تعلق قائم کیے ہوئے تھے۔ غور کے حکمران عام مسلمانوں کی طرح عباسی خلافت کو تسلیم کرتے تھے اور وہ اسمٰعیلیوں کی سرگرمیوں کو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف سمجھتے تھے۔ محمد غوری نے ۱۱۷۵ء/۵۷۱ھ میں ملتان اور اوچھ دونوں شہر فتح کرلیے، اس کے بعد ۱۱۷۹ء/۵۷۵ھ میں محمد غوری نے پشاور اور ۱۱۸۲ء/۵۷۶ھ میں دیبل کو فتح کرکے غوری سلطنت کی حدود بحیرۂ عرب کے ساحل تک بڑھادیں۔ لاہور اور اس کے نواح کا علاقہ ابھی تک غزنوی خاندان کے قبضہ میں تھا جن کی حکومت غزنی پر جہاں سوز کے حملے کے بعد لاہور منتقل ہوگئی تھی۔ شہاب الدین محمد غوری نے ۱۱۸۶ء/۵۸۲ھ میں لاہور پر قبضہ کرکے غزنوی خاندان کی حکومت کو بالکل ختم کردیا۔

لاہور اور مغربی پاکستان کو فتح کرنے کے بعد شہاب الدین نے بٹھنڈہ کو فتح کیا جو پہلے غزنوی سلطنت میں شامل تھا لیکن اس وقت دہلی اور اجمیر کے ہندو راجہ پرتھوی راج کے قبضہ میں تھا۔ پرتھوی راج نے جب یہ سنا کہ شہاب الدین غوری نے بٹھنڈہ فتح کرلیا تو وہ ایک زبردست

فوج لے کر جس کی تعداد دو لاکھ تھی مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکلا۔ دہلی کے شمال مغرب میں کرنال کے قریب تلاوڑی کے میدان میں دونوں فوجوں میں لڑائی ہوئی لیکن شہاب الدین کی فوج تھوڑی تھی اس کو شکست ہوئی اور بُری طرح زخمی ہو گیا۔ اسی حالت میں ایک سپاہی اس کو بچا کر لے گیا۔ شہاب الدین کو اس شکست کا اتنا رنج ہوا کہ ایک سال تک اس نے عیش و آرام کی زندگی نہیں گزاری۔ اس کے بعد ایک بڑی فوج لے کر پچھلی شکست کا بدلہ لینے کے لیے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ ادھر سے پرتھوی راج بھی بھارت کے دوڈھائی سو راجاؤں کی مدد سے ایک بڑی فوج لے کر روانہ ہوا۔ اس مرتبہ بھی مقابلہ تلاوڑی کے میدان میں ہوا لیکن شہاب الدین غوری کو فتح ہوئی اور ہندوؤں کو شکست۔ پرتھوی راج لڑائی میں مارا گیا۔

پرتھوی راج کو شکست دینے کے بعد شہاب الدین نے دہلی اور اجمیر بھی فتح کر لیا۔ اور اس کے سپہ سالار بختیار خلجی نے آگے بڑھ کر بہار اور مشرقی پاکستان فتح کر لیا۔ اس طرح پورا شمالی ہند اور پاکستان مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔

ہندوستان اور بنگال میں مسلم اقتدار کے بانی اور ایک بیدار مغز حکمران کی حیثیت سے شہاب الدین کا پایہ بہت بلند ہے۔ اس کی فتوحات محمود غزنوی کی لشکر کشی کے مقابلہ میں زیادہ مفید ثابت ہوئیں۔ وہ محمود کی طرح کسی علاقہ کو فتح کر کے واپس نہیں جاتا تھا بلکہ اس کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیتا تھا۔ اس نے برکوچک، پاکستان و ہند میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم کر دی اور اس طرح وہ کام مکمل کر دیا جو پانچ سو سال پہلے محمد بن قاسم نے شروع کیا تھا۔

شہاب الدین کے زمانہ میں غیر مسلموں نے کثرت سے اسلام قبول کیا۔ دریائے جہلم اور سندھ کے درمیان کھوکھر نامی ایک قوم آباد تھی۔ ان کے یہاں ایک مسلمان قید تھا۔ یہ مسلمان ان لوگوں کو اسلام کی خوبیاں بیان کرتا رہتا تھا جسے وہ لوگ بڑی دلچسپی سے سنتے تھے۔ ایک دن ان کے سردار نے کہا:

''اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو تمہارا بادشاہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟''

مسلمان قیدی نے جواب دیا:

''اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو میں یقین دلاتا ہوں کہ بادشاہ تمہارے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرے گا''

کھوکھروں کے سردار نے جب یہ بات سنی تو اسلام لے آیا۔ مسلمان نے ایک خط کے ذریعہ اپنی گفتگو کی اطلاع سلطان شہاب الدین کو دی۔ شہاب الدین نے اس کے جواب میں سردار کو انعام واکرام دیا اور اس علاقہ کی جاگیر اس کو دے دی۔

اس کے بعد اس کی قوم نے بھی اسلام قبول کرلیا۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے کھوکھر بہت سی برائیوں میں مبتلا تھے جن میں ایک ''دختر کشی'' بھی تھی۔ یہ لوگ عہد جاہلیت کے عربوں کی طرح لڑکیوں کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد یہ بُری رسم بھی ختم ہوگئی۔ پاکستان میں بلوچستان کے پہاڑی علاقوں کے پٹھان بھی اسی زمانے میں اسلام لائے۔

اس تمام مدت میں شہاب الدین محمد غوری کا بھائی غیاث الدین ہرات پر حکومت کرتا رہا۔ اس نے ہرات کے شہر کو بڑی ترقی دی اور وہاں ایک شاندار جامع مسجد تعمیر کرائی جو آج بھی موجود ہے اور شہر ہرات کی سب سے اہم اور بڑی عمارت ہے۔ غیاث الدین نے ۴۶ سال حکومت کی اور ۹۸ھ میں اس کے انتقال کے بعد شہاب الدین محمد غوری ہرات میں بھائی کی جگہ پوری غوری سلطنت کا بادشاہ ہوگیا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب سلجوقیوں کے بعد خراسان اور ترکستان پر خوارزم شاہی خاندان کی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ غوریوں کی اس خاندان سے مسلسل لڑائیاں رہتی تھیں۔ غیاث الدین کے بعد شہاب الدین کے زمانے میں بھی یہ لڑائیاں جاری رہیں۔ ان لڑائیوں کے سلسلے میں شہاب الدین ۶۰۱ھ میں خوارزم تک پہنچ گیا لیکن وہاں اس کو شکست ہوئی اور یہ مشہور ہوگیا کہ محمد غوری جنگ میں کام آ گیا۔ اس خبر کے پھیلنے پر پنجاب کے کھوکھروں نے بغاوت کر دی۔ محمد غوری فوراً پنجاب آیا اور بغاوت فرو کی۔ لیکن بغاوت فرو کرنے کے بعد جب وہ واپس جا رہا تھا تو دریائے جہلم کے کنارے ایک اسمٰعیلی فدائی نے حملہ کر کے اس کو شہید کر دیا۔ شہاب الدین محمد غوری کی شہادت کے ساتھ غوری خاندان کی حکومت بھی ختم ہوگئی۔ ہرات اور غزنی کے علاقوں پر خوارزم شاہ کی حکومت قائم ہوگئی اور برصغیر پاکستان و ہندوستان میں محمد غوری کے وفادار غلام قطب الدین ایبک نے جو دہلی میں سلطان کا نائب تھا ایک مستقل اسلامی حکومت قائم کرلی۔

غوریوں کے زمانہ کے علماء میں امام فخر الدین رازی (۱۱۴۹ء/۵۴۳ھ تا ۱۲۰۹ء/ ۶۰۶ھ) کا نام بہت ممتاز ہے۔ وہ پیدا تو شہر رے میں ہوئے تھے لیکن زندگی کے آخری ۲۴

سال غزنی اور ہرات میں گزارے۔ ہرات میں ان کے لیے ایک مدرسہ قائم کر دیا گیا تھا جہاں وہ درس دیتے تھے۔ امام رازی نے علم کلام اور فقہ میں کئی اہم کتابیں لکھیں لیکن ان کی شہرت تفسیر کبیر کی وجہ سے ہے جو قرآن کی بہترین تفسیروں میں شمار کی جاتی ہے۔ سلطان غیاث الدین غوری کے عقائد کی اصلاح میں امام رازی کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی اصلاحی کوششوں کی وجہ سے باطنی ان کے دشمن ہو گئے تھے۔

عہد غوریہ کی دوسری اہم شخصیت خواجہ معین الدین چشتی متوفی ۱۲۳۵ء/ ۶۳۳ھ کی ہے۔ وہ شہاب الدین محمد غوری کے ساتھ ہندوستان آئے اور اجمیر میں رہائش اختیار کی اور وہاں کے غیر مسلموں میں اسلام پھیلایا۔

سلطنت غوریہ

(۵۵۲ھ تا ۶۰۲ھ)

۱۔غیاث الدین غوری	۱۱۵۷ء/۵۵۲ھ تا ۱۲۰۲ء/۵۹۸ھ
۲۔شہاب الدین غوری	۱۲۰۲ء/۵۹۸ھ تا ۱۲۰۶ء/۶۰۲ھ
تلاوڑی کی پہلی جنگ	۱۱۹۱ء/۵۸۷ھ
تلاوڑی کی دوسری جنگ	۱۱۹۲ء/۵۸۸ھ
دہلی کی فتح	۱۱۹۲ء/۵۸۸ھ
مشرقی پاکستان کی فتح	۱۱۹۸ء/۵۹۵ھ

مالوہ کی فتح	۱۱۹۹ء/۵۹۶
گوالیار کی فتح	۱۲۰۰ء/۵۹۶
کالپی اور کالنجر کی فتح	۱۲۰۲ء/۵۹۸

مزید مطالعہ کے لیے

۱۔آئینہ حقیقت نما از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

۲۔تاریخ اسلام اکبر شاہ خاں نجیب آبادی حصہ چہارم

۳۔امام رازی از عبدالسلام ندوی (دارالمصنفین ،اعظم گڑھ)

اردو میں سلاطین غور سے متعلق کوئی مستقل اور اچھی کتاب موجود نہیں۔ مذکورہ بالا کتابوں میں ان سے متعلق مفید معلومات ہیں۔ان کے علاوہ تاریخ فرشتہ کا اردو ترجمہ حصہ اول اور تاریخ ہندوستان از ذکاءاللہ حصہ اوّل بھی ملاحظہ کیجیے۔

باب ۱۷

ہلال اور صلیب کی کش مکش

جس طرح ہم عرب کو ایک مقدس ملک سمجھتے ہیں کیونکہ یہاں اسلام کا آغاز ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی گزاری اسی طرح عیسائی فلسطین کے شہر بیت المقدس کو مقدس شہر سمجھتے ہیں کیونکہ وہاں سے عیسائی مذہب کا آغاز ہوا اور وہیں حضرت عیسیٰؑ نے زندگی گزاری۔ بیت المقدس پر مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں بغیر کسی لڑائی کے صلح کے ذریعے قبضہ کیا تھا جس کا ذکر حضرت عمرؓ کے حالات میں کیا جا چکا ہے۔ یہ قبضہ سلجوقیوں کے زمانے تک قائم رہا لیکن ملک شاہ کے انتقال کے بعد جب سلجوقیوں کو زوال ہوا تو شام اور ایشیائے کوچک ایک بار پھر چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ گئے۔ یہ حکومتیں آپس میں لڑا کرتی تھیں۔ اسی زمانے میں بیت المقدس پر فاطمی حکومت کا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔ جب عیسائیوں نے مسلمانوں کی یہ کمزوری دیکھی تو انہوں نے فلسطین کو مسلمانوں کے قبضے سے واپس لینے کی کوشش شروع کر دی۔ فلسطین اور خاص طور پر بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے عیسائیوں نے جو لڑائیاں لڑیں وہ صلیبی[1] جنگیں کہلاتی ہیں۔ اس

---

(۱) ان صلیبی جنگوں کی تعداد جو بیت المقدس حاصل کرنے کے لیے یورپ والوں نے لڑیں کل آٹھ ہیں:

۱۔ پہلی جنگ (۱۰۹۶ تا ۱۰۹۹ء) میں یورپ کی متحدہ فوجوں نے بیت المقدس، فلسطین اور ساحل شام کے علاقے فتح کر لیے۔

۲۔ دوسری جنگ (۱۱۴۷ء تا ۱۱۴۹ء) عماد الدین زنگی کی کامیابیوں کو روکنے کے لیے لڑی گئی۔ اس جنگ کی قیادت جرمنی کے شہنشاہ کونراڈ سوم اور فرانس کے بادشاہ لوئی سوم نے کی۔ عماد الدین کی وفات ہوگئی تھی اس لیے اس کے لڑکے نور الدین زنگی کو اس متحدہ فوج کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن صلیبیوں کو کامیابی نہیں ہوئی۔

۳۔ تیسری جنگ (۱۱۸۹ء تا ۱۱۹۲ء) سب سے بڑی اور مشہور ہے۔ یہ اس وقت شروع کی گئی جب صلاح الدین نے بیت المقدس فتح کر لیا۔ اس کی قیادت برطانیہ کے رچرڈ شیر دل، (بقیہ حاشیہ) فرانس کے بادشاہ فلپ اور جرمنی کے شہنشاہ فریڈرک باربروسہ نے کی۔ فریڈرک ایشیائے کوچک میں ایک دریا میں ڈوب گیا۔ رچرڈ اور فلپ بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

۴۔ چوتھی جنگ (۱۲۰۲ء تا ۱۲۰۴ء) اس جنگ میں یورپ کے صلیبی مجاہد آپس میں لڑ پڑے۔ یورپ کے شہروں میں قتل و غارت کی اور بیت المقدس کی بجائے یورپ کے مسیحی شہر قسطنطنیہ کو فتح کیا۔

۵۔ پانچویں جنگ (۱۲۱۸ء تا ۱۲۲۱ء) کے دوران یورپ کے صلیبی لشکر نے مصر پر حملہ کیا۔ ملک کامل ایوبی نے شکست دی۔

۶۔ چھٹی جنگ (۱۲۲۸ء تا ۱۲۲۹ء) جرمنی کا شہنشاہ فریڈرک دوم اس مہم کا قائد تھا۔ جنگ نہیں ہوئی اور ملک کامل نے باہمی تصفیہ کے ذریعہ بیت المقدس عیسائیوں کے سپرد کر دیا۔ لیکن ملک کامل کے بعد مسلمانوں نے شہر واپس لے لیا۔

۷۔ ساتویں جنگ (۱۲۴۸ء تا ۱۲۴۹ء) اس کا قائد فرانس کا لوئی نہم تھا۔ مصر پر حملہ کیا گیا۔ ملک الصالح ایوبی نے مقابلہ کیا۔ شہنشاہ لوئی گرفتار ہوگیا۔ اور بعد میں فدیہ دے کر رہا ہوا۔

۸۔ آٹھویں جنگ (۱۲۷۰ء تا ۱۲۷۱ء) لوئی نہم نے رہائی کے بعد پھر ایک کوشش کی۔ اس مرتبہ انگلستان کا شاہ ایڈورڈ بھی شامل تھا لیکن رخ تونس کا کیا اور وہیں لوئی نے وفات پائی اور یہ آخری صلیبی جنگ بھی ناکامی پر ختم ہوئی۔

ان لڑائیوں کے علاوہ ایک اور جنگ قابل ذکر ہے جو بچوں کی صلیبی جنگ کہلاتی ہے۔ یورپ والوں کا خیال تھا کے بڑے لوگ چونکہ گناہوں کے کام کرتے ہیں اس لیے اللہ ان کو مسلمانوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں کرتا اس لیے انہوں نے معصوم اور نابالغ بچوں کی ایک فوج ۱۲۱۲ء میں فرانس سے بھیجی۔ لیکن مارسلز کی بندرگاہ تک پہنچتے پہنچتے یہ بچے تتر بتر ہو گئے اور خود عیسائیوں نے ان کے ساتھ بدسلوکی کی، لوٹ مار کی اور غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ بچوں کی صلیبی جنگ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ اس زمانے میں یورپ کی قومیں ذہنی لحاظ سے کس قدر پست تھیں۔

زمانے میں عیسائیوں کی حکومت صرف یورپ کے براعظم میں تھی۔ سلجوقیوں کے زوال کے بعد جرمنی، فرانس، اٹلی اور یورپ کے دوسرے ملکوں سے ایک زبردست فوج بیت المقدس روانہ ہوئی۔ پہلی فوج کو تو مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی اور اسے روم کے سلجوقی ترکوں نے ختم کردیا لیکن جب دوسری فوج روانہ ہوئی تو مسلمان آپس کی نااتفاقیوں کی وجہ سے عیسائیوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ عیسائیوں نے ایشیائے کوچک اور شام کا تمام ساحلی علاقہ فتح کر کے ۴۹۲ھ میں بیت المقدس بھی فتح کر لیا۔ یہاں عیسائی سپاہیوں نے مسلمان مردوں اور عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا۔ جن لوگوں نے مسجد اقصیٰ میں پناہ لی ان کو بھی نہیں چھوڑا۔ کہتے ہیں کہ اس قتل عام میں ستر ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ یورپ کے ان عیسائیوں نے اب پورے فلسطین اور شام کے ساحلی علاقہ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

شام کے اندرونی شہر حلب، حماۃ، حمص، بعلبک اور دمشق پر صلیبی کبھی بھی قابض نہ ہو سکے۔ مسیحیوں نے اپنے مقبوضہ علاقوں میں ذیل کی چار ریاستیں قائم کرلیں جو لاطینی ریاستیں کہلاتی تھیں۔

۱۔ پہلی ریاست ۱۰۹۷ء میں قائم ہوئی۔ اس کا صدر مقام الرھا تھا۔

۲۔ دوسری ریاست ۱۰۹۸ء میں قائم ہوئی اور اس کا صدر مقام انطاکیہ تھا۔

۳۔ تیسری ریاست فلسطین کی تھی جو ۱۰۹۹ء میں قائم ہوئی۔ اس کا صدر مقام یروشلم تھا۔

۴۔ چوتھی ریاست ۱۱۰۹ء میں قائم ہوئی اور اس کا مرکز طرابلس الشام تھا۔

ان ریاستوں میں فلسطین کی ریاست سب سے بڑی تھی۔ اس کے حکمران کی حیثیت شہنشاہ کی تھی اور باقی تین ریاستیں رسمی طور پر یروشلم کی بالادستی کو تسلیم کرتی تھیں۔

صلیبی جنگوں کے دو بڑے گروہ تھے۔ ایک گروہ ہیکلی کہلاتا تھا۔ اس لیے کہ انہوں نے یروشلم میں ہیکل سلیمانی کے قریب رہنا شروع کر دیا تھا۔ دوسرا ہاسپٹیلرز کہلاتا تھا۔ ہاسپیٹل یا ہوسٹل شروع میں مہمان خانہ تھا اور یہ لوگ زائرین کی مہمانداری کرتے تھے۔ پھر انہوں نے جنگی گروہ کی حیثیت اختیار کر لی۔

جب فلسطین پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا تو اسلامی دنیا میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ فلسطین اسلامی دنیا کا دل ہے۔ نقشہ پر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اگرچہ فلسطین ایک چھوٹا سا علاقہ ہے لیکن ایسی جگہ واقع ہے کہ اگر اس پر غیر مسلموں کا قبضہ ہو جائے تو اسلامی دنیا دو حصوں میں بٹ جائے گی۔ مصر اور شمالی افریقہ کے مسلمان پھر خشکی کے راستے عرب، عراق اور ایران وغیرہ کے ملکوں

میں آ جا نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ یروشلم مسلمانوں کے لیے بھی بڑا مقدس مقام ہے اسی لیے مسلمان اس کو قبلۂ اول کہتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ، داؤدؑ، موسیٰؑ اسی خطے میں ہوئے ہیں اور جس طرح عیسائیوں اور یہودیوں کے پیغمبر ہیں اسی طرح مسلمانوں کے پیغمبر بھی ہیں۔ پھر خود اپنے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معراج ہوئی تو وہ مسجد اقصیٰ ہی میں ٹھہرے تھے اور یہاں سے آسمان پر تشریف لے گئے تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ فلسطین پر عیسائیوں کا قبضہ خاموشی کے ساتھ گوارا کر لیتے۔ انہوں نے عیسائیوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ جن لوگوں نے عیسائیوں کے مقابلے میں نام پیدا کیا ان میں پہلا مشہور شخص عماد الدین زنگی (۵۲۱ھ تا ۵۴۱ھ) ہے۔ عماد الدین سلجوقی حکومت کی طرف سے شہر موصل کا حاکم تھا۔ جب سلجوقی حکومت کمزور ہوگئی تو اس نے اپنی سلطنت بہت بڑھا لی اور عیسائیوں کو شکستوں پر شکستیں دے کر ان کی چار ریاستوں میں سے ایک ریاست ختم کر دی جس کا مرکز شہر الرہا تھا۔ جسے آج کل اورفا کہا جاتا ہے اور ایشیائے کوچک میں واقع ہے۔ لیکن بدقسمتی سے عماد الدین کا اس عرصے میں انتقال ہوگیا اور وہ فلسطین تک نہیں پہنچ سکا۔ عماد الدین کی ساری عمر لڑائیوں میں گزری۔ وہ میدان جنگ کا اتنا عادی ہوگیا تھا کہ اکثر کہا کرتا تھا:

''مجھے قالینوں سے زیادہ گھوڑے کی پیٹھ اور نغمہ و ساز سے زیادہ تلواروں کی جھنکار میں مزہ آتا ہے''

عماد الدین کی یہی بہادری تھی جس کی وجہ سے اس نے تن تنہا متحدہ یورپ کا کامیاب مقابلہ کیا۔

نورالدین زنگی (۵۴۱ھ تا ۵۶۹ھ)

عماد الدین کے بعد اس کے لڑکے نورالدین زنگی نے تاریخ میں بڑا نام پیدا کیا۔ اس نے عیسائیوں سے بیت المقدس واپس لینے سے پہلے ایک مضبوط حکومت قائم کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نورالدین نے گردونواح کی چھوٹی چھوٹی مسلمان حکومتوں کو ختم کر کے ان کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ شروع میں نور الدین کا دارالحکومت شہر حلب تھا۔ ۵۴۹ھ میں اس نے دمشق پر قبضہ کر کے اسے دارالحکومت قرار دیا۔ اس زمانے میں مصر میں فاطمی

حکومت قائم تھی۔ لیکن اب وہ بالکل کمزور ہوگئی تھی اور مصر چونکہ فلسطین سے ملا ہوا تھا اس لیے عیسائی اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ دیکھ کر نور الدین نے ایک فوج بھیج کر ۵۶۴ھ میں مصر پر بھی قبضہ کرلیا اور فاطمی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ مصر پر قبضہ کرنے کے بعد نور الدین نے بیت المقدس پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کیں۔ بیت المقدس کی مسجد عمر میں رکھنے کے لیے اس نے اعلیٰ درجہ کا منبر تیار کروایا۔ اس کی خواہش تھی کہ فتح بیت المقدس کے بعد اس منبر کو اپنے ہاتھ سے مسجد میں رکھے گا۔ لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ نور الدین ابھی حملہ کی تیاریاں ہی کر رہا تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا۔

نور الدین کی عمر ۵۸ سال تھی اور اس نے ۲۸ سال حکومت کی۔

نور الدین بہادری میں اپنے باپ کی طرح تھا۔ ایک مرتبہ جنگ میں اسے دشمنوں کی صفوں میں بار بار گھستے دیکھ کر اس کے ایک مصاحب قطب الدین نے کہا:

''اے ہمارے بادشاہ اپنے آپ کو امتحان میں نہ ڈالیے اگر آپ مارے گئے تو دشمن اس ملک کو فتح کرلیں گے اور مسلمانوں کی حالت تباہ ہوجائے گی۔ نور الدین نے یہ بات سنی تو اس پر بہت ناراض ہوا اور کہا: ''قطب الدین زبان کو روکو۔ تم اللہ کے حضور میں گستاخی کر رہے ہو۔ مجھ سے پہلے اس دین اور ملک کا محافظ اللہ کے سوا کون تھا''؟

نور الدین صرف ایک فاتح نہیں تھا بلکہ ایک شفیق حکمران اور علم پرور بادشاہ تھا۔ اس نے سلطنت میں مدرسوں اور ہسپتالوں کا جال بچھا دیا۔ اور اس کے انصاف کے قصے دُور دُور مشہور ہوگئے۔

وہ بڑی سادہ زندگی گزارتا تھا۔ بیت المال کا روپیہ کبھی اپنے ذاتی خرچ میں نہیں لایا۔ مالِ غنیمت سے اس نے چند دکانیں خرید لی تھیں۔ ان کے کرایہ سے وہ اپنا خرچ پورا کرتا تھا۔ اس نے اپنے لیے بڑے بڑے محل تعمیر نہیں کیے بلکہ بیت المال کا روپیہ مدرسوں، شفاخانوں اور مسافر خانوں کے قائم کرنے اور رفاہِ عام کے دوسرے کاموں میں صرف کرتا تھا۔ دمشق میں اس نے ایک شاندار شفاخانہ قائم کیا تھا جس کی دنیا میں مثال نہ تھی۔ اس میں مریضوں کو دوا بھی مفت دی جاتی تھی اور کھانے اور رہنے کا خرچ بھی حکومت کی طرف سے ادا کیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں تاریخوں میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ درج ہے۔

نور الدین کے انتقال کے تقریباً ڈھائی سو سال بعد ایک مصنف دمشق کی سیر کرتا ہوا اس

شفاخانہ میں بھی آیا۔ یہاں مریضوں کے لیے طرح طرح کے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھ کر وہ خود مریض بن گیا اور شفاخانہ میں داخلہ لے لیا۔ شفاخانہ کے افسر الاطبا نے اس کا معائنہ کیا اور لذیذ کھانے گوشت، مرغ، مٹھائیاں اور پھل تجویز کیے۔ لیکن طبیب چونکہ اصل بیماری کو تاڑ چکا تھا اس نے تین دن کے بعد رقعہ لکھ کر بھیجا کہ مہمان تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔

نورالدین کی ان خوبیوں اور کارناموں کی وجہ سے اس زمانہ کے ایک مؤرخ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ:

''میں نے اسلامی عہد کے حکمرانوں سے لے کر اس وقت تک کے تمام بادشاہوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا لیکن خلفائے راشدین اور عمر بن عبدالعزیز کے سوا نورالدین سے زیادہ بہتر فرمانروا میری نظر سے نہیں گزرا۔''

نورالدین نے تمام ناجائز ٹیکس موقوف کر دیئے تھے۔ مظلوموں کی شکایت خود سنتا اور خود اس کی تفتیش کرتا تھا۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے زمین یا جائداد کے بارے میں نورالدین پر دعویٰ دائر کیا۔ عدالت کا چپراسی اس وقت جب کہ وہ چوگان کھیل رہا تھا پہنچا۔ سلطان فوراً اس کے ہمراہ قاضی کی عدالت میں حاضر ہو گیا اور قاضی سے کہا کہ اس وقت مدعا علیہ کی حیثیت سے آیا ہوں اس لیے میرے ساتھ وہی برتاؤ کیجیے جو عام مدعی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ قاضی نے مدعی کے برابر بٹھا کر فریقین کے بیانات اور شہادتیں سنیں۔ جائداد نورالدین کی ثابت ہوئی اور مقدمہ خارج ہو گیا۔

نورالدین کی وفات کے بعد سلطان صلاح الدین کے کسی فوجی نے ایک شخص پر کچھ زیادتی کی۔ مظلوم نے صلاح الدین سے فریاد کی لیکن اس نے کوئی شنوائی نہیں کی۔ وہ مایوس ہو کر روتا پیٹتا نورالدین کے مزار پر پہنچا اور یہ کہتا جاتا تھا کہ نورالدین آج تمہارا عدل و انصاف کہاں ہے۔ جس ظلم کا ہم لوگ شکار ہیں اگر تم دیکھ سکتے تو تم کو ہماری حالت پر رحم آتا۔ صلاح الدین اس وقت دمشق میں موجود تھا اسے خبر ہوئی تو فوراً اس شخص کو بلا کر اس کی شکایت رفع کی اور روپیہ دے کر اس کی دلجوئی کی۔ اس پر وہ اور زیادہ رویا۔ صلاح الدین نے پوچھا اب کیوں روتے ہو۔ اس نے کہا اس بادشاہ کو روتا ہوں جس کی موت کے بعد بھی اس کی عدالت قائم ہے۔

صلاح الدین نے کہا ''سچ کہتے ہو ہم میں جو کچھ بھی عدل و انصاف ہے وہ صرف اس کے

(نورالدین) فیض کا نتیجہ ہے۔"

ایک مرتبہ اس کی بیوی نے کہلا بھیجا کہ سلطان اس کو گھر کے مصارف کے لیے جو رقم دیتا ہے وہ اخراجات کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس میں کچھ اضافہ کیا جائے۔ سلطان نے انکار کر دیا اور کہلوا دیا کہ اس سے زیادہ کہاں سے لا کر دوں۔ اگر وہ سمجھتی ہے کہ میرے پاس جو مال ہے وہ میرا ذاتی ہے تو غلط ہے۔ یہ مسلمانوں کا مال ہے اور ان ہی کے فائدہ کے لیے ہے میں صرف اس کا خزانچی اور امین ہوں۔

نورالدین نے شراب نوشی اور شراب کی تجارت روک دی تھی۔ اس نے شریعت کی خود پابندی کی اور اپنے ساتھیوں کو بھی پابند بنایا۔ انہیں دیکھ کر دوسروں نے تقلید کی جس کی وجہ سے اسلام پر عمل کرنے کا لوگوں میں ایسا جذبہ پیدا ہو گیا کہ لوگ خلافِ شرع کاموں کے ذکر سے بھی شرمانے لگے۔

صلاح الدین (۵۶۹ھ تا ۵۸۹ھ)

صلیبی جنگوں میں سب سے زیادہ شہرت جس شخص کو حاصل ہوئی وہ سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس ہے۔ سلطان صلاح الدین نسلاً کرد تھا اور کردستان کے اس حصہ میں پیدا ہوا تھا جو عراق میں شامل ہے۔ شروع میں وہ سلطان نورالدین کے یہاں ایک فوجی افسر تھا۔ مصر کو جس فوج نے فتح کیا تھا اس میں صلاح الدین موجود تھا اور اس کا سپہ سالار شیرکوہ صلاح الدین کا چچا تھا۔ مصر فتح ہو جانے کے بعد صلاح الدین ۵۶۴ھ میں مصر کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔ اسی زمانہ میں ۵۶۹ھ میں اس نے یمن بھی فتح کر لیا۔ نورالدین کے انتقال کے بعد چونکہ اس کی کوئی لائق اولاد نہیں تھی اس لیے صلاح الدین پوری سلطنت پر قابض ہو گیا۔

صلاح الدین اپنے کارناموں میں نورالدین سے بھی بازی لے گیا۔ اس میں جہاد کا جوش کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھا اور بیت المقدس کی فتح اس کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ فلسطین اب ہر طرف سے گھر گیا تھا اس لیے اب اس نے بیت المقدس کا رُخ کیا۔ حطین کے میدان جنگ میں عیسائیوں سے بڑا سخت معرکہ ہوا۔ عیسائیوں کو شکست ہوئی۔ ان کے کئی ہزار آدمی مارے گئے اور کئی ہزار گرفتار ہوئے۔ صلاح الدین نے آگے بڑھ کر آسانی سے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا اور

تمام فلسطین سے مسیحی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ مسجد اقصیٰ میں داخل ہو کر صلاح الدین نے وہ منبر جسے نور الدین نے بنوایا تھا اپنے ہاتھ سے مسجد میں رکھا۔ اس طرح نور الدین کی خواہش اس کے ہاتھوں پوری ہوئی۔

صلاح الدین نے بیت المقدس میں داخل ہو کر وہ مظالم نہیں کیے جو اس شہر پر قبضے کے وقت یورپ کی مسیحی فوجوں نے مسلمانوں پر کیے تھے۔ صلاح الدین ایک مثالی فاتح کی حیثیت سے بیت المقدس میں داخل ہوا۔ اس نے زرفدیہ لے کر ہر عیسائی کو امان دے دی اور جو غریب فدیہ نہیں ادا کر سکے ان کے فدیہ کی رقم صلاح الدین اور اس کے بھائی ملک عادل نے خود ادا کی۔

بیت المقدس پر قبضہ کے ساتھ یروشلم کی وہ مسیحی حکومت بھی ختم ہو گئی جو فلسطین میں ۱۰۹۹ء سے قائم تھی۔ اس کے بعد جلد ہی سارا فلسطین مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔

جب بیت المقدس پر قبضہ کی خبر یورپ پہنچی تو سارے یورپ میں کہرام مچ گیا۔ ہر طرف لڑائی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جرمنی، اٹلی، فرانس اور انگلستان سے فوجوں پر فوجیں فلسطین روانہ ہونے لگیں۔ انگلستان کا بادشاہ رچرڈ جو اپنی بہادری کی وجہ سے شیر دل مشہور تھا اور فرانس کا بادشاہ فلپ اپنی اپنی فوجیں لے کر فلسطین پہنچے۔ یورپ کی اس متحدہ فوج کا جس کی تعداد چھ لاکھ تھی صلاح الدین نے تین سال تک تنہا مقابلہ کیا لیکن عیسائی بیت المقدس لینے میں کامیاب نہ ہوئے اور سلطان سے صلح کر کے ناکام و نامراد واپس چلے گئے۔ یہ لڑائی تیسری صلیبی جنگ کہلاتی ہے۔ اس میں صلاح الدین نے ثابت کر دیا کہ وہ دنیا میں سب سے طاقتور حکمران ہے۔

صلاح الدین کی سیرت

صلاح الدین بڑا بہادر اور فیاض تھا۔ لڑائیوں میں اس نے عیسائیوں کے ساتھ اتنے اچھے سلوک کیے کہ عیسائی آج بھی اس کی عزت کرتے ہیں۔

اس کو جہاد کا اتنا شوق تھا کہ ایک مرتبہ اس کے نچلے آدھے دھڑ میں پھوڑے ہو گئے تھے ان کی وجہ سے وہ بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ لیکن اس حالت میں بھی جہاد کی سرگرمی میں فرق نہ آیا۔ صبح سے ظہر تک اور عصر سے مغرب تک برابر گھوڑے کی پیٹھ پر رہتا تھا۔ اس کو خود تعجب ہوتا تھا

اور کہا کرتا تھا کہ جب تک گھوڑے کی پیٹھ پر رہتا ہوں ساری تکلیف جاتی رہتی ہے اور اس سے اترنے پر پھر تکلیف شروع ہو جاتی ہے۔

مسیحیوں سے صلح ہو جانے کے بعد صلاح الدین نے عیسائیوں کو بیت المقدس کی زیارت کی اجازت دے دی۔ اجازت پر یورپ کے یہ زائرین جو برسوں سے انتظار کر رہے تھے اس کثرت سے ٹوٹ پڑے کہ شاہ رچرڈ کے لیے انتظام قائم رکھنا مشکل ہو گیا اور اس نے سلطان سے کہا کہ وہ اس کی تحریر اور اجازت نامے کے بغیر کسی کو بیت المقدس میں داخل نہ ہونے دے۔ سلطان نے جواب دیا:

''زائرین بڑی بڑی مسافتیں طے کر کے زیارت کے شوق میں آتے ہیں ان کو روکنا مناسب نہیں۔''

سلطان نے نہ صرف یہ کہ ان زائرین کو ہر قسم کی آزادی دی بلکہ اپنی جانب سے لاکھوں زائرین کی مدارات، راحت اور آسائش اور دعوت کا انتظام کیا۔ وہ ان سے مل کر باتیں اور دلجوئی کرتا تھا۔

ایک مرتبہ اس کے کچھ سپاہی ایک عیسائی عورت کے بچہ کو اٹھا لائے۔ عورت بڑی پریشان ہوئی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ تم صلاح الدین کے پاس چلی جاؤ وہ بڑا اچھا بادشاہ ہے وہ تمہارے ساتھ انصاف کرے گا۔ عورت روتی ہوئی بادشاہ کے پاس پہنچی اور سارا قصہ سنایا۔ اس عورت کو روتے دیکھ کر وہ بھی رو دیا اور فوج میں بچے کو تلاش کرا کے اس کے سپرد کر دیا۔ صلاح الدین نے غیر مسلموں سے جو سلوک کیا وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق تھا اور وہ اس کا ثبوت ہے کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق بھی اسی طرح محفوظ ہوتے ہیں جس طرح مسلمانوں کے۔

نور الدین کی طرح صلاح الدین کی زندگی بھی بڑی سادہ تھی۔ ریشمی کپڑے کبھی استعمال نہیں کیے اور رہنے کے لیے محل کی جگہ معمولی سا مکان ہوتا تھا۔

رفاہ عام کے کام

قاہرہ پر قبضہ کرنے کے بعد جب اس نے فاطمی حکمرانوں کے محلوں کا جائزہ لیا تو وہاں بیشمار جواہرات اور سونے چاندی کے برتن جمع تھے۔ صلاح الدین نے یہ ساری چیزیں اپنے قبضہ میں

لانے کے بجائے بیت المال میں داخل کردیں۔ لونڈیوں کو یا تو آزاد کر دیا یا امراء میں تقسیم کر دیا۔ اسی طرح وہ محلوں کو عام استعمال میں لایا۔ اور ایک محل میں ایک عظیم الشان خانقاہ قائم کر دی۔

فاطمیوں کے زمانہ میں مدرسے قائم نہیں کیے گئے۔ شام میں تو نور الدین کے زمانہ میں خوب مدرسے اور شفاخانے قائم ہوئے لیکن مصر اب تک محروم تھا۔ صلاح الدین نے یہاں کثرت سے مدرسے اور شفاخانے قائم کیے۔ ان مدرسوں میں طلباء کے رہنے اور کھانے کا انتظام بھی سرکار کی طرف سے ہوتا تھا۔

قاہرہ میں اس نے جو شفاخانہ تعمیر کرایا تھا وہ سب سے شاندار تھا۔ اس کے متعلق اس زمانہ کا ایک سیاح ابن جبیر لکھتا ہے۔

''یہ نہایت خوبصورت اور شاندار محل معلوم ہوتا ہے۔ اس میں دواؤں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ مریضوں کے لیے بہت سے کمرے ہیں۔ پلنگ اور بستروں کا پورا انتظام ہے۔ ملازم دونوں وقت صبح و شام مریضوں کو دیکھتے ہیں اور ان کی دوا اور غذا وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں۔ اس سے متصل عورتوں کے لیے زنانہ شفاخانہ ہے۔ اور ان کے علاج کے لیے عورتیں مقرر ہیں۔ شفاخانہ سے متصل ایک پاگل خانہ ہے۔ اس کے دریچوں میں جالیاں لگی ہیں۔ ان پاگلوں کا علاج اور دیکھ بھال مریضوں کی طرح ہوتی ہے۔ سلطان برابر حالات کی تحقیقات اور مریضوں کے علاج اور نگرانی کی تاکید کرتا رہتا ہے۔''

صلاح الدین کے زمانہ میں جس کثرت سے مدرسے، شفاخانے اور مسافر خانے بنائے گئے ان کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کے زمانے میں حکومت کی ساری آمدنی رفاہِ عام کے کاموں پر خرچ ہوتی تھی۔ اس معاملہ میں اس کا عہد نظام الملک طوسی اور نور الدین زنگی سے بھی آگے بڑھ گیا۔

سلطان کی مثال کو دیکھ کر اس زمانہ کے امراء اور عورتوں تک نے مدرسے قائم کرنا شروع کر دیئے۔

صلاح الدین غوری حکمران شہاب الدین اور مراکشی حکمران یعقوب المنصور کا ہمعصر تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ تینوں حکمران اپنے وقت میں دنیا کے عظیم ترین حکمرانوں میں سے تھے۔

صلاح الدین کا ۵۸۹ھ میں انتقال ہوا۔ اس نے کُل بیس سال حکومت کی۔ مؤرخ ابن خلکان نے جو تھوڑے عرصہ بعد ہوا ہے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

''اس کی موت کا دن اتنا تکلیف دہ تھا کہ ایسا تکلیف دہ دن اسلام اور مسلمانوں پر خلفائے راشدین کی موت کے بعد کبھی نہیں آیا۔''

موجودہ دَور کے ایک انگریز مورخ لین پول نے بھی سلطان کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''اس کے ہمعصر بادشاہوں اور اس میں ایک عجیب فرق تھا۔ بادشاہوں نے اپنے جاہ و جلال کے سبب عزت پائی اور اس نے عوام سے محبت اور ان کے معاملات میں دلچسپی لے کر ہر دلعزیزی کی دولت کمائی۔''

صلاح الدین نے جو حکومت قائم کی تھی وہ اس کے باپ نجم الدین ایوب کے نام پر ''ایوبی'' کہلاتی ہے۔

صلاح الدین اگرچہ ایک دانشمند اور قابل حکمران تھا لیکن وہ خود کو رواجی تصور سے آزاد نہ کر سکا۔ خلافت کے حقیقی تصور کو اب مسلمان معاشرہ اس حد تک بھلا چکا تھا کہ نور الدین اور صلاح الدین جیسے حکمران بھی ملوکیت کے انداز میں سوچتے تھے۔ جانشینی کے معاملہ میں صلاح الدین نے بھی وہی غلطی کی جو سب سے پہلے ہارون الرشید نے کی تھی اور سلجوقیوں کے بعد سے تمام حکمران کرتے چلے آ رہے تھے۔ اس نے زمانے کے غلط رواج کے تحت اپنی سلطنت اپنے تین لڑکوں میں تقسیم کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ طاقتور سلطنت تقسیم ہو کر کمزور پڑ گئی۔ پھر بھی ایوبی خاندان کے چند نالائق حکمرانوں نے جن میں صلاح الدین کا بھائی ملک عادل اور اس کا لڑکا ملک کامل قابل ذکر ہیں۔ مصر، شام، حجاز اور یمن کو تقریباً ساٹھ سال تک بڑی حد تک متحد رکھا۔ ۶۴۸ھ میں ایوبی خاندان کی حکومت ختم ہوگئی۔ اور اس کی جگہ ترک غلاموں کی حکومت قائم ہوئی جو مملوک حکومت کہلاتی ہے۔

اس عہد کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ملک کامل نے ۱۲۲۹ء میں بیت المقدس بغیر کسی لڑائی کے ایک دوستانہ معاہدے کے ذریعہ عیسائیوں کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ ایک بڑا افسوس ناک معاہدہ تھا۔ ملک کامل نے صقلیہ کے حکمران فریڈرک سے یہ معاہدہ محض اس لیے کیا تھا کہ وہ ایوبی خاندان کے دوسرے شہزادوں کے مقابلہ میں جو ملک کامل سے برسرِ پیکار تھے اس کی مدد کرے۔ اس مدد کے جواب میں ملک کامل نے بیت المقدس اور ساحل کا کچھ علاقہ فریڈرک کے سپرد کر دیا۔

عام مسلمان اس شرمناک معاہدے پر تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ انہوں نے بیت المقدس کی بازیابی کی تحریک شروع کی اور ۱۲۴۴ء میں یعنی پندرہ سال بعد مسلمان رضاکاروں نے شہر عیسائیوں سے پھر چھین لیا۔

ایوبی سلاطین علم وادب کے بھی بڑے سرپرست تھے اور ان کی اس سرپرستی کی وجہ سے اندلس سے کئی اہل علم مصر اور شام آ گئے۔ ان میں ایک مشہور عالم اور صوفی ابن عربی (۱۱۶۵ء/ ۵۶۰ھ تا ۱۲۴۰ء/۶۳۸ھ) ہیں۔ دوسرے ابن بیطار (متوفی ۱۲۴۸ء/۶۴۶ھ) ہیں جو اپنے زمانے کے سب سے بڑے ماہر نباتات تھے۔ انہوں نے کئی سو ایسی نئی جڑی بوٹیاں دریافت کیں جو علاج میں کام آ سکتی ہیں۔ یہ لوگ اندلس اور شمالی افریقہ میں موحدین کی حکومت کے زوال کے بعد مصر اور شام آ گئے تھے۔

ابن جُبیر (۱۱۴۵ء/۵۴۰ھ تا ۱۲۱۷ء/۶۱۴ھ)

ناصر خسرو نے فاطمی حکومت کے زمانہ میں مصر و شام کا جو حال لکھا تھا وہ ہم پڑھ چکے ہیں۔ ناصر خسرو کے سو سال بعد ایک اور مشہور سیاح ابن جُبیر نے مصر و شام اور عراق کی سیر کی۔ ناصر خسرو اسلامی دنیا کے مشرقی حصہ یعنی خراسان سے آیا تھا لیکن ابن جُبیر اس کے برخلاف اسلامی دنیا کے مغربی حصہ یعنی اندلس سے آیا تھا۔ یہ زمانہ سلطان صلاح الدین کا تھا اور مصر و شام نے نور الدین اور صلاح الدین کے زریں دَور میں بہت ترقی کر لی تھی۔ یہ ترقی خاص طور پر مدرسوں اور شفاخانوں کے سلسلہ میں ہوئی۔ چھٹی صدی کا یہ زمانہ جس میں ابن جُبیر نے اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصہ کی سیر کی چونکہ عربوں کے تمدنی عروج کا آخری زمانہ ہے اس لیے ہم یہاں ابن جُبیر کے سفر نامہ سے مصر و شام کا مختصر سا حال لکھتے ہیں۔ اس کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ فاطمیوں کے بعد مصر و شام کی زندگی میں بڑا فرق آ گیا تھا اور مسلمان اپنے تمدنی عروج کی انتہا پر پہنچ گئے تھے۔

ابن جُبیر اندلس سے چلنے کے بعد سب سے پہلے اسکندریہ آیا جو موجودہ زمانہ کی طرح اس وقت بھی مصر کی سب سے بڑی بندرگاہ تھا۔ اس کے متعلق وہ لکھتا ہے:

''ہم نے اب تک کوئی ایسا شہر نہیں دیکھا جس کی سڑکیں اسکندریہ سے زیادہ چوڑی ہوں اور جس کی عمارتیں اسکندریہ کی عمارتوں سے زیادہ بلند ہوں یا جو اس کی طرح قدیم اور

خوبصورت ہوں۔ یہاں کے بازار شاندار ہیں اور شہر کی عظمتوں میں سے ایک وہاں کے مدرسے اور شفاخانے ہیں۔"

"اسکندریہ میں طلبہ کے قیام اور ان کے حسبِ خواہش تعلیم حاصل کرنے کا پورا انتظام ہے۔ طلبہ کو ان کی دوسری ضروریات کے لیے وظیفے بھی دیئے جاتے ہیں۔ سلطان نے دُور دراز سے آنے والے مسافروں کے نہانے اور صفائی کے لیے حماموں تک کا انتظام کیا ہے اور ان کے علاج کے لیے شفاخانہ قائم کیا ہے اور ان کو دیکھنے کے لیے طبیب مقرر کیے ہیں۔"

"شہر کے باشندوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کے لوگ دن کے علاوہ رات کو بھی کام کرتے ہیں۔ اور شہروں کے مقابلے میں یہاں مسجدوں کی تعداد زیادہ ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں ان کی تعداد بارہ ہزار تک ہے۔ سلطان کی طرف سے ہر امام کو وظیفہ ملتا ہے۔"

اسکندریہ کے بعد ابن جُبیر قاہرہ پہنچا جو دمشق کے بعد صلاح الدین کا دوسرا دارالحکومت تھا۔ یہاں ابنِ جُبیر قاہرہ کے بڑے شفاخانے سے جسے حال ہی میں تعمیر کیا گیا تھا بڑا متاثر ہوا اور وہ لکھتا ہے:

"قاہرہ کا بیمارستان (شفاخانہ) قابل ذکر ہے۔ یہ اپنی وسعت اور خوبصورتی میں محل کی طرح ہے۔ اس کے کمروں میں بیماروں کے لیے بستر بچھے رہتے ہیں۔ ملازمین صبح وشام ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور ان کو خوراک اور دوا لا کر دیتے ہیں۔ اس کے بالمقابل ایک عورتوں کا شفاخانہ ہے۔ وہاں بھی ایسا ہی انتظام ہے۔ ان دونوں شفاخانوں سے ملا ہوا ایک تیسرا شفاخانہ ہے۔ جو پاگلوں کے لیے مخصوص ہے۔ اس کے کمروں کی کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں لگیں ہوئی ہیں۔ فسطاط میں بھی اس نمونے کا ایک شفاخانہ ہے۔"

"قاہرہ میں کوئی مسجد، مقبرہ یا مدرسہ ایسا نہیں ہے جو سلطان کی فیاضی سے محروم ہو۔ یہاں سلطان نے ایک مدرسہ تعمیر کرایا ہے جہاں صرف یتیم اور غریب بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔"

"سلطان کا ایک بڑا کارنامہ ان چنگیوں کو منسوخ کرنا ہے جو فاطمیوں کے زمانے میں حاجیوں پر لگائی گئی تھیں۔ سلطان نے حاجیوں کے لیے خوراک اور زادِ راہ کا انتظام بھی کر دیا ہے۔

............سلطان کا انصاف ایسا ہے اور سڑکوں کو اس نے ایسا محفوظ کر دیا ہے کہ لوگ رات کو بھی بلا خوف اپنے کام انجام دے سکتے ہیں۔"

مصر سے ابن جُبیر حج کرنے کے لیے مدینہ منورہ ہوتا ہوا مکہ معظّمہ گیا پھر وہاں سے بغداد آیا اور عراق کے شہروں کی سیر کرتا ہوا شام آیا۔ بغداد اور عراق کے دوسرے شہروں کا اس نے جو حال لکھا ہے وہ ہم دوسرے کسی باب میں لکھیں گے۔ یہ اب چونکہ ایوبی دَور کے متعلق ہے اس لیے یہاں ہم صرف شام کے شہروں کا مختصر ذکر کریں گے۔

حلب کی ابن جُبیر نے بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"شہر بے انتہا خوبصورت ہے۔ بڑے بڑے بازار ہیں جو ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ جامع مسجد انتہائی خوبصورت ہے۔ مسجد کے مغرب میں ایک مدرسہ ہے جو خوبصورتی اور کاریگری میں مسجد ہی کی طرح ہے۔ اس مدرسے کے علاوہ شہر میں چار پانچ دوسرے مدرسے بھی ہیں۔ شہر میں ایک شفا خانہ بھی ہے .... حلب شان و شوکت میں ایسا ہے کہ دارالخلافہ بنائے جانے کے قابل ہے۔ یہ دنیا کے ان شہروں میں ہے جو اپنی مثال آپ ہیں اور جس کی تعریف کے لیے وقت چاہیے۔"

دارالحکومت دمشق کے متعلق لکھتا ہے:

"شہر کے مضافات وسیع ہیں لیکن خود شہر بہت بڑا نہیں۔ سڑکیں تنگ اور تاریک ہیں۔ گھر مٹی اور سرکنڈے کے ہیں اور تین تین منزل کے ہیں۔ دمشق دنیا کا سب سے گنجان آباد شہر ہے اور اس کی آبادی تین شہروں کے برابر ہے۔ دمشق کا حسن بیرونی حصوں میں ہے اندرونی شہر میں نہیں۔"

"شہر میں بیس مدرسے اور دو شفا خانے ہیں۔ ایک پرانا اور ایک نیا .... ان شفا خانوں میں پاگلوں کا بھی انتظام ہے۔ یہ شفا خانے اور مدرسے اسلامی دنیا کے لیے قابل فخر ہیں۔ یہاں ایک خوبصورت ترین مدرسہ نور الدین کا ہے۔ اس میں اس کا مزار ہے۔ یہ ایک شاندار محل ہے اس میں پانی ایک مسقّف نہر سے آتا ہے۔ پہلے فوارہ چلتا ہے اور پھر پانی ایک بڑے حوض میں جو عمارت کے بیچ میں ہے گر جاتا ہے۔ نظروں کے لیے یہ منظر بڑا دلکش ہے۔"

''اس شہر میں مسافروں کے لیے بے شمار سہولتیں ہیں۔ خصوصاً ان کے لیے جو قرآن حفظ کریں یا علم حاصل کریں۔ مشرق کے یہ تمام شہر اسی قسم کے ہیں لیکن یہ شہر زیادہ آباد اور دولت مند ہے۔ مغرب کا ہر نوجوان جو خوشحالی کا خواہشمند ہے اگر وہ حصول علم کے لیے اپنا وطن چھوڑ کر اس سرزمین میں آ جائے تو اسے طرح طرح کی امداد ملے گی .... سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ وہ روزگار سے بے فکر ہو جائے گا۔''

''دمشق میں سلطان کا قلعہ اور شہر کے باہر گھوڑ دوڑ[1] کے دو میدان ہیں۔ یہ بڑ خوش منظر مقامات ہیں۔ سلطان ہر شام کو یہاں آتا ہے، تیر اندازی کی مشق کرتا ہے گھوڑے دوڑاتا ہے اور چوگان (پولو) کھیلتا ہے۔''

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ فلش کے پاخانے اور غسل خانے یورپ کی ایجاد ہیں۔ لیکن ابنِ جُبیر کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ دمشق میں ایسے پاخانے اور غسل خانے عام تھے۔ وہ لکھتا ہے:

''دمشق اور اس کے مضافات میں ایک سو حمام اور چالیس طہارت خانے ہیں۔ ان سب میں پانی بہتا رہتا ہے۔''

عکہ اور صور کے متعلق جن پر اس زمانہ میں یورپ والوں کا قبضہ تھا وہ لکھتا ہے کہ:

''عکہ اور صور کے گرد باغات نہیں ہیں۔ عکہ گندہ ہے اور صور مقابلتاً صاف ہے۔''

ڈیڑھ سو سال پہلے جب ناصر خسرو یہاں آیا تھا اس وقت یہ دونوں شہر مسلمانوں کے قبضہ میں تھے اور اپنی صفائی اور خوبصورتی میں مشہور تھے، لیکن یورپ والوں کے قبضہ کے بعد ان شہروں میں گندگی پھیل گئی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان اپنے عہد عروج میں علم اور صفائی کے علمبردار تھے اور یورپ والے جہالت اور گندگی میں گھرے ہوئے تھے۔

---

(1) اسلامی تاریخ میں گھوڑ دوڑ کا رواج خلفائے راشدین کے زمانہ ہی سے ہو گیا تھا۔ لیکن یہ گھوڑ دوڑ آج کل کی گھوڑ دوڑ سے جسے ریس کہا جاتا ہے مختلف ہوتی تھی۔ آج کل گھوڑے جوا کھیلنے کے لیے دوڑائے جاتے ہیں لیکن اسلام میں جوا کھیلنا چونکہ حرام ہے اس لیے مسلمان اپنے عہد عروج میں صرف مقابلے اور کھیل کود اور تفریح کی غرض سے گھوڑے دوڑاتے تھے، جوا کھیلنے کے لیے شرط نہیں لگاتے تھے۔

ایوبی سلاطین

(۱۱۷۴ء/۵۶۹ھ تا ۱۲۵۰ء/۶۴۸ھ)

۱۔صلاح الدین	۱۱۷۴ء/۵۶۹ھ تا ۱۱۹۳ء/۵۸۹ھ
۲۔ملک العزیز	۱۱۹۳ء/۵۸۹ھ تا ۱۱۹۸ء/۵۹۵ھ
۳۔ملک العادل	۱۱۹۸ء/۵۹۵ھ تا ۱۲۱۸ء/۶۱۵ھ
۴۔ملک الکامل	۱۲۱۸ء/۶۱۵ھ تا ۱۲۳۸ء/۶۳۵ھ
۵۔ملک العادل دوم	۱۲۳۸ء/۶۳۵ھ تا ۱۲۴۰ء/۶۳۷ھ
۶۔ملک الصالح	۱۲۴۰ء/۶۳۷ھ تا ۱۲۴۹ء/۶۴۷ھ
۷۔توران شاہ	۱۲۴۹ء/۶۴۷ھ تا ۱۲۵۰ء/۶۴۸ھ
حطین کی جنگ اور بیت المقدس کی فتح	۱۱۸۷ء/۵۸۳ھ
تیسری صلیبی جنگ	۱۱۸۹ء/۵۸۵ھ تا ۱۱۹۲ء/۵۸۸ھ

مزید مطالعہ کے لیے کتابیں

۱۔ تاریخ اسلام حصہ سوم از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

۲۔ تاریخ اسلام حصہ چہارم از شاہ معین الدین احمد ندوی۔

۳۔ تاریخ دعوت وعزیمت حصہ اول از سید ابوالحسن علی ندوی۔ اس کتاب میں نورالدین زنگی، صلاح الدین ایوبی اور ابن جوزی سے متعلق قیمتی معلومات ہیں۔

۴۔ صلاح الدین سے متعلق لین پول کی کتاب جس کا اردو میں ترجمہ ہوگیا ہے مطالعہ کی جاسکتی ہے۔ نورالدین زنگی سے متعلق تاریخ ابن خلدون کے مترجم احمد حسن الٰہ آبادی نے ایک اچھی کتاب لکھی تھی لیکن اب وہ نایاب ہے۔
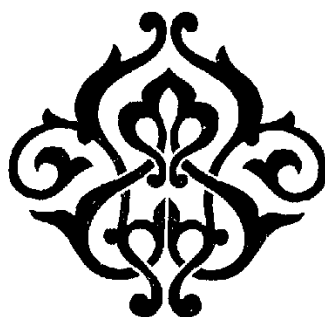
باب ۱۸

عروس البلاد قرطبہ

پچھلے صفحوں میں جن حکومتوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے وہ سب وہ حکومتیں تھیں جو خلافتِ عباسیہ کے زوال کے بعد ان علاقوں میں قائم ہوئیں جو پہلے عباسی خلافت کی حدود میں شامل تھے۔ اب تک اندلس کی اسلامی حکومت کا حال بیان نہیں کیا گیا۔ کیونکہ یہ ملک عباسیوں کے قبضہ میں کبھی نہیں آیا اور ان کی خلافت کے قائم ہونے کے بعد یہاں بنی اُمیہ کے خاندان کے ایک شخص عبدالرحمان نے اپنی آزاد حکومت قائم کر لی تھی۔

عبدالرحمان الداخل (۱۳۸ھ تا ۱۷۱ھ)

عبدالرحمان بنی امیہ کے مشہور خلیفہ ہشام کا پوتا تھا۔ اس نے کس طرح اپنی جان بچائی۔ کیسے شام سے اندلس پہنچا اور کئی سال تک کیسی کیسی مصیبتیں جھیلیں اس کے واقعات بڑے دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ ان واقعات کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اگر آدمی کسی کام کا پختہ ارادہ کر لے اور ہر قسم کی مصیبتوں کا ہمت سے مقابلہ کرے تو وہ دنیا میں بڑے سے بڑا کام بھی کر سکتا ہے۔

بنی عباس کا جب اموی دارالخلافہ دمشق پر قبضہ ہو گیا تو انہوں نے بنی امیہ کے شاہی خاندان کے لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ عبدالرحمن کی عمر اس وقت انیس سال کی تھی۔ وہ دریائے فرات کے کنارے ایک گاؤں میں جو گھنے جنگلوں کے اندر تھا اپنے گھر والوں کے ساتھ چھپ گیا۔ لیکن عباسی لشکر کے سوار یہاں بھی پہنچ گئے۔ عبدالرحمان نے اپنی بہن اور ایک بچہ کو اپنے غلام بدر کے سپرد کیا اور خود مکان کے پچھلے دروازے سے نکل گیا۔ اس کا تیرہ سالہ بھائی بھی اس کے ساتھ تھا۔ سواروں نے ان کو دیکھ لیا تو یہ دونوں دریائے فرات کے کنارے لگے ہوئے گھنے درختوں میں گھس گئے۔ آگے آگے دونوں بھائی بھاگتے جا رہے تھے اور پیچھے دشمن کے سواران کا پیچھا کر رہے تھے۔ اب یہ دونوں دریا کے کنارے پرانی قبروں کے اندر گھس گئے۔ سوار جب یہاں پہنچے تو دونوں نکل بھاگے اور دریا میں کود پڑے۔ سواروں نے ان سے آواز دے کر کہا:

''لوٹ آؤ۔ جان کی امان ہے۔''

لیکن دونوں بھائی برابر تیرتے گئے۔ جب بیچ دریا میں پہنچے تو عبدالرحمان کا چھوٹا بھائی تھک گیا۔ عبدالرحمان نے اس کا دل بڑھایا اور اپنی طرف بُلاتا رہا۔ مگر وہ دشمن کی باتوں میں آ گیا اور آہستہ آہستہ تیر کر لوٹ گیا۔ سواروں نے پکڑتے ہی قتل کر دیا۔

عبدالرحمن یہاں سے فلسطین اور مصر ہوتا ہوا افریقہ پہنچا۔ افریقہ میں وہ تقریباً پانچ چھ سال رہا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ چُھپتا پھرا۔ اس عرصہ میں اندلس میں اس کے حامی پیدا ہو گئے اور عبدالرحمن ان کی مدد سے سمندر پار کر کے اندلس پہنچ گیا۔ اور اس ملک میں ایک آزاد حکومت کی بنیاد ڈال دی جو ڈھائی سو سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہی۔ اندلس میں حکومت قائم ہو جانے کے بعد عبدالرحمن نے اپنے بچہ کو بھی اپنے پاس بُلوا لیا۔ اس نے اپنی بہن کو بھی بلوایا لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اب وہ شام میں آرام سے ہے اس لیے سفر کے خطرہ میں پڑنا مناسب نہیں سمجھتی۔ عبدالرحمن کی یہ بہن اپنے بھائی کو شام کے میوے اندلس بھیجا کرتی تھی۔ ان میووں میں ایک خاص قسم کا انار تھا جو اندلس میں نہیں ہوتا تھا۔ عبدالرحمن نے اندلس میں اس انار کی اور شام کے دوسرے پھلوں کی کاشت شروع کرائی جس کی وجہ سے یہ پھل اندلس کی سرزمین پر بھی ہونے لگے۔ عبدالرحمن نے قرطبہ کو دارالحکومت بنایا اور وہاں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی جو جامع قرطبہ کے نام سے مشہور ہے۔

عبدالرحمن چونکہ باہر سے آ کر اُندلس میں داخل ہوا تھا اس لیے تاریخ میں اس کو عبدالرحمن الداخل بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے تقریباً ۳۳ سال حکومت کی۔

عبدالرحمن کے عہد کا ایک اہم واقعہ شارلمین کے حملے کی پسپائی ہے۔ بنی اُمیہ کے حالات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ مسلمان عبدالرحمن الغافقی کی قیادت میں فرانس میں ٹورس کے مقام تک پہنچ گئے تھے لیکن اس کے بعد وہ آگے نہیں بڑھ سکے۔ اور جنوب مغربی فرانس کے علاوہ سارا ملک مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس کے بعد ایک عیسائی حکمران شارلمین نے جرمنی، فرانس اور وسطی یورپ کے بڑے حصہ پر قبضہ کر کے ایک طاقتور حکومت قائم کر لی۔ اب شارلمین نے یہ کوشش کی کہ اندلس سے بھی مسلمانوں کو نکال دے۔ چنانچہ ۷۷۸ء/۱۶۱ھ میں یعنی عبدالرحمن اول کے عہد میں اس نے ایک زبردست فوج سے اندلس پر حملہ کیا اور سرقطہ کے شہر تک گھس آیا۔

لیکن مسلمانوں نے یہاں شارلیمین کو شکست فاش دی اس کے بڑے بڑے فوجی سردار مارے گئے اور اسے اندلس چھوڑ کر پسپا ہونا پڑا۔ اس طرح جنوب مغربی فرانس پر پھر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

ہشام اول (۱۷۱ھ تا ۱۸۰ھ)

عبدالرحمن الداخل کے بعد اس کا بیٹا ہشام (۱۷۱ھ تا ۱۸۰ھ) تخت پر بیٹھا۔ ہشام نے آٹھ سال حکومت کی لیکن ان آٹھ سالوں میں جیسا امن وانصاف اندلس کو نصیب ہوا ویسا اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ ہشام بڑا انصاف پسند حکمران تھا اور وہ اپنے طور طریقوں میں عمر بن عبدالعزیز سے ملتا جلتا تھا۔ وہ صوبہ داروں اور حاکموں پر کڑی نگرانی رکھتا تھا کہ وہ کسی پر زیادتی نہ کرسکیں اور اگر کسی کی شکایت پہنچتی تو اس کو عہدے سے ہٹا دیتا۔ اس نے غیر شرعی ٹیکس ختم کر دیئے اور زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے اور اس کی تقسیم کا انتظام کیا۔

ہشام نے جامع قرطبہ جس کی تعمیر عبدالرحمن کے زمانے میں شروع ہوئی تھی مکمل کرائی۔ اس کے علاوہ دریائے کبیر پر جو قرطبہ سے بہتا تھا ایک پختہ پُل نئے سرے سے تعمیر کرایا۔ جب یہ پُل مکمل ہو گیا تو ہشام کو معلوم ہوا کہ اہل قرطبہ کا خیال ہے کہ اس نے اس پُل کو اپنے سیر وشکار کی آمد ورفت کے لیے بنوایا ہے تو اس نے اس پُل پر سے نہ گزرنے کا عہد کیا اور اس کے بعد تمام عمر اس پُل پر سے نہیں گزرا۔

ہشام راتوں کو روپوں کی تھیلیاں لے کر نکل جاتا اور بوڑھی اور پردہ نشین عورتوں میں تقسیم کرتا یا مسجدوں میں جا کر لوگوں میں تقسیم کرتا۔ وہ مریضوں کی عیادت کرتا اور جنازوں میں شرکت کرتا۔ اپنی ان خوبیوں کی وجہ سے وہ لوگوں میں بہت ہر دلعزیز تھا۔

ایک مرتبہ وہ ایک عہدے دار کے جنازے میں شرکت کے بعد واپس آ رہا تھا۔ قبرستان کے قریب ایک گھر سے ایک کُتا نکلا اور اس پر حملہ کر کے اس کی صدری پھاڑ دی۔ ہشام نے شہر کے حاکم کو حکم دیا کہ وہ اس کُتے کے مالک پر جرمانہ کرے کہ اس نے ایسی جگہ کُتا کیوں پال رکھا ہے کہ جہاں اس سے لوگوں کو تکلیف پہنچے۔ لیکن بعد میں ہشام نے کُتے کے مالک کا جرمانہ یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ مجھے اپنے کپڑے کے پھٹنے کا جتنا افسوس ہوا ہے اس سے زیادہ اس کُتے کے مالک کو اس کا افسوس ہے کہ اس کے کُتے نے اس کے بادشاہ پر حملہ کیا۔

ہشام کا جانشین حکم (۱۸۰ھ تا ۲۰۶ھ) اپنے باپ کی طرح قابل حکمران ثابت نہ ہو سکا۔ اس کی بعض غلط عادتوں کی وجہ سے علماء اور عوام اس کے خلاف ہو گئے اور بدامنی پھیل گئی۔ اگرچہ حکم نے ہنگاموں اور شورشوں کو ختم کر دیا لیکن اندرونی بدامنی سے فرانس کی حکومت نے فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کی حکومت کو نہ صرف فرانس میں ختم کر دیا بلکہ اسپین میں بھی بارشلونہ تک ساحلی علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں کی حکومت اندلس میں اس کے بعد کئی سو سال تک قائم رہی لیکن جنوب مغربی فرانس اور بارشلونہ کے یہ علاقے پھر ان کے قبضہ میں کبھی نہیں آئے۔ (۱)

حکم اول کا جانشین عبدالرحمن ثانی (۲۰۶ھ تا ۲۳۸ھ) جسے عبدالرحمن اوسط بھی کہتے ہیں ایک قابل اور علم پرور بادشاہ تھا۔ اس کا عہد بڑی حد تک امن و امان کا زمانہ تھا۔ اس کے دَور میں اندلس میں پہلی مرتبہ بحری بیڑہ تیار کیا گیا اور دریائے وادی الکبیر کے کنارے شہر اشبیلیہ میں جہاز سازی کا بہت بڑا کارخانہ قائم ہوا۔

عبدالرحمن ثانی فنون لطیفہ کا بہت شوقین تھا۔ اس کے عہد میں عراق سے ایک مشہور مغنی زریاب قرطبہ آیا جس کی عبدالرحمن نے بڑی سرپرستی کی۔ زریاب صرف موسیقی کا ماہر ہی نہیں تھا بلکہ اپنے عہد کا ایک بڑا فیشن ساز بھی تھا۔ اس کی وجہ سے اندلس کی مجلسی زندگی میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں اور نئے لباس اور کھانے پینے کے طریقے ایجاد ہوئے۔ عبدالرحمن ثانی عباسی حکمران مامون اور معتصم کا ہمعصر تھا۔

---

(۱) اس واقعہ کے تقریباً ایک سو سال بعد ۸۸۹ء میں عرب مسلمان ایک مرتبہ پھر فرانس میں داخل ہوئے لیکن یہ کسی اسلامی حکومت کی باضابطہ فوج کشی نہیں تھی بلکہ کچھ عرب مہم بازوں کی کوشش تھی جو سمندر کی راہ سے آ کر خلیج سینٹ ٹراپس کے راستے جنوبی فرانس میں داخل ہوئے اور سوئٹزرلینڈ میں جھیل کانسٹانس تک بڑھتے چلے گئے۔ وہ جن شہروں پر قابض ہوئے تھے ان میں مارسلز، نیس اور گرینوبل قابل ذکر ہیں یہ قبضہ تقریباً ۸۶ سال قائم رہا۔ مارسلز کا ایک محلہ آج تک عربوں کے نام پر کہلاتا ہے۔

اس ضمن میں ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس زمانے میں مسلمان مہم باز اپنی محدود کوششوں سے کیسے حیرت انگیز کارنامے انجام دے دیتے تھے۔ حکم اول کے زمانے میں جب قرطبہ میں بغاوت ہوئی تھی تو حکومت نے اس کو فرو کرنے کے بعد کئی ہزار مسلمانوں کو جلاوطن کر دیا تھا۔ ان جلاوطن عربوں کی ایک جماعت مراکش کے شہر فاس میں آباد ہو گئی اور دوسری نے مشرقی بحیرۂ روم میں جزیرہ کریٹ فتح کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ کریٹ کا شہر کینڈیا مسلمانوں ہی کا آباد کیا ہوا شہر ہے۔ یہ عربی لفظ خندق کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ کریٹ کی یہ اسلامی حکومت ۸۲۵ء/۲۱۰ھ میں قائم ہوئی اور ۹۶۱ء/۳۵۰ھ تک قائم رہی۔

یہ حکومت عباسی خلافت کو تسلیم کرتی تھی۔

عبدالرحمن الناصر (۳۰۰ھ تا ۳۵۰ھ)

عبدالرحمن ثانی کے بعد تین اور حکمران قرطبہ کے تخت پر بیٹھے لیکن ان کے زمانے میں مرکزی حکومت کمزور ہوگئی اور ملک ہنگاموں اور جھگڑوں کی نذر ہو گیا۔ یہ صورت حال عبدالرحمن الناصر کے تخت نشین ہونے تک قائم رہی۔ اندلس کے اموی حکمرانوں میں سب سے زیادہ شہرت اور عظمت عبدالرحمن ناصر (۳۰۰ھ تا ۳۵۰ھ) کو حاصل ہوئی۔ ناصر عبدالرحمن نام کا تیسرا بادشاہ تھا اس لیے اسے عبدالرحمن ثالث بھی کہتے ہیں۔ وہ عبدالرحمن اعظم کے نام سے بھی مشہور ہے۔

عبدالرحمن ناصر جب تخت پر بیٹھا تو ملک کی حالت بہت خراب تھی۔ ہر طرف بغاوتیں پھیلی ہوئی تھیں اور بادشاہ کا حکم قرطبہ سے باہر چلنا بند ہو گیا تھا۔ الناصر کی عمر صرف ۲۲ سال تھی لیکن اس کے باوجود اس نے ایسی قابلیت سے حکومت کی کہ دس پندرہ سال کے اندر اندر سارے ملک میں امن قائم کر دیا۔ اس نے نہ صرف اسلامی اندلس میں ہی امن قائم کیا بلکہ شمال کے پہاڑوں میں جو عیسائی ریاستیں تھیں اور جو اندلس کی حکومت کے اثر سے آزاد تھیں ان کو بھی اپنا باجگزار بنا لیا۔

عبدالرحمن اعظم نے فوجی قوت کو بڑی ترقی دی۔ اس کی فوج کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی۔ اس کے علاوہ اس نے بحری قوت کو بھی بڑی ترقی دی۔ اندلس کے بحری بیڑے میں اس زمانے میں دو سو جہاز تھے اور ساحلوں پر پچاس ہزار سپاہی ہر وقت حفاظت کے لیے موجود رہتے تھے۔ اندلس کی اس قوت اور شان کو دیکھ کر یورپ کی حکومتوں نے عبدالرحمن اعظم سے تعلقات قائم کرنا چاہے۔ چنانچہ قسطنطنیہ کی رومی حکومت اور فرانس اور جرمنی کی حکومتوں نے اپنے سفراء اس کے دربار میں بھیجے۔ اندلس کے اموی حکمران اب تک ''امیر'' کہلاتے تھے اور انہوں نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا تھا، لیکن چوتھی صدی ہجری میں بغداد پر بنی بویہ کے قبضہ کے بعد عباسی خلفاء بنی بویہ کے حکمرانوں کے ماتحت ہو گئے تھے۔ عبدالرحمن اعظم نے جب دیکھا کہ خلافت میں جان نہیں رہی اور وہ ایک طاقت ور حکمران بن گیا ہے تو اس نے امیر کا لقب چھوڑ کر اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد سے وہ اور اس کے جانشین خلیفہ کہلانے لگے۔

عبدالرحمن اعظم صرف ایک طاقت ور حکمران ہی نہ تھا بلکہ وہ بڑا لائق، عادل اور رعایا پرور بادشاہ بھی تھا۔ اس کے زمانے میں حکومت کی آمدنی ایک کروڑ بیس لاکھ دینار سالانہ تھی۔ اس میں

سے ایک تہائی رقم وہ فوج پر خرچ کرتا تھا اور باقی کو وقت ضرورت پر کام آنے کے لیے خزانے میں جمع کر دیتا تھا۔

اس کے عدل وانصاف کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ اس کے لڑکے نے بغاوت کی۔ جب وہ گرفتار کر کے لایا گیا تو عبدالرحمن نے اس کو موت کی سزا دی۔ اس پر ولی عہد نے اپنے بھائی کو معاف کر دینے کے لیے گڑگڑا کر سفارش کی۔ عبدالرحمان نے جواب دیا:

"ایک باپ کی حیثیت سے مَیں اس کی موت پر ساری زندگی آنسو بہاؤں گا لیکن مَیں باپ کے علاوہ بادشاہ بھی ہوں۔ اگر باغیوں کے ساتھ رعایت کروں گا تو سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گی۔"

اس کے بعد اس کا لڑکا قتل کر دیا گیا۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود عبدالرحمان کی زندگی ایک بادشاہ کی زندگی تھی۔ ہم اس کا مقابلہ خلفائے راشدین یا عمر بن عبدالعزیز سے نہیں کر سکتے۔ نہ وہ نورالدین اور صلاح الدین کی طرح تھا اور نہ وہ اپنے خاندان کے ہشام کی طرح تھا۔ اس نے اپنی لونڈی زہرہ کے لیے قرطبہ کے نواح میں ایک بستی قائم کی جو مدینۃ الزہرہ کہلاتی ہے۔ اس پر اس نے کروڑوں روپیہ صرف کیا۔ اس کی تعمیر چالیس سال تک جاری رہی۔ پچیس سال اس کی زندگی میں اور پندرہ سال اس کے بعد۔ روزانہ دس ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ اس میں شاہی خاندان کے امراء کے بڑے بڑے محل اور ملازمین کے لیے مکانات اور سرکاری دفاتر تھے۔ اس میں ایک چڑیا خانہ بھی تھا جس میں طرح طرح کے جانور پھرا کرتے تھے اور شہر کے لوگ تفریح کے لیے یہاں آیا کرتے تھے۔

مدینۃ الزہرا کے محلات کی تکمیل ہونے کے بعد لوگوں نے خلیفہ کو مبارکباد دی جمعہ کا دن تھا۔ مسجد میں سب نماز کے لیے جمع ہوئے۔ قاضی منذر نے خطبہ پڑھا اور اس خطبہ میں عبدالرحمن کی اس فضول خرچی کی مذمت کی اور بُرا بھلا کہا۔ قاضی منذر بڑے دلیر قاضی تھے۔ وہ حق بات کہنے سے کبھی باز نہیں آتے تھے۔ عبدالرحمن بھی ایک عادل حکمران تھا اور اس نے قاضی منذر جیسے آدمی کو قاضی اس لیے مقرر کیا تھا کہ وہ عدل وانصاف سے کام لینے میں کسی سے نہ ڈریں۔ اس لیے اس نے قاضی صاحب کی باتیں صبر سے سنیں۔ اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور رونے لگا۔

عبدالرحمن اعظم کے بعد اس کا لڑکا حکم ثانی (۳۵۰ھ تا ۳۶۶ھ) تخت نشین ہوا۔ اس نے

سولہ سال حکومت کی۔ وہ پڑھنے لکھنے کا بڑا شوقین تھا۔ اس نے شاہی کُتب خانے میں چار لاکھ کتابیں جمع کی تھیں۔ کتابیں نقل کرنے کے لیے اس کے محل میں دس ہزار خطاط موجود رہتے تھے۔ اسلامی دنیا کے ہر حصے میں حکم کے گماشتے پھرتے رہتے تھے اور جب کوئی مصنف کتاب مکمل کرتا تھا تو اسے بڑی قیمت دے کر خرید لیتے تھے اور قرطبہ کے شاہی کُتب خانے کے لیے روانہ کر دیتے تھے۔

منصور (۳۶۶ھ تا ۳۹۳ھ)

الحکم کے بعد اس کا لڑکا ہشام ثانی تخت پر بیٹھا لیکن اس کے عہد میں اندلس پر جس شخص نے حکومت کی وہ اندلس کا وزیر اعظم محمد ابن ابی عامر تھا جو منصور کے لقب سے مشہور ہے۔ منصور کا تعلق ایک معمولی گھرانے سے تھا۔ اس نے قرطبہ میں تعلیم حاصل کی۔ منصور لڑکپن ہی سے بڑا عالی حوصلہ تھا اور حکومت کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تفریح کرنے کے لیے ایک باغ میں گیا۔ اس کے دوست کھیل تفریح میں مصروف ہو گئے لیکن منصور ایک کنارے پر خاموش بیٹھ گیا۔ جب اس کے دوستوں نے اس کو خاموش دیکھا تو پوچھا۔

''ارے بھائی تم یہ کس فکر میں پڑے ہو۔''

منصور نے جواب دیا:

''میں سوچ رہا ہوں کہ جب وزیر اعظم ہو جاؤں گا تو شہر کا قاضی کس شخص کو بناؤں گا۔''

''منصور اگر تم وزیر اعظم ہو جاؤ تو مجھے فلاں عہدہ دے دینا۔'' ایک لڑکے نے کہا۔

''منصور تم مجھے فلاں عہدہ دے دینا۔'' دوسرے لڑکے نے کہا۔ اسی طرح تیسرے لڑکے نے بھی کوئی درخواست کی لیکن چوتھے لڑکے نے مذاق اڑایا اور کہا کہ:

''منصور اگر تم بادشاہ ہو جاؤ تو میرا مُنہ کالا کر کے اور گدھے پر بٹھا کر شہر سے باہر نکال دینا''

''تم سب کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جس کی تم لوگوں نے خواہش کی۔'' منصور نے جواب دیا۔ اور تمام ساتھی کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

کوشش کرنے والوں کو خدا کامیاب کرتا ہے۔ منصور کو بھی خدا نے کامیاب کیا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ شاہی محل کے سامنے لوگوں کی عرضیاں لکھنے کا کام کرنے لگا۔ اس کے بعد خلیفہ الحکم کے بیٹے کا اتالیق مقرر ہو گیا۔ اس کے بعد شہر کا کوتوال ہوا۔ پھر افریقہ کی مہم کا نگران بنا کر بھیجا

گیا۔ اس مہم کی کامیابی کے بعد وہ فوجوں میں بڑا ہر دلعزیز ہو گیا اور سپاہی اس پر جان چھڑکنے لگے۔ اور جب خلیفہ کا انتقال ہوا تو وہ حاجب بن گیا۔ اندلس میں چونکہ حاجب کی ذمہ داری وہی ہوتی تھی جو مشرقی ملکوں میں وزیر اعظم کی ہوتی تھی اسی لیے ہم نے منصور کو وزیر اعظم لکھا ہے۔

اس طرح منصور بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ اور ایسا وزیر اعظم ہوا کہ جس کی مثال اندلس کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ کہنے کو وزیر اعظم تھا لیکن صحیح معنوں میں حکمران وہی تھا۔ اس نے اپنے دوستوں سے جو وعدے کیے تھے ان کو اس نے پورا کر دیا۔

شمال کی مسیحی ریاستوں سے مسلمانوں کی برابر لڑائیاں رہتی تھیں۔ یہ حکومتیں جب بھی موقع دیکھتی تھیں اسلامی علاقہ پر حملہ آور ہو جاتی تھیں۔ منصور نے ۲۸ سالہ حکومت میں ان کے خلاف پچاس لڑائیاں لڑیں اور ان تمام ریاستوں کو اپنا محکوم بنا لیا۔

منصور جب جہاد سے واپس قرطبہ لوٹتا تو راستہ میں عوام ہزاروں کی تعداد میں دیکھنے آتے اور قرطبہ کے عوام چراغاں کرتے۔

منصور نے شمال کی ریاستوں کو محکوم بنانے کے علاوہ افریقہ میں بھی سلطنت کی حدود میں اضافہ کیا اور مراکش کے تقریباً پورے علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ منصور کے زمانے میں اندلس جتنا طاقتور ہوا اتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ اس نے اندلس کی حکومت کو انتہائی عروج پر پہنچا دیا۔

میدان جنگ میں جو خاک اس کے کپڑوں پر جم جاتی تھی اس کو منصور کپڑے سے جھٹک کر ایک ڈبے میں رکھ لیتا تھا۔ اپنے انتقال کے وقت اس نے یہ وصیت کی کہ یہ خاک میرے جسم پر چھڑک دی جائے۔ چنانچہ جب اس کا انتقال ہوا تو ایسا ہی کیا گیا۔

منصور کو عمارتیں بنوانے سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ اس سلسلے میں اس کا سب سے بڑا کام مسجد قرطبہ کی توسیع ہے۔

اس نے قرطبہ کی جامع مسجد کو دُگنا کر دیا۔ جب اس نے مسجد کی توسیع کے لیے آس پاس کے مکان اس میں شامل کرنے چاہے تو اور سب لوگوں نے خوشی سے اپنے مکان اس کے ہاتھ بیچ دیئے۔ صرف ایک بوڑھی عورت اڑ گئی اور شرط لگائی کہ بادشاہ جب تک اسے کھجوروں کے باغ والا مکان مفت نذر نہیں کریں گے وہ اپنا مکان نہیں دے گی۔ منصور نے اس عورت کی مرضی کے مطابق مکان کی تلاش کرائی۔ جب عورت نے مکان پسند کر لیا تو منصور نے وہ مکان بھی اسے

دے دیا اور اس مکان کی پوری قیمت بھی اسے ادا کردی۔

منصور نے عوام کے فائدے کے بہت کام کیے۔ پُل بنوائے، نہریں کھدوائیں اور سڑکیں بنوائیں۔

منصور کو عدل وانصاف کا اتنا خیال تھا کہ وہ کسی کی سفارش نہیں سنتا تھا۔ ایک بار قرطبہ کے قاضی نے اس کے ایک مصاحب سے حلف لیے بغیر فیصلہ کردیا۔ اس فیصلے کی خبر اس کو ہوئی تو اس نے حکم بھیجا کہ شریعت کا قانون سب کے لیے یکساں ہے۔ ہمارے مصاحب سے بھی حلف لو۔ منصور کے اس مصاحب نے اپنے عہدے کے غرور میں حلف اٹھانے سے انکار کردیا۔ منصور نے جب یہ دیکھا تو اس کو ملازمت سے الگ کردیا۔

منصور رات کو بھیس بدل کر شہر کا گشت کیا کرتا تھا۔ رات کو بہت کم سوتا تھا اور اس طرح لوگوں کی تکلیفوں کو معلوم کرتا تھا اور پھر ان کو دُور کرتا تھا۔

منصور کے بعد اس کے لڑکے المظفر (۱۰۰۲ء/۳۹۳ھ تا ۱۰۰۸ء/۳۹۹ھ) نے چھ سال کامیابی سے حکومت کا انتظام سنبھالا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد جب اس کے بھائی عبدالرحمن سنچول نے حکومت سنبھالی تو اموی خاندان کے لوگوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ ان لوگوں کو یہ شکایت تھی کہ بنو عامر[1] نے خلیفہ کو بالکل بے بس کردیا ہے اور خود حکومت پر قابض ہو گئے ہیں۔ عبدالرحمن اس بغاوت میں مارا گیا۔ خلیفہ ہشام شاہی خاندان کے ایک دوسرے امیدوار کے حق میں دست بردار ہوگیا۔ لیکن اس بغاوت نے بنو عامر کی حکومت ہی ختم نہیں کی بلکہ اندلس میں اسلامی اقتدار کی بنیادیں ہلا دیں۔ ہر طرف بدامنی پھیل گئی۔ بیس سال کے عرصہ میں قرطبہ کے تخت پر کئی اموی شہزادے بیٹھے اور حالات بگڑتے چلے گئے یہاں تک کہ ۴۲۲ھ میں اموی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

تمدنی ترقی

اندلس کے اموی خاندان نے ۱۳۸ھ سے ۴۲۲ھ تک کُل ۲۸۴ سال حکومت کی۔ اندلس کی تاریخ کا یہ بڑا شاندار دَور ہے۔ مسلمانوں نے اس زمانہ میں سیاسی حیثیت سے اندلس

---

(۱) منصور کا اصل نام محمد بن ابی عامر تھا۔ اس لیے وہ اور اس کی اولاد بنو عامر کہلاتی ہے۔

میں جو عروج حاصل کیا ویسا پھر کبھی حاصل نہیں ہوا۔ اندلس کا دارالحکومت قرطبہ اس دور میں ساری دنیا میں بغداد کے بعد دوسرا بڑا شہر بن گیا تھا۔ صنعت وحرفت، زراعت اور تجارت کو خوب ترقی ہوئی۔ اندلس کے اموی حکمران علم وفن کے ایسے ہی سرپرست تھے جیسے کہ عباسی خلفاء۔ لیکن اندلس میں چونکہ اسلامی حکومت کا آغاز دیر سے ہوا اور یہ ملک اسلام کے ابتدائی مرکزوں عراق اور مصر سے بہت دُور تھا اس لیے یہاں علمی ترقی بعد میں شروع ہوئی۔ اور اسی وجہ سے اس دَور میں ہمیں اندلس میں بڑے بڑے عالموں کے نام کثرت سے نظر نہیں آتے جیسے عباسی خلافت میں نظر آتے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری میں جب کہ اندلس میں عبدالرحمن اعظم، الحکم اور منصور کا دَور دورہ تھا اندلس کی تاریخ کا عہد زریں ہے۔ اس زمانہ میں علمی ترقی پوری تیزی سے شروع ہوگئی اور کئی ممتاز اہل علم پیدا ہوئے۔ ان میں ایک زہراوی ہیں۔ زہراوی عبدالرحمن اور حکم کے درباری طبیب تھے۔ زہراوی کا خاص فن جراحت یعنی مریض کی چیر پھاڑ تھا۔ اب تک مسلمان طبیبوں نے دوا کے ذریعہ علاج کرنے میں تو کمال پیدا کیا تھا لیکن جراحی کی طرف انہوں نے توجہ نہیں کی تھی۔ زہراوی پہلے مسلمان طبیب ہیں جنھوں نے فن جراحی میں کمال حاصل کیا۔ جس طرح سے رازی تاریخ میں سب سے بڑے طبیب ہوئے ہیں اسی طرح زہراوی سب سے بڑے مسلمان جراح تھے۔ زہراوی نے ''التصریف'' کے نام سے اس فن میں ایک کتاب بھی لکھی جو آج بھی موجود ہے۔ یورپ میں فن جراحی کا آغاز اسی کتاب کے ذریعہ ہوا۔

اس زمانہ کے ایک مشہور ادیب ابوعلی قالی ہیں۔ ان کی کتاب ''امالی'' عربی زبان میں تاریخ اور ادب کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

ابن عبدربہ بھی اس زمانہ کے ایک مشہور شاعر اور ادیب ہوئے ہیں۔ بعض لوگ ان کو اندلس کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کی شہرت نثر کی ایک کتاب عقد الفرید کی وجہ سے ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے اور امالی کی طرح تاریخ اور ادب کی بہترین کتابوں میں سے ہے۔

امویوں کے زمانہ کے علماءِ دین میں یحییٰ بن یحییٰ (۱۵۲ھ تا ۲۳۴ھ) بہت ممتاز ہیں ان کا تعلق اموی حکومت کے ابتدائی دَور سے ہے۔ یحییٰ مدینہ کے مشہور محدث امام مالکؒ کے شاگرد ہیں اور وہ کئی سال تک ان کی صحبت میں رہے۔ وہ ایک مرتبہ دوسرے شاگردوں کے ساتھ امام

مالکؒ سے پڑھ رہے تھے کہ باہر سے ایک ہاتھی گزرا۔ ہاتھی دیکھنے کے لیے تمام شاگرد اُٹھ کر چلے گئے لیکن یحییٰ نہیں گئے۔ امام نے ان سے کہا کہ ہاتھی تو تمہارے ملک میں نہیں ہوتا ہے جاؤ دیکھ آؤ۔ یحییٰ نے جواب دیا کہ میں اندلس سے یہاں تک علم حاصل کرنے کے لیے آیا ہوں ہاتھی دیکھنے نہیں آیا۔ امام مالکؒ اس جواب سے بہت خوش ہوئے۔ اور وہ ان کو عاقل اندلس کہتے تھے۔

قاضی یحییٰ اندلس کے دوسرے امیر ہشام کے پوتے عبدالرحمن دوم کے زمانہ میں تھے اور ان کا حکومت میں اتنا اثر تھا کہ عبدالرحمن ان کے مشورہ سے تمام قاضی مقرر کرتا تھا اور وہ جس کو چاہتے تھے معزول کرا دیتے تھے۔ ان کے فیصلوں میں بادشاہ کسی قسم کی رکاوٹ نہیں کرتا تھا۔ اور وہ اتنے جری تھے کہ بادشاہ کے خلاف فیصلے کر دیتے تھے۔

امام مالکؒ کی کتاب ''موطا'' کو اندلس میں قاضی یحییٰ ہی لائے۔

قرطبہ

اموی دور میں قرطبہ دارالخلافہ تھا اور ملک کا سب سے بڑا شہر۔ اپنی وسعت، شاندار عمارتوں اور خوبصورتی کی وجہ سے اس کو ''عروس البلاد'' یعنی شہروں کی دلہن کہا جاتا تھا۔ یہ شہر علم و ادب اور صنعت و حرفت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں کی عمارتوں میں جامع قرطبہ اور مدینۃ الزہرا کے محلات فن تعمیر کے بہترین نمونے تھے۔ قرطبہ کے حالات چونکہ ہم نے ''یورپ کے استاذ'' والے باب میں تفصیل سے بیان کیے ہیں اس لیے یہاں اندلس کے چند دوسرے بڑے شہروں کا حال لکھا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اُندلس جیسے چھوٹے سے ملک میں بھی کتنی بڑی تعداد میں بڑے بڑے اور ترقی یافتہ شہر موجود تھے۔

اشبیلیہ

اندلس کا دوسرا بڑا شہر تھا۔ صنعت و حرفت اور جہاز سازی کا مرکز تھا۔ دریائے وادی الکبیر کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے جہاز شہر تک آ جاتے تھے۔ آلات حرب کی صنعت میں یہاں کی کمان بہت اچھی سمجھی جاتی تھی۔ باشندے خوش ذوق اور نفاست پسند تھے۔ فن تعمیر اور باغبانی میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ مٹی کے برتن نہایت خوبصورت بناتے تھے۔ موسیقی سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ مشہور تھا کہ جب کوئی عالم اشبیلیہ میں مر جاتا تھا تو اس کی کتابیں قرطبہ

میں فروخت کی جاتی تھیں اور جب قرطبہ میں کوئی موسیقار مرتا تھا تو اس کے آلات موسیقی اشبیلیہ میں لاکر فروخت کیے جاتے تھے۔ یہ شہر 5½ سو سال مسلمانوں کے قبضہ میں رہا۔

طلیطلہ

یہ اس جگہ سے قریب واقع تھا جہاں اب اسپین کا دار الحکومت میڈرڈ واقع ہے۔ یہاں کی بنی ہوئی تلوار اندلس میں سب سے اچھی سمجھی جاتی تھی۔ زعفران کی وسیع پیمانہ پر کاشت ہوتی تھی اور اعلیٰ درجہ کی سمجھی جاتی تھی۔ یہاں کی آب و ہوا غلہ کے لیے اتنی موزوں تھی کہ غلہ ستر سال تک خراب نہیں ہوتا تھا۔ یہ شہر ۳۸۲ سال مسلمانوں کے قبضہ میں رہا۔

بلنسیہ

باغوں کی کثرت اور زعفران کی وسیع پیمانہ پر کاشت کی وجہ سے اس کو خوشبوؤں کا شہر کہا جاتا تھا۔ یہاں کی روغنی اینٹیں اور ریشمی کپڑے دُور دُور تک مشہور تھے۔ شاطبہ کا شہر جو یورپ میں کاغذ سازی کا سب سے بڑا مرکز تھا بلنسیہ کے نواح میں تھا۔ یہاں کے باشندے دین داری، حُسنِ اخلاق اور مہمان نوازی میں مشہور تھے۔ نظام آب پاشی کا بڑا مرکز تھا۔ یہ شہر ۵۳۲ سال مسلمانوں کے قبضہ میں رہا۔

مُرسیہ

یہ بھی بلنسیہ کی طرح مصنوعی نظام آب پاشی کا مرکز تھا۔ حسین اور خوش منظر شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ قالین اور دھاری دار کپڑوں کی صنعت کا مرکز تھا۔ ان کپڑوں سے دیواروں کو سجایا جاتا تھا۔ یہ شہر پونے چھ سو سال مسلمانوں کے پاس رہا۔

المریہ

ملک میں ریشم سازی کا سب سے بڑا مرکز تھا اور طرح طرح کے کپڑے تیار کیے جاتے تھے۔ ریشم سازی کے آٹھ سو کارخانے تھے۔ اسلحہ سازی اور جہاز سازی کا مرکز تھا۔ میووں اور پھلوں کی کثرت تھی۔ بہت بڑا بندرگاہ ہونے کی وجہ سے تجارت کا مرکز تھا اور سارے یورپ اور شمالی افریقہ کے جہاز یہاں آتے تھے۔ تجارت پیشہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے باشندے

پورے اندلس میں سب سے زیادہ دولت مند تھے۔ یہ شہر ۷۸۰ سال مسلمانوں کے پاس رہا۔

مالقہ

یہ شہر بھی المریہ کی طرح ایک بڑی بندرگاہ تھا۔ یہاں کے انجیر دُور دُور مشہور تھے اور ہندوستان تک جاتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آخر دَور میں یہاں کے باشندے اخلاقی زوال کا شکار ہو گئے تھے۔ اور شراب سازی کرنے لگے تھے اور یہاں کی شراب بہترین سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ جب یہاں کا ایک حکمران مرنے لگا تو لوگوں نے اس سے کہا کہ خدا سے مغفرت کی دعا کرے اور حکمران نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ یاالٰہی میں تجھ سے جنت کی تمام چیزیں مانگتا ہوں مثلاً اشبیلیہ کے انگور اور مالقہ کی شراب۔ اس شہر پر مسلمانوں کا آٹھ سو سال قبضہ رہا۔

اندلس کی اموی حکومت

(۷۵۶ء/۱۳۸ھ تا ۱۰۳۰ء/۴۲۲ھ)

۱۔ عبدالرحمن الداخل	۷۵۶ء/۱۳۸ھ تا ۷۸۸ء/۱۷۲ھ
۲۔ ہشام اول	۷۸۸ء/۱۷۲ھ تا ۷۹۶ء/۱۸۰ھ
۳۔ حکم اول	۷۹۶ء/۱۸۰ھ تا ۸۲۲ء/۲۰۶ھ
۴۔ عبدالرحمن الاوسط	۸۲۲ء/۲۰۶ھ تا ۸۵۲ء/۲۳۸ھ
۵۔ محمد اول	۸۵۲ء/۲۳۸ھ تا ۸۸۶ء/۲۷۳ھ
۶۔ منذر	۸۸۶ء/۲۳۸ھ تا ۸۸۸ء/۲۷۵ھ
۷۔ عبداللہ	۸۸۸ء/۲۷۵ھ تا ۹۱۲/۳۰۰ھ
۸۔ عبدالرحمن الناصر	۹۱۲ء/۳۰۰ھ تا ۹۶۱ء/۳۵۰ھ
۹۔ حکم دوم	۹۶۱ء/۳۵۰ھ تا ۹۷۶ء/۳۶۶ھ
۱۰۔ ہشام دوم	۹۷۶ء/۳۶۶ھ تا ۱۰۰۹ء/۳۸۸ھ

منصور (۳۶۶ھ تا ۳۹۳ھ) ہشام دوم کا وزیر اعظم تھا۔ ہشام دوم کے بعد اندلس کی اموی حکومت کا زوال شروع ہو گیا اور بائیس سال کے عرصہ میں دس حکمران تخت پر بیٹھے اور اتارے گئے۔ ۱۰۳۰ء/۴۲۲ھ میں اموی حکومت ختم ہو گئی۔

باب ۱۹

بربر اسلام کی ڈھال بن گئے

اموی حکومت کے زوال کے بعد اندلس کے مسلمانوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی اور ملک میں کئی خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں۔ ان حکومتوں میں ذیل کی تین حکومتیں قابل ذکر ہیں:

۱۔ بنوذوالنون

یہ بربر خاندان کی حکومت تھی اور اس کا مرکز شہر طلیطلہ تھا۔ یہ حکومت ۱۰۳۶ء/۴۲۸ھ سے ۱۰۸۵ء/۴۷۸ھ تک قائم رہی۔ اس کے بعد یہ شہر عیسائیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ لیکن مسلمان اس شہر میں ۱۴۹۲ء/۸۹۸ھ میں غرناطہ کے سقوط تک موجود رہے۔ اس کے بعد ان کو شہر سے نکال دیا گیا۔ یہاں کے عیسائی بھی مسلمانوں کی طرح عربی بولتے تھے۔ مسلمانوں کے بعد ۱۲۵۰ء سے ۱۴۰۰ء تک یہ شہر مسلمانوں کے علوم کا مغربی زبانوں میں ترجمہ کرنے کا بہت بڑا مرکز رہا۔ یہاں کا حکمران الفانسو دہم (۱۲۵۲ء تا ۱۲۸۳ء) خود کو دو ملتوں یعنی عیسائی اور مسلمانوں کا بادشاہ کہلاتا تھا۔ اس کے زمانہ میں عربی کتابوں کے سب سے زیادہ ترجمے ہوئے۔

۲۔ سرقطہ

اس شہر پر دو مختلف خاندانوں نے ۱۰۱۲ء/۴۰۳ھ سے ۱۱۰۹ء/۵۰۳ھ تک حکومت کی۔ ۵۰۳ھ سے ۵۱۲ تک یہ شہر مرابطین کے قبضہ میں رہا۔ اس کے بعد عیسائیوں کا تسلط قائم ہوگیا۔ طلیطلہ کے بعد یہ اسلامی اندلس کا دوسرا بڑا شہر تھا جس پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا۔

۳۔ بنی افطس

یہ حکومت ۱۰۴۲ء/۴۳۳ھ سے ۱۰۹۳ء/۴۸۶ھ تک قائم رہی۔ پھر مرابطین اور اس کے بعد موحدین اس شہر پر قابض ہوگئے۔ اس حکومت کا صدر مقام بطلیوس تھا۔

ان حکومتوں کی وجہ سے ان شہروں کو بڑی ترقی ہوئی۔ یہ بادشاہ علم و ادب کے بڑے

سرپرست تھے اور ان میں بعض بادشاہ مصنف اور شاعر بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً طلیطلہ کے بادشاہ المامون (۴۳۵ھ تا ۴۹۹ھ) کو ریاضی کا بڑا شوق تھا اور اس نے اپنے دارالحکومت میں عجیب و غریب پن گھڑیاں بنائی تھیں۔ یہ پن گھڑیاں طلیطلہ کے مشہور منجم ابوالقاسم عبدالرحمن نے بنائی تھیں۔ ان پن گھڑیوں سے وقت کے علاوہ دن اور تاریخ بھی معلوم کی جاسکتی تھی۔

شہر کے باہر دریائے تاجہ کے کنارے دو حوض بنائے گئے تھے جو چاند کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بھرتے جاتے اور چاند کے گھٹنے کے ساتھ ساتھ خالی ہوتے جاتے تھے۔ چودہویں رات کو جب چاند پورا ہو جاتا تھا یہ حوض پورے بھر جاتے تھے اس کے بعد خالی ہونا شروع ہو جاتے تھے اور انتیسویں دن رات کو بالکل خالی ہو جاتے تھے۔

ایک عجیب بات ان حوضوں میں یہ تھی کہ اگر کوئی شخص اپنی طرف سے ان میں پانی ڈالے یا ان سے پانی نکال لے تو اس کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ جتنا پانی باہر سے کوئی ڈالتا تھا حوض میں گرتے ہی غائب ہو جاتا تھا اور جس قدر پانی کوئی نکالتا فوراً اس قدر کمی پوری ہو جاتی تھی۔

جب طلیطلہ میں عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا تو پچاس برس بعد عیسائی بادشاہ نے ان حوضوں کا راز معلوم کرنا چاہا اور ایک حوض کو کھدوانا شروع کیا جس سے نقصان پہنچ گیا اور حوضوں میں پانی آنا بند ہو گیا۔ ان حوضوں کے کھنڈر اب بھی طلیطلہ کے شہر میں موجود ہیں۔

ہاں تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ بنی امیہ کے بعد اندلس میں کئی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں جو آپس میں لڑتی رہتی تھیں اس لیے شمال کے عیسائیوں کا جن میں قشتالہ کی حکومت بہت طاقتور تھی مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ عیسائی آہستہ آہستہ مسلمانوں کے شہروں پر قبضہ کرتے چلے گئے۔ انہوں نے ۴۷۸ھ میں طلیطلہ بھی فتح کرلیا اور اشبیلیہ کے بادشاہ معتمد کو خراج دینے پر مجبور کر دیا۔ معتمد کی حکومت اندلس کی حکومتوں میں سب سے بڑی حکومت تھی۔ اشبیلیہ کے علاوہ قرطبہ بھی اس کے قبضے میں تھا۔ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ معتمد بھی جو سب سے بڑا بادشاہ تھا عیسائیوں کے مقابلے میں ناکام رہا تو انہوں نے اندلس کو عیسائیوں سے بچانے کے لیے سمندر پار امیر یوسف بن تاشفین سے جس نے اس زمانے میں مراکش میں ایک طاقتور حکومت قائم کر لی تھی مدد مانگی۔

یوسف بن تاشفین (۴۵۳ھ تا ۵۰۰ھ)

یوسف بن تاشفین (۴۵۳ھ تا ۵۰۰ھ) مراکش کے جنوب میں صحرائی علاقے کا رہنے والا تھا۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے صحرائے اعظم اور اس کے جنوب میں رہنے والے نیم وحشی بربر اور حبشی باشندوں سے کئی سال تک لڑائیاں کیں اور ان کے علاقے میں اپنی حکومت دریائے سینی گال تک بڑھا دی تھی۔ یہ لوگ بربروں کے خلاف جہاد ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ان میں اسلام کی تبلیغ بھی کرتے تھے اور اس طرح انہوں نے بے شمار بربروں اور حبشیوں کو مسلمان بنایا۔ تبلیغ کا یہ کام یوسف کے چچا عبداللہ بن یٰسین کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے دریائے سینگال کے ایک جزیرے میں ایک خانقاہ بنالی تھی۔ شروع میں یوسف بن تاشفین اس کام میں اپنے چچا کے ساتھ تھا۔ لیکن بعد میں یوسف شمال کی طرف آ گیا اور یہاں فاس اور دوسرے شہر فتح کر کے کوہ اطلس کے دامن میں شہر مراکش کی بنیاد ڈالی۔ اندلسی مسلمانوں کا وفد یوسف سے امداد لینے کے لیے اسی شہر مراکش میں آیا۔ یوسف بن تاشفین مدد کے لیے تیار ہو گیا اور ایک طاقتور فوج کے ساتھ اندلس روانہ ہوا۔ عیسائی بادشاہ الفانسو نے ''زلاقہ'' کے میدان جنگ میں مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ ایک سخت لڑائی کے بعد یوسف بن تاشفین نے الفانسو کو شکست فاش دی۔ (۴۷۹ھ)

اس جنگ نے ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ عیسائیوں کی ہمتیں ٹوٹ گئیں اور یوسف بن تاشفین نے اندلس کی چھوٹی چھوٹی مسلمان حکومتیں ختم کر کے ان کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

یوسف بن تاشفین بڑا نیک اور عادل حکمران تھا۔ اس کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ تاریخ اسلامی میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ صحرائے اعظم میں اسلام کی اشاعت اور اندلس میں مسیحی یلغار کو روکنا اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ شہر مراکش کی تعمیر بھی قابل فخر کارناموں میں شمار ہوتی ہے کیونکہ اس طرح اس نے ایک نیم وحشی علاقہ میں دارالحکومت قائم کر کے تہذیب اور علم کی بنیاد ڈال دی۔

یوسف نے کُل پچاس سال حکومت کی۔ اس کی قائم کی ہوئی سلطنت دولت مرابطین (۱۰۶۱ء/۴۵۳ھ تا ۱۱۴۷ء/۵۴۱ھ) کہلاتی ہے۔ یوسف کے انتقال کے بعد یہ حکومت چالیس سال اور قائم رہی۔ اس کے بعد جن لوگوں کی حکومت ہوئی وہ موحدین کہلاتے ہیں۔

خلافت موحدین

موحدین ایک جماعت کا نام تھا۔ ملک کی اصلاح کرنا اور مسلمانوں کے اندر جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں ان کو دُور کرنا ان کا مقصد تھا۔ اس جماعت کو محمد بن تومرتؔ نے قائم کیا تھا۔ محمد ابن تومرت بہت بڑے عالم تھے۔ وہ عہد سلجوقی کے مشہور عالم امام غزالیؒ کے شاگرد تھے اور ان ہی کی تحریک پر ابن تومرت نے مغرب میں جو اب مراکش کہلاتا ہے اپنی اصلاحی تحریک شروع کی تھی۔ اس تحریک کا مقصد سماجی اور اخلاقی اصلاح تھا۔ وہ جہاں کہیں شریعت کے خلاف کوئی حرکت دیکھتے اس پر ٹوکتے، شراب کے برتن توڑ دیتے۔ گانے بجانے کے آلات اٹھا کر پھینک دیتے۔ ابن تومرت نے صرف سختی ہی نہیں کی۔ انہوں نے وعظ اور نصیحت کے ذریعہ لوگوں میں اسلامی روح پیدا کرنی شروع کردی۔ ان کی ہردلعزیزی اور مقبولیت دیکھ کر مرابطین کی حکومت کو خطرہ پیدا ہوا اور ان کو مراکش سے جلاوطن کردیا۔ وہ دوسرے شہر اغمات میں آگئے لیکن یہاں سے بھی ان کو جلاوطن کردیا گیا۔ اب وہ اپنے وطن ہرغہ چلے گئے جو پہاڑوں میں تھا۔ یہاں کے لوگوں نے ہزاروں کی تعداد میں ان کی دعوت قبول کی۔ انہوں نے فوجی تربیت بھی حاصل کی اور مذہبی تعلیم بھی۔ اب مرابطین کی فوج یہاں بھی آگئی اور بستی کا محاصرہ کرلیا۔ لیکن اب ابن تومرت کے ساتھی جن کا نام موحدین تھا مقابلہ کرنے کے قابل ہوگئے تھے اس لیے بڑی سخت لڑائی ہوئی اور سرکاری فوج کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد موحدین اور مرابطین کے درمیان لڑائیوں کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ ابن تومرت کا (۵۲۴ھ) میں انتقال ہوگیا اور ان کے ایک ساتھی عبدالمومن کو جماعت موحدین کا امیر منتخب کرلیا گیا۔

عبدالمومن (۵۲۴ھ تا ۵۵۸ھ)

عبدالمومن کے زمانے میں موحدین نے بڑی قوت حاصل کی۔ انہوں نے ۱۱۴۷ء / ۵۴۱ھ میں مراکش پر قبضہ کرکے مرابطین کا خاتمہ کردیا۔ اس کے بعد عبدالمومن نے ایک فوج اندلس بھیجی جس نے مرابطین کی حکومت وہاں سے بھی ختم کردی۔ اب عبدالمومن نے مشرق کا رُخ کیا اور طرابلس تک اپنی سلطنت کو وسعت دے دی۔ اس زمانے میں طرابلس، تیونس اور مہدیہ پر جو اس زمانے میں افریقہ کہلاتا تھا نارمن قوم قابض تھی۔ یہ لوگ عیسائی تھے اور ان کی حکومت

جزیرہ صقلیہ میں قائم تھی۔ جس زمانے میں یورپ کے عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف صلیبی لڑائیاں شروع کی تھیں اور شام کے ساحلی علاقے اور بیت المقدس پر قبضہ کیا تھا تقریباً اسی زمانے میں نارمنوں نے قیروان، تیونس اور طرابلس کے علاقوں پر حملے شروع کر دیئے۔ اس زمانے میں یہاں صنہاجی (۹۷۲ء/۳۶۳ھ تا ۱۱۴۸ء/۵۴۳ھ) خاندان کی حکومت تھی جسے بنوزیری بھی کہا جاتا ہے۔ یہ حکومت فاطمی خلافت کے زوال کے بعد قائم ہوئی تھی۔ جب اس حکومت کو زوال ہوا تو نارمنوں نے ان شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح مسیحی یورپ نے ایک ہی وقت میں اسلامی دنیا کے دو علاقوں یعنی ساحل شام اور افریقہ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ لیکن جس طرح مشرق میں نورالدین اور صلاح الدین نے مسیحی حکومت کو ختم کیا اسی طرح عبدالمومن نے تونس اور طرابلس فتح کر کے مغرب میں عیسائی اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ مرابطین اور موحدین کی لڑائیوں کے زمانہ میں اندلس میں مسیحی پھر زور پکڑ گئے تھے۔ عبدالمومن نے اندلس میں بھی ان کی پیش قدمی روک دی۔

عبدالمومن سلطان نورالدین کا ہمعصر تھا اور اس کا مسلمانوں پر اتنا ہی احسان ہے جتنا نورالدین اور اس کے جانشین صلاح الدین کا احسان ہے۔ عبدالمومن نے جتنی وسیع حکومت قائم کی اتنی بڑی حکومت شمالی افریقہ کے کسی مسلمان نے اب تک قائم نہیں کی تھی اور نہ اس کے بعد پھر اتنی بڑی حکومت قائم ہوئی۔

عبدالمومن تاریخ اسلام کا بہت بڑا حکمران ہے۔ وہ ایک معمولی انسان تھا اس نے اپنی قابلیت سے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈال دی۔ وہ شریعت کا بڑا پابند تھا اور اس نے اس کی کوشش کی کہ قرآن اور سنت کے مطابق حکومت کی جائے۔ وہ علم و فن کا بھی بڑا سرپرست تھا اور اس دور کے مشہور فلسفی ابن طفیل (متوفی ۱۱۸۵ء) اور اس عہد کے سب سے بڑے طبیب عبدالملک بن زہر اس کے دربار سے وابستہ تھے۔

آخر میں عبدالمومن نے ایک بڑے جہاد کا اعلان کیا۔ اب تک یورپ والے اسلامی حکومتوں پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ اب عبدالمومن نے خود یورپ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ جہاد کی زور شور سے تیاریاں شروع کر دیں، چار سو جنگی جہاز تعمیر کیے گئے اور تین لاکھ دس ہزار سوار اور ایک لاکھ پیادہ فوج جمع کی۔ لیکن ابھی یہ فوج روانہ نہیں ہوئی تھی کہ عبدالمومن کا انتقال ہو گیا۔ اگر عبدالمومن کا بے وقت انتقال نہ ہوتا تو شاید آج یورپ کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہوتا۔

عبدالمومن کا ۵۵۸ھ میں ۵۸ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

عبدالمومن کے بعد موحدین کی جماعت نے اس کے لڑکے یوسف (۵۵۸ھ تا ۵۸۰ھ) کو امیر منتخب کیا۔ یوسف نے ۲۲ سال تک بڑی قابلیت سے حکومت کی۔ اندلس کے شہر اشبیلیہ کو بڑی ترقی دی۔ یوسف اموی خلیفہ الحکم کی طرح علم و ادب کا شوقین تھا۔ اس نے مراکش میں جو کتب خانہ قائم کیا تھا اس میں بھی الحکم کے کتب خانہ کی طرح چار لاکھ کتابیں تھیں۔ اس زمانہ کے دو سب سے بڑے فلسفی ابن طفیل اور ابن رشد کا اس کے دربار سے تعلق تھا۔

یعقوب المنصور (۵۸۰ھ تا ۵۹۵ھ)

موحدین میں سب سے زیادہ مشہور حکمران یوسف کا لڑکا یعقوب المنصور ہوا ہے۔ یعقوب کی سب سے زیادہ شہرت اس فتح کی وجہ سے ہے جو اس نے شمال اندلس کے عیسائی حکمران الفانسو پر ''ارک'' کے میدان جنگ میں حاصل کی۔ الفانسو اور امیر یعقوب کے درمیان پانچ سال کے بعد صلح کا ایک معاہدہ ہوگیا تھا لیکن الفانسو نے اس معاہدہ کو توڑ کر اسلامی علاقہ پر حملہ کر دیا۔ یعقوب کو جب اطلاع ہوئی تو مراکش سے اندلس پہنچا اور ارک کے مقام پر الفانسو کو ایسی زبردست شکست دی جیسی کہ سو سال پہلے یوسف بن تاشفین زلاقہ میں دے چکا تھا۔ اس کے بعد یعقوب نے الفانسو کے دارالحکومت طلیطلہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ شہر فتح ہونے کے قریب تھا کہ الفانسو نے اپنی بوڑھی ماں کو امیر یعقوب کے پاس بھیج کر معافی مانگی۔ یعقوب اپنے دشمن کی بوڑھی ماں کی درخواست رد نہ کر سکا اور دس سال کے لیے صلح کر کے واپس ہوگیا۔ اس طرح یعقوب المنصور کی رحم دلی کی وجہ سے طلیطلہ کا تاریخی شہر دوبارہ مسلمانوں کے قبضہ میں آنے سے رہ گیا۔

یعقوب کی زندگی عام بادشاہوں کی طرح نہیں تھی۔ وہ سادہ زندگی گزارتا تھا۔ معمولی کپڑے پہنتا تھا۔ پانچوں وقت کی نماز مسجد میں آ کر عام مسلمانوں کے ساتھ پڑھتا تھا۔ انصاف کا اتنا خیال تھا کہ ہر راہ چلتے فریادی کے لیے سواری روک لیتا۔ ایک مرتبہ دو شخص نصف درہم پر جھگڑا کرتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ منصور نے ان سے کہا کہ جب شہر میں قاضی موجود ہے تو یہ ذرا ذرا سے جھگڑے میرے سامنے کیوں لے کر آتے ہو۔ اس کے بعد اس نے دونوں کو تادیب کے طور پر ہلکی سی سزا دی۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شخص کتنی آسانی سے اس کے

پاس پہنچ سکتا تھا۔

اس کے عہد میں علماء فقہا اور محدثین کے وظیفے مقرر تھے۔ اس نے کئی سڑکیں تعمیر کرائیں اور جگہ جگہ سرائیں بنوائیں۔

ہر سال لاوارث یتیم بچوں کا ختنہ کرانا، پھر ان میں پیسے، روٹی، کپڑے اور پھل تقسیم کرنا، اسی طرح ضعیف عورتوں اور خانقاہ نشین لوگوں کو وظائف دینا اس کا معمول تھا۔

امیر یعقوب نے اپنی سلطنت میں مدرسے اور شفا خانے بھی قائم کیے۔ ان میں مراکش کا شفا خانہ بڑا شاندار تھا۔

یہ شفا خانہ ایک بہت بڑے میدان میں بنایا گیا تھا۔ عمارتیں بڑی مضبوط تھیں اور ان میں خوبصورت نقش و نگار تھے۔ کمروں کے فرش سیپ کے بنائے ہوئے تھے اور ان کے اوپر قالین بچھے رہتے تھے۔ شفا خانے کے میدان میں طرح طرح کے درخت تھے جن میں پھولوں اور پھلوں کے پیڑ بھی تھے۔ شفا خانے کے احاطے میں اس کثرت سے نہریں جاری کیں کہ ان کا پانی نالیوں کی شکل میں ہر مکان میں پہنچتا تھا۔ میدان کے بیچ میں چار حوض تھے جن میں ایک سفید سنگ مرمر کا تھا۔

اس شفا خانے میں مریضوں کو جو کھانا دیا جاتا تھا صرف اس کا خرچ تیس دینار (ایک سو پچاس روپے) روز تھا۔ دواؤں پر جو خرچ ہوتا تھا وہ اس کے علاوہ تھا۔ مختلف قسم کے شربت، روغن اور سرمے وغیرہ بنانے کے لیے عطار مقرر تھے۔ مریضوں کے لیے گرمیوں اور سردیوں کے زمانے میں دن اور رات کے استعمال کے لیے علیحدہ علیحدہ لباس ہوتے تھے جو شفا خانے کی طرف سے دیئے جاتے تھے۔ جب مریض تندرست ہو جاتا تو اگر وہ غریب ہوتا تو اسے روانگی کے وقت اس قدر مال و زر دیا جاتا کہ وہ تمام عمر چین سے بسر کرے۔ جب کوئی پردیسی مراکش آنے کے بعد کسی مرض میں مبتلا ہو جاتا تو اسے بھی اس شفا خانے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔

یعقوب المنصور ہر جمعہ کو نماز سے فارغ ہو کر شفا خانے کا خود معائنہ کرتا تھا۔ مریضوں سے مل کر ان کا حال معلوم کرتا تھا اور پوچھتا تھا کہ ان کی نگرانی کیسی ہو رہی ہے۔ یعقوب کا یہ معمول اس کی وفات کے دن تک جاری رہا۔

یعقوب کو عمارتیں بنانے کا بھی بڑا شوق تھا۔ اس کے عہد میں جیسی عمارتیں بنائی گئیں ان کی نظیر شمالی افریقہ کی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔ ان میں سب سے شاندار عمارت مراکش کی

جامع کتبیہ کی ہے۔ اس مسجد کا مینار ساڑھے تین سو فٹ اونچا ہے۔ اس مسجد کے چند سال بعد دہلی میں قطب مینار تعمیر کیا گیا لیکن کتبیہ کا یہ مینار قطب مینار سے بھی سو فٹ اونچا ہے۔ یہ مسجد اور اس کا مینار آج بھی موجود ہیں۔ یہ مسجد کتبیہ اس لیے کہلاتی ہے کہ اس کے نیچے کتابیں بیچنے والوں کی دوکانیں تھیں۔ اس زمانہ میں مراکش میں لکھنے پڑھنے کا شوق کتنا بڑھا ہوا تھا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ کتابوں کی ان دوکانوں کی تعداد ڈھائی سو تھی۔

یعقوب نے اشبیلیہ کی جامع مسجد میں بھی مینار کا اضافہ کیا۔ یہ مینار آج کل جیرالڈا کہلاتا ہے۔ اس کی بلندی بھی تقریباً تین سو فٹ ہے اور وہ دنیا کے خوبصورت ترین میناروں میں شمار ہوتا ہے۔

جامع کتبیہ کی ایک دلچسپ چیز مسجد کا مقصورہ تھا۔ معماروں نے یہ مقصورہ اس طرح بنایا تھا کہ منصور کے مسجد میں داخل ہوتے یہ نمودار ہو جاتا تھا اور جب وہ واپس چلا جاتا تو مقصورہ غائب ہو جاتا تھا اور مسجد کی دیوار پہلے کی طرح برابر ہو جاتی۔ یعقوب المنصور بھی عبدالمومن اور یوسف کی طرح علماء اور فضلاء کا بڑا قدردان تھا۔ چنانچہ ابن طفیل اور ابن رشد کا اس کے دربار سے بھی تعلق تھا۔ ان کے علاوہ اس دَور کا مشہور ادیب اور شاعر ابوبکر بن زہر بھی اس کے دربار سے وابستہ تھا۔

امیر یعقوب سلطان صلاح الدین کا ہمعصر تھا۔ اور اس زمانہ میں ساری دنیا میں سوائے سلطان صلاح الدین کے اور کوئی حکمران ان خوبیوں میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔

یہ اچھا حکمران ۵۹۵ھ میں پندرہ سال حکومت کرنے کے بعد اپنے خدا سے جاملا۔ اس وقت اس کی عمر صرف چالیس سال تھی۔

یعقوب المنصور کے بعد اس کا لڑکا الناصر تخت پر بیٹھا۔ اس کا عہد بھی بڑی خوشحالی کا زمانہ تھا لیکن اس کو ۶۰۹ھ میں اندلس میں العقاب کے مقام پر عیسائیوں کے مقابلہ میں ایسی شکست ہوئی کہ موحدین کا زور ٹوٹ گیا۔ اگلے سال الناصر کا انتقال ہوگیا اور اس کے بعد موحدین کا زوال شروع ہوگیا۔ ۱۲۳۷ء/ ۶۳۴ھ میں بلنسیہ پر اور ۱۲۴۸ء/ ۶۴۶ھ میں اشبیلیہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا۔ اندلس کا بڑا حصہ مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا۔ خود مراکش میں ۶۶۷ھ میں خاندان بنی مرین نے موحدین کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

مشہور مؤرخ ابن خلدون نے موحدین کے طرز حکومت کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''ان کی حکومت کا یہ انداز تھا کہ علماء کی عزت کی جاتی تھی اور تمام معاملات میں ان سے

مشورہ لے کر کام کیا جاتا تھا۔ دادخواہوں کی فریاد سنی جاتی تھی، رعایا پر حاکم ظلم کرتے تھے تو ان کو سزا دی جاتی تھی۔ ظالموں کا ہاتھ روک دیا گیا تھا۔ شاہی ایوانوں میں مسجدیں تعمیر کی گئی تھیں، تمام سرحدی نا کے جہاں یورپ کا ڈانڈا ملتا تھا فوجی طاقت سے مضبوط کر دیئے گئے تھے اور غزوات وفتوحات کو روز افزوں ترقی تھی۔"

مرابطین اور موحدین کی حکومتیں نسلاً عرب نہیں تھیں بلکہ بربر تھیں۔ اس لیے ہم اس دَور کو بربروں کا دَور کہہ سکتے ہیں۔ بربر باشندے اسلام سے قبل اپنی وحشت اور بہیمیت میں مشہور تھے اور ان کی اسی خصوصیت کی وجہ سے لفظ بربریت، وحشت اور ظلم کے ہم معنی ہو گیا تھا لیکن اسلام کے بعد ان بربروں نے جو تعمیری خدمات انجام دیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

بنی امیہ کے زوال کے بعد سے موحدین کے زوال تک دوسو سال کی مدت ہوتی ہے۔ یہ زمانہ اسلامی تاریخ میں بڑا اہم ہے۔ اس کی اہمیت ایک تو اس وجہ سے ہے کہ اندلس میں مسلمانوں کے عروج کا یہ آخری دَور تھا۔ اس کے بعد زوال شروع ہو گیا۔ اس کی اہمیت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں اندلس میں بڑی زبردست علمی ترقی ہوئی اور ایسے ایسے مصنف اور عالم پیدا ہوئے کہ جو بغداد اور نیشا پور وغیرہ کے بڑے بڑے علماء سے کسی طرح کم نہ تھے۔

علم وادب

ان میں ایک ابن حیانؒ تھے۔ یہ اندلس کے سب سے بڑے مؤرخ تھے۔ انہوں نے ساٹھ جلدوں میں اندلس کی تاریخ لکھی تھی۔ لیکن اب اصل تاریخ نہیں ملتی صرف اس کا خلاصہ ملتا ہے۔

اندلس کے سب سے بڑے مصنف ابن حزمؒ (۳۸۴ھ تا ۴۵۶ھ) ہیں۔ یہ مؤرخ، محدث اور فلسفی تھے۔ ابن حزم نے اس کثرت سے کتابیں لکھیں کہ سوائے طبری اور دو ایک اور مصنفوں کے اور کوئی مصنف ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ان کی کتابوں میں سب سے مشہور "الملل والنحل" ہے۔ اس میں انہوں نے ساری دنیا کے مذہبوں کا حال لکھا ہے اور بتایا ہے کہ کس مذہب میں کیا خرابی یا کیا خوبی ہے۔ ان سے پہلے کسی نے اس قسم کی کتاب نہیں لکھی تھی۔

عبدالملکؒ بن زہر متوفی ۵۵۷ھ اندلس کا سب سے بڑا طبیب اسی دَور میں ہوا ہے۔

عباسیوں کے حالات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ مسلمانوں میں سب سے بڑا طبیب رازی تھا۔ رازی کے بعد اسلامی دنیا میں جس طبیب کا درجہ ہے وہ ابن زہر ہے۔ عبدالملک بن زہر ایک ایسے خاندان سے تھا جس میں چھ پشت سے بڑے نامور طبیب اور ادیب ہوتے چلے آئے تھے۔ اس کا لڑکا ابوبکر (۵۰۷ھ تا ۵۹۵ھ) بھی ایک بڑا طبیب، ادیب اور شاعر ہوا ہے۔ وہ یعقوب المنصور کا طبیب خاص تھا۔ اس خاندان میں عورتیں بھی طبابت کرتی تھیں۔ چنانچہ ابوبکر کی بہن اور پھوپھی علم طب میں بڑی ماہر تھیں اور منصور کے گھر میں عورتوں کا علاج کرتی تھیں۔

ابن رشدؒ (۱۰۵۸ء/۵۱۴ھ تا ۱۱۲۶ء/۵۹۵ھ) اندلس کے سب سے بڑے فلسفی تھے۔ مشرق میں جس طرح فلسفہ میں ابن سینا نے شہرت حاصل کی اندلس میں ویسی ہی شہرت ابن رشد نے حاصل کی۔ موحدین کے زمانہ میں وہ قرطبہ کے قاضی تھے۔ بعد میں یورپ کی لاطینی زبان میں ان کی کتابوں کے ترجمے ہوئے اور یہ کتابیں تین سو سال تک یورپ کے مدرسوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔

ابن عربیؒ (۱۱۶۵ء/۵۶۰ھ تا ۱۲۴۰ء/۶۳۸ھ) بہت بڑے عالم دین اور صوفی تھے۔ ان کی لکھی ہوئی کتابوں میں فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ آج بھی بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ وہ اگرچہ اندلس میں پیدا ہوئے تھے لیکن عمر کا بڑا حصہ مصر و شام میں گزرا اور وہیں انتقال ہوا۔

ادریسیؒ (۱۱۰۰ء/۴۹۳ھ تا ۱۱۶۶ء/۵۶۰ھ) اندلس کے سب سے بڑے جغرافیہ دان تھے۔ بعض لوگ ان کو سب سے بڑا مسلمان جغرافیہ دان سمجھتے ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی جغرافیہ کی کتاب سے ساری دنیا اور خاص طور پر اسلامی دنیا کے بڑے دلچسپ حالات معلوم ہوتے ہیں۔ یورپ والوں کو افریقہ کے متعلق بہت سی معلومات کا علم پہلی مرتبہ ادریسی کے جغرافیہ ہی سے ہوا۔

مراکش

قاہرہ، بغداد، غزنی اور مشرق کے دوسرے بڑے شہروں کا حال ہم پچھلے صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ موحدین کے زمانہ میں مغرب کے علاقہ میں بھی دو شہر اتنی ترقی کر گئے تھے کہ وہ اپنی وسعت، آبادی کی کثرت، رونق، علم و فن اور صنعت و حرفت میں مشرق کے بڑے شہروں کا مقابلہ کرتے تھے۔ یہ دونوں شہر جن میں ایک مراکش اور دوسرا فاس تھا، مسلمانوں ہی نے آباد کیے تھے

اور موحدین کے زمانہ میں عروج پر پہنچے۔ مراکش ۱۰۷۲ء/ ۴۶۵ھ میں آباد ہوا تھا۔ اور آبادی کے لحاظ سے افریقہ میں سلطنت موحدین کا سب سے بڑا شہر تھا۔ یہاں ملک ملک کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر لکھتا ہے:

''مراکش میں ساری دنیا کے لوگ ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت سے قبل کبھی لوگوں کا اتنا بڑا اجتماع بھی ہو سکتا ہے۔''

اس طرح ایک مؤرخ لکھتا ہے کہ:

''موحدین کے زمانہ میں مراکش میں اس کثرت سے پانی لایا گیا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں لایا گیا تھا اور ایسے محل بنائے گئے کہ ان سے پہلے کسی اور بادشاہ کے زمانہ میں تعمیر نہیں ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مراکش انتہائی خوبصورت شہر بن گیا۔''

مراکش کی پشت پر کوہ اطلس کی برف پوش چوٹیاں اور سامنے کھجوروں کے نخلستان شہر کے حُسن کو دوبالا کرتے تھے۔ جامع کتبیہ شہر کی ناک تھی اور اب بھی ہے۔ اس کے بلند مینار سے پچاس پچاس میل تک زمین نظر آتی تھی۔ مینار کی چوٹی پر سونے کے تین گنبد تھے اور مسجد کے نیچے کتابوں کی دو سو دوکانیں تھیں جس کی وجہ سے مسجد کتبیہ یعنی کتابوں والی مسجد کہلاتی تھی۔

فاس

فاس کا شہر شمال مغرب افریقہ میں علم کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس کے علاوہ یہ شہر صنعت و حرفت کے لحاظ سے بھی ممتاز تھا۔ عہد موحدین کا ایک مؤرخ لکھتا ہے:

''فاس کو مغرب کا بغداد کہا جاتا ہے۔ یہاں کے باشندے نہایت عقلمند اور عالی ظرف ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ دنیا میں کوئی شہر فاس جیسا ہو گا جہاں سامان آسائش اور اسباب زندگی اس کثرت سے ہوں۔ شہر کے اطراف سرسبز ہیں، پانی اور درخت اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور گرد و نواح میں ندیاں اور نہریں جاری ہیں۔ شہر میں پانی سے چلنے والی تین سو چکیاں ہیں۔ یہاں سوائے عود ہندی کے اور کسی چیز کو باہر سے لا کر استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور فاس کو اپنی ضرورت کے لیے کسی اور شہر کا دست نگر نہیں ہونا پڑتا۔''

فاس کا شہر ۸۰۸ء/ ۱۹۲ھ میں آباد ہوا تھا۔ اور آج بھی المغرب یا ملک مراکش کا سب

سے بڑا علمی اور ذہنی مرکز ہے۔ شمالی افریقہ کی سب سے بڑی مسجد جامع قروئین اسی شہر میں ہے۔ مسجد کی بنیاد تو ادریسی دَور میں پڑ گئی تھی لیکن موجودہ عمارت کا بیشتر حصہ گیارہویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ مسجد قاہرہ کی جامع ازہر کی طرح ایک تعلیمی درس گاہ بھی ہے بلکہ ازہر کے بعد اسلامی دنیا کا سب سے قدیم درس گاہ سمجھی جاتی ہے اور شمالی اور مغربی افریقہ میں آج بھی دینی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

خاندان مرابطین کی حکومت

(۱۰۶۱ء/۴۵۳ھ تا ۱۱۴۷ء/۵۴۱ھ)

۱۔ یوسف بن تاشفین	۱۰۶۱ء/۴۵۳ھ تا ۱۱۰۷ء/۵۰۰ھ
۲۔ علی بن یوسف تاشفین	۱۱۰۷ء/۵۰۰ھ تا ۱۱۴۳ء/۵۳۷ھ
۳۔ تاشفین بن علی	۱۱۴۳ء/۵۳۷ھ تا ۱۱۴۷ء/۵۴۱ھ

خلافت موحدین

(۱۱۳۰ء/ ۵۲۴ھ تا ۱۲۶۹ء/۶۶۷ھ)

۱۔ عبدالمومن	۱۱۳۰ء/۵۲۴ھ تا ۱۱۶۳ء/۵۵۸ھ
۲۔ یوسف	۱۱۶۳ء/۵۵۸ھ تا ۱۱۸۴ء/۵۸۰ھ
۳۔ یعقوب المنصور	۱۱۸۴ء/۵۸۰ھ تا ۱۱۹۹ء/۵۹۵ھ
۴۔ محمد الناصر	۱۱۹۹ء/۵۹۵ھ تا ۱۲۱۴ء/۶۱۱ھ
۵۔ یوسف مستنصر	۱۲۱۴ء/۶۱۱ھ تا ۱۲۲۳ء/۶۲۰ھ

اس کے بعد موحدین کا زوال شروع ہو گیا۔

زلاقہ کی جنگ	۱۰۸۶ء/۴۷۹ھ
لارک کی جنگ	۱۱۹۵ء/۵۹۱ھ
العقاب کی جنگ	۱۲۱۲ء/۶۰۹ھ
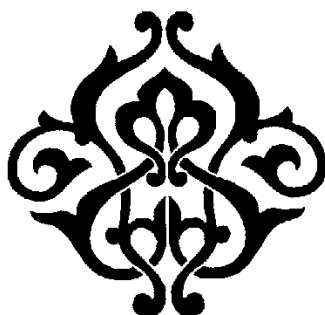
باب ۲۰

اندلس کا المیہ۔ایک تہذیب کا خاتمہ

موحدین کے بعد اندلس میں مسلمانوں کا پوری طرح زوال شروع ہوگیا۔شمال میں قشتالہ کی مسیحی حکومت جس نے مرابطین اور موحدین سے سخت لڑائیاں کی تھیں اب اور زیادہ طاقتور ہوگئی۔مسلمان جم کر اس حکومت کا مقابلہ نہ کر سکے اور قرطبہ، اشبیلیہ اور بلنسیہ جیسے عظیم شہر جو اندلس میں اسلامی تہذیب وتمدن کے سب سے بڑے مرکز تھے یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے۔اب مسلمانوں کی حکومت ملک کے جنوب مشرقی کونے میں چھوٹے سے علاقے میں محدود ہوکر رہ گئی جس کا رقبہ سات ہزار مربع میل سے زیادہ نہ تھا۔غرناطہ اس حکومت کا صدر مقام تھا اور مالقہ اور المریہ اس کے بڑے بندرگاہ تھے۔

غرناطہ کی یہ حکومت جسے بنو احمر (۱۲۳۸ء/۶۳۶ھ تا ۱۴۹۲ء/۸۹۸ھ) کی حکومت بھی کہتے ہیں اگرچہ قشتالہ کی حکومت کے مقابلے میں بہت چھوٹی تھی لیکن اس کے باوجود وہ ڈھائی سو سال تک دشمنوں کا بڑی کامیابی سے مقابلہ کرتی رہی اور اندلس کے مسلمانوں کے لیے ایک پناہ گاہ بن گئی۔غرناطہ کی حکومت اگرچہ بہت چھوٹی تھی لیکن اس کا یہ کارنامہ قابل فخر ہے کہ اس نے مسلمانوں اور اسلامی تہذیب کو یورپ کے متعصب، ظالم اور وحشی دشمنوں کے ہاتھوں ڈھائی سو سال تک تباہ ہونے سے بچائے رکھا۔

مسلمان اندلس کے مسیحی علاقوں سے نکل کر غرناطہ میں آباد ہونے لگے جس کی وجہ سے غرناطہ اور دوسرے شہر بہت جلد علم وفن اور صنعت وحرفت کے مرکز بن گئے۔غرناطہ کی آبادی اس زمانہ میں چار لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔اس کے علوم وفنون اور صنعت وحرفت کی دُور دُور تک شہرت ہوگئی تھی اور وہاں کا مالِ تجارت یورپ اور اسلامی دُنیا کے تقریباً ہر حصہ تک جاتا تھا۔

فن تعمیر میں سلاطین غرناطہ اور غرناطہ کے کاریگروں کی سب سے شاندار یادگار الحمرا کے محل ہیں۔یہ محل اور اس کے باغ جو جنت العارف کہلاتے ہیں اندلسی مسلمانوں کے فن تعمیر کا بہترین

نمونہ ہیں۔ بھارت کی قدیم عمارتوں میں جو حیثیت تاج محل کو حاصل ہے بالکل وہی حیثیت اندلس میں الحمرا کو حاصل ہے اور اس کو دیکھنے کے لیے آج بھی ساری دنیا سے سیاح غرناطہ آتے ہیں اور اس کو بنانے والے معماروں اور کاریگروں کی تعریفیں کرتے ہوئے واپس جاتے ہیں۔

پندرہویں صدی میں غرناطہ کے شاہی خاندان کے لوگ آپس میں لڑنے لگے جس سے مسلمانوں کی قوت کمزور ہوگئی اور عیسائیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔

ابوعبداللہ یہاں کا آخری بادشاہ ہوا ہے۔اس کے زمانہ میں قسطالہ کی عیسائی حکومت نے بڑا زور پکڑا اور شہر غرناطہ کا محاصرہ کرلیا۔ جب محاصرہ کو مہینہ بھر گزر گیا اور شہر کے لوگوں کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ رہا تو ابوعبداللہ نے عیسائیوں کی اطاعت قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ بادشاہ کا یہ فیصلہ دیکھ کر غرناطہ کی فوج کے سپہ سالار موسیٰ نے اس فیصلے کی مخالفت کی اور کہا:

''ہمارا اطاعت کرنا بڑی ذلت کی بات ہے۔ہمیں دشمن کا مقابلہ جاری رکھنا چاہیے۔اگر ہمیں کامیابی نہیں ہوتی تو ہم میدان جنگ میں عزت کی موت تو مر سکتے ہیں۔''

لیکن ابوعبداللہ نے اپنے سپہ سالار کا کہنا نہ مانا اور عیسائی بادشاہ فرینڈ کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔موسیٰ نے جب یہ دیکھا تو وہ تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکلا۔ دشمنوں پر حملہ آور ہوا اور بہت سے سپاہیوں کو قتل کیا اور جب زخموں سے چور ہوگیا تو دریا میں کود پڑا اور پانی میں غرق ہوگیا۔عیسائی اس کی لاش پر بھی قبضہ نہیں کرسکے۔اس کی اس ہمت اور بہادری کی وجہ سے موسیٰ کا نام تاریخ میں غیر فانی ہوگیا اور لوگ آج تک اس کا نام عزت اور احترام سے لیتے ہیں۔

ابوعبداللہ نے اس کے بعد شہر کو عیسائی حکومت کے سپرد کردیا اور خود مراکش چلا گیا۔جب وہ غرناطہ سے چند میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی پر پہنچا تو غرناطہ کے شہر پر جو کئی سو سال تک مسلمانوں کے قبضہ میں رہا حسرت بھری نظر ڈالی اور رونے لگا۔ابوعبداللہ کی ماں ساتھ تھی۔ اس نے جب اپنے بیٹے کو روتے دیکھا تو کہا:

''جب تم مردوں کی طرح اپنے شہر کو نہ بچا سکے تو عورتوں کی طرح رونے سے کیا حاصل۔''

یہ واقعہ ۱۴۹۲ء/۸۹۸ھ کا ہے۔اس کے بعد اندلس پر مسلمانوں کی حکومت کبھی قائم نہ ہوئی۔

اسلامی اندلس کے اس آخری دور میں غرناطہ میں کئی اہل علم اور مصنف پیدا ہوئے۔ ان

میں سب سے زیادہ مشہور لسان الدین ابن خطیب (۱۳۱۳ء تا ۱۳۷۴ء) ہیں۔ وہ کئی سال تک غرناطہ کے وزیر اعظم بھی رہے۔ وہ ایک بڑے مدبر، مؤرخ اور شاعر تھے۔ خطیب نے اپنی زندگی میں ساٹھ کتابیں لکھیں جو ادب، شاعری، تاریخ، جغرافیہ، طب اور فلسفہ پر ہیں۔ ان کی سب سے مشہور کتاب ''الاحاطہ فی اخبار غرناطہ'' ہے۔ یہ کئی جلدوں میں ہے اور غرناطہ کی سب سے مکمل اور مفصل تاریخ ہے۔ اس میں ان تمام علماء اور مشہور لوگوں کے حالات کا اندراج ہے۔

اندلس سے مسلمانوں کا اخراج

عیسائیوں نے اندلس پر قبضہ پانے کے بعد مسلمانوں پر بڑے ظلم کیے۔ عربی زبان پڑھنا اور بولنا جرم قرار دے دیا گیا۔ لوگوں کو عیسائی مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ ہزاروں مسلمانوں کو جنہوں نے عیسائیت قبول نہیں کی قتل کر دیا گیا یا زندہ جلا دیا گیا۔ کئی لاکھ مسلمان ملک سے نکال دیئے گئے یا ہجرت کر گئے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ جلاوطن ہونے والے مسلمانوں کی تعداد تیس لاکھ تھی۔ باقی آبادی نے جان کے خوف سے عیسائی مذہب قبول کرلیا۔ اندلس میں جہاں آٹھ سو سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی تھی ۱۶۱۰ء کے بعد ایک مسلمان بھی باقی نہیں۔ اور آج وہاں مسلمانوں کے عہد حکومت کی یادگار ان کی بنائی ہوئی چند عمارتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اندلس میں مسلمانوں کے خاتمہ کی داستان بڑی دردناک ہے۔ اس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

مزید مطالعہ کے لیے کتابیں

۱۔ تاریخ اندلس اول از ریاست علی ندوی (اعظم گڑھ) اس میں صرف عبدالرحمن اوسط تک کی تاریخ ہے۔اس کا دوسرا حصہ مکمل نہ ہوسکا۔

۲۔ مسلمان اندلس میں از رشید اختر ندوی۔

۳۔ تاریخ اسلام حصہ سوم از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

۴۔ اندلس کا تاریخی جغرافیہ از محمد عنایت اللہ دہلوی (جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، دکن)۔اندلس کی معاشی تاریخ، صنعت و حرفت، زراعت، تعمیرات اور شہروں کے حالات پر اس سے بہتر کتاب شاید کسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

۵۔ نفح الطیب۔ یہ علامہ المقری کی کتاب کا اردو خلاصہ ہے۔اگرچہ اب نایاب ہے لیکن اندلس کی آٹھ سو سالہ تاریخ پر انتہائی جامع اور دلچسپ کتاب ہے۔

باب ۲۱

یورپ کے اُستاد

اُندلس کی سرزمین سے اگرچہ مسلمانوں کا نام ونشان مٹادیا گیا اور آج وہاں خدا اور اس کے رسولﷺ کا نام لینے والا کوئی نہیں لیکن مسلمانوں نے اپنے آٹھ سو سال کے دَورِ حکومت میں وہاں ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ اندلس کی دو ہزار برس کی تاریخ میں وہاں کئی قوموں نے حکومت کی۔ سب سے پہلے قرطاجنہ والوں کی حکومت قائم ہوئی۔ اس کے بعد کئی سو سال تک رومیوں نے ڈنکا بجایا پھر قوطی یا گوتھ باشندوں کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ آئی۔ اس کے بعد مسلمان آئے اور ان کے جانے کے بعد وہیں کے قدیم مسیحی باشندوں نے اپنی حکومت قائم کی جو اب تک ہے۔ ان تمام قوموں نے باری باری ملک کی خدمت کی اور بہت سے کارنامے انجام دیئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کسی قوم کے کارنامے اسلامی دَور کے کارناموں سے زیادہ شاندار نہیں اور کسی زمانہ میں اندلس کو وہ خوشحالی حاصل نہیں ہوئی جو اسلامی دَور میں حاصل ہوئی۔ پوری تاریخ میں صرف اسلامی عہد ہی ایسا ہے کہ جب اندلس کے لوگوں نے دنیا کی رہنمائی اور امامت کی اور صرف یہی وہ دَور ہے جس میں اندلس والوں نے یورپ میں علم وفن کی روشنی پھیلائی۔ اندلس کی تاریخ کے کسی دَور کو اگر ہم عہد زریں کہہ سکتے ہیں تو وہ صرف ''اسلامی دَور'' ہے۔

اندلس اگرچہ چھوٹا سا ملک تھا لیکن جہاں تک علم وفن اور تہذیب وتمدن کا تعلق ہے یہ ملک اسلامی دَور میں دنیا کے کسی ملک سے پیچھے نہیں تھا۔ یہاں کے علمائے دین میں ابن حزم، ابن عبدالبر اور ابن عربی، فلسفیوں میں ابن طفیل اور ابن رشد، طبیبوں میں زہراوی اور ابن زہر اور ادیبوں اور مورخوں میں ابن عبدربہ اور خطیب اور شاعروں میں ابن زیدون اور ابن عمار نہ صرف اسلامی دنیا کے عظیم ترین عالموں، فلسفیوں، طبیبوں، ادیبوں، مؤرخوں اور شاعروں میں سے ہیں بلکہ اسلامی تاریخ میں سوائے عراق اور ماوراء النہر کے کسی اور ملک نے جو اندلس کی طرح چھوٹا ہو

اتنی کثرت سے علم وفن کے ماہرین پیدا نہیں کیے۔ دنیا کے باقی دوسرے ملکوں میں بھی اس کی کم مثالیں ملیں گی۔

دنیا میں ہوائی جہاز بنانے کی سب سے پہلی کوشش اسلامی اندلس کے ایک سائنسدان عباسؔ ابن فرناس نے کی۔ اس کا ہوائی جہاز تھوڑی بلندی تک اُڑا بھی تھا، مگر گر گیا۔ ابن فرناس بڑا ذہین سائنس دان تھا۔ اس نے اپنے گھر میں ایک مصنوعی آسمان بھی بنایا تھا جس میں سورج، چاند اور ستارے بنائے گئے تھے۔ اس نے پتھر سے شیشہ تیار کرنے کی صنعت ایجاد کی اور سایہ کی مدد کے بغیر وقت معلوم کرنے کے لیے ایک آلہ بھی ایجاد کیا تھا۔

اسی طرح موحدین کے زمانہ میں اشبیلیہ کے ایک ماہر زراعت ابن عوام نے زراعت کو ترقی دینے، قلمیں لگانے اور زمین کو کاشت کے لیے بہتر بنانے کے ایسے ایسے طریقے اپنی کتاب میں لکھے ہیں جن کا دنیا کو اب جا کر علم ہوا ہے۔

اسلامی اندلس کے باشندوں نے پہلی مرتبہ چاول، زعفران، نارنگی، لیموں، انگور، خربوزہ، کیلے اور زرد گلاب، چنبیلی، روئی اور گنّے کی کاشت اندلس میں کی۔ اس وقت تک یہ چیزیں اندلس یا یورپ میں پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ ان چیزوں کی کاشت کرنا یورپ کے ملکوں نے اندلس ہی سے سیکھا۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ آج کل مسلمانوں کے مقابلے میں یورپ اور امریکہ کی قومیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ان کے پاس مال و دولت بھی زیادہ ہے۔ علم بھی زیادہ ہے۔ ان کے شہر بھی ہمارے شہروں کے مقابلے میں بڑے خوبصورت ہیں اور ان کی عمارتیں اور ان عمارتوں کا ساز و سامان بڑا نفیس ہوتا ہے لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کے عروج کے زمانہ میں یہ معاملہ الٹا تھا۔ مسلمانوں کے پاس علم تھا، دولت تھی، ان کے پاس بڑے بڑے اور خوبصورت شہر تھے۔ وہ پاک اور صاف ستھرے رہتے تھے۔ اس کے برخلاف یورپ والے جاہل تھے، مفلس اور غریب تھے اور جس طرح آج مسلمان انگریزی زبان کے ذریعے اپنا علم اور اپنی معلومات بڑھانے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ اور امریکہ جاتے ہیں اسی طرح مسلمانوں کے عروج کے زمانہ میں یورپ کے عیسائی علم پڑھنے کے لیے عربی زبان سیکھتے تھے اور اسلامی ملکوں میں آ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اندلس کا ملک چونکہ یورپ کے دوسرے ملکوں کے قریب تھا اس لیے انہوں

نے سب سے زیادہ فائدہ اندلس کے علماء اور مدرسوں اور کتب خانوں سے اٹھایا۔

ایک مسلمان مؤرخ قزدینی لکھتا ہے:

''ڈنمارک کے لوگ بالکل وحشی ہیں۔ ننگے رہتے ہیں اور چمڑے کے ٹکڑوں سے ستر پوشی کرتے ہیں۔''

ان ملکوں کو چھوڑ کر جو اسلامی دنیا سے ملے ہوئے تھے شمال کے بیشتر ملکوں کا یہی حال تھا۔ پیرس اور لندن میں لکڑی اور بانس کے گھر بنائے جاتے تھے جن کو مٹی اور بھوسے سے لیپ دیا جاتا تھا۔ لوگ بستر سے ناواقف تھے۔ بھوسا اور پیال بستر کا کام دیتا تھا۔ جانوروں کی اوجھڑی، آنتیں اور کوڑا کرکٹ گھروں کے سامنے لا کر ڈال دیتے تھے۔

جب لوگوں کے تہذیب وتمدن کی یہ حالت ہو تو ظاہر ہے کہ علم سے ان کو دُور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا چنانچہ شمالی یورپ کے لوگوں کے متعلق تو مسلمانوں میں یہ خیال عام تھا کہ وہ لوگ فطری طور پر بے وقوف ہیں اور سردی کی شدت نے ان کی عقل زائل کر دی ہے۔

اندلس کے دو مشہور عالموں ابن ساعدؒ اور ابن خلدونؒ نے اس قسم کا خیال ظاہر کیا ہے۔

ابن ساعد لکھتے ہیں:

''جو قومیں مثلاً صقالیہ اور بلغار وغیرہ جو انتہائی شمال میں آباد ہیں جہاں سورج سے دُوری کی وجہ سے ہوا میں ٹھنڈک اور فضا میں کثافت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے مزاج سرد اور دماغ گٹھل ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بدن موٹے ہو گئے رنگ سفید ہو گیا اور بال لٹک گئے۔ چنانچہ یہ قومیں باریک بینی اور ذہن کی تیزی سے محروم رہیں اور جہالت اور حماقت ان پر غالب ہو گئی ہے اور یہ لوگ انسانوں سے زیادہ جانوروں سے مشابہ ہیں۔''

یہ بالکل ایسا ہی خیال ہے جیسا کہ آج کل یورپ کے عروج کی وجہ سے لوگوں میں عام ہو گیا ہے کہ ایشیا کے لوگ گرم ملک کے رہنے والے ہیں اس لیے سُست اور کاہل ہوتے ہیں اور ان کے دماغ یورپ والوں کی طرح کام نہیں کرتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب خیال غلط ہیں۔ یورپ کی ترقی نے ابن ساعد اور ابن خلدون کا خیال غلط ثابت کر دیا اور مسلمانوں اور ایشیا کی قوموں کا پچھلا عروج اس بات کا ثبوت ہے کہ یورپ والوں کا بھی ایشیا والوں کے متعلق اس قسم کا خیال قائم کرنا غلط ہے۔ ہر قوم کی ترقی کا ایک زمانہ ہوتا ہے اور جب کسی قوم کا اقبال ہوتا ہے تو نہ

سردی اس کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے اور نہ گرمی۔

قرطبہ کا شہر یورپ والوں کے لیے اس زمانہ میں ایسا ہی تھا جیسا اسلامی ملکوں کے باشندوں کے لیے آج کل یورپ کے ملک اور نیویارک وغیرہ ہیں۔ قرطبہ کی آبادی اپنے عروج کے زمانہ میں پندرہ لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ شہر ۲۴ میل لمبا اور ۷ میل چوڑا تھا اور دریائے وادی الکبیر کے کنارے کنارے چلا گیا تھا۔ اس شہر میں دو لاکھ عام مکان تھے اور ساٹھ ہزار محل، کوٹھیاں اور بڑے مکان۔ اسی ہزار دوکانیں، تین ہزار آٹھ سو مسجدیں اور سات سو حمام تھے۔ پرانے زمانے میں اتنا بڑا شہر بڑی عجیب وغریب چیز سمجھی جاتی تھی۔ شہر کی سڑکیں پختہ تھیں۔ گندے پانی کے نکاس کے لیے زمین دوز نالیاں تھیں۔ چوراہوں پر فوارے لگے ہوئے تھے۔ رات کے وقت راستوں پر روشنی ہوتی تھی۔ مکانوں اور سڑکوں کی روشنی کی کثرت کی وجہ سے راتوں کو لوگ دس دس پندرہ پندرہ میل تک راستہ چلتے تھے۔

ایک مؤرخ لکھتا ہے کہ:

''قرطبہ آبادیوں کا سرتاج، ہر دل کا مقصود، اہل فضل وتقویٰ کا مسکن، علوم کا سرچشمہ اور اسلام کا گھر ہے۔ دنیا بھر کی عقلیں سمٹ کر یہاں جمع ہوگئی ہیں۔ اس کے افق سے دنیا کے تارے نکلے ہیں۔ مشاہیر روزگار پیدا ہوئے اور نظم ونثر کے شہسواروں کے گھوڑے دوڑے اور اعلیٰ درجے کی کتابیں یہیں لکھی گئیں۔''

اہل قرطبہ بڑے خلیق اور شائستہ ہوتے تھے۔ لباس کی خوشنمائی، دینداری اور نماز کی پابندی میں مشہور تھے۔ وہ جہاں کہیں شراب کے برتن دیکھتے ان کو توڑ ڈالتے تھے۔ سپاہیانہ علوم وفنون میں ان کو فخر تھا۔

پوری دنیا میں سوائے بغداد کے کوئی شہر قرطبہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ قرطبہ تو قرطبہ تھا یورپ میں کوئی شہر اشبیلیہ، بلنسیہ، غرناطہ اور سرقطہ کے برابر بھی نہیں تھا۔ اس زمانہ کے لندن اور پیرس ذرا ذرا سے شہر تھے۔ ان کی سڑکیں کچی ہوتی تھیں۔ گندہ پانی سڑکوں پر بہتا پھرتا تھا۔ مکانات گھاس پھوس کے تھے۔ لوگ کھڑکیوں میں شیشے کی جگہ کاغذ تیل میں ڈبو کر لگا لیتے تھے کہ شفاف ہوجائے۔

اس زمانہ میں یورپ میں سوائے پادریوں اور چند امراء کے کوئی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا لیکن اندلس کا ہر مسلمان لکھا پڑھا ہوتا تھا۔ فرانس کے بادشاہ کے کتب خانہ میں صرف چھ

سات سو کتابیں تھیں۔ اس کے برخلاف قرطبہ میں بے شمار لوگوں کے پاس ذاتی کتب خانے تھے جن میں ہزاروں کتابیں تھیں اور شاہی کتب خانے میں تو چار لاکھ کتابیں تھیں۔ گھر میں ذاتی کتب خانے رکھنا اور کتابیں جمع کرنا اس زمانہ میں ایک قسم کا فیشن بن گیا تھا اور ہر دولت مند خواہ وہ کتابوں کو پڑھ اور سمجھ سکتا ہو یا نہیں اپنے گھر میں کتب خانہ ضرور رکھتا تھا تاکہ لوگ جب اس کا ذکر کریں تو فخر یہ کہہ سکیں کہ اس کے کتب خانے میں وہ کتاب ہے جو کسی دوسرے کے پاس نہیں۔

ایک مرتبہ قرطبہ کے ایک باشندے حضرمی کو ایک کتاب کی شدید ضرورت تھی۔ اس نے اس کی تلاش میں کتابوں کے بازاروں کو چھان مارا اور آخرکار ایک دن یہ کتاب ملی لیکن اس کا ایک گاہک پہلے سے موجود تھا جو اس وقت حاضر نہیں تھا۔ حضرمی نے اس کتاب کے لیے دام بڑھا کر بول دیئے لیکن پہلے خریدار نے اور بولی بڑھا دی۔ اسی طرح دونوں طرف سے کتاب کی قیمت روز بڑھتی رہی۔ بالآخر حضرمی نے تنگ آکر دوکاندار سے کہا کہ مجھے تم دوسرے خریدار سے ملا دو۔ ممکن ہے کہ ہم دونوں میں سمجھوتہ ہو جائے۔ دوکاندار اسے اس شخص کے پاس لے آیا۔ یہ ایک مالدار شخص تھا۔ حضرمی سمجھا کہ وہ کوئی بڑا عالم ہے اس لیے اس کو فقیہہ یعنی مولوی صاحب کہہ کر گفتگو کی۔ اس پر اس شخص نے کہا:

''میں کوئی عالم نہیں ہوں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کتاب کے اندر کیا ہے۔ میں نے تو صرف اس کا خط دیکھا اور کتاب کی خوبصورتی دیکھ کر متاثر ہوا ہوں۔ میں نے ایک کتب خانہ بنایا ہے۔ اس میں اچھی اچھی کتابیں جمع کی ہیں تاکہ اپنے ساتھیوں میں اس کی وجہ سے عزت اور شہرت پاؤں۔ اس لیے آپ زیادہ قیمت نہ بڑھائیں۔ میرے پاس اتنی دولت ہے کہ ہر قیمت پر کتاب کو خرید سکتا ہوں۔''

اس جگہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس زمانہ میں آج کل کی طرح چھاپے خانے نہیں تھے۔ لوگوں کو ہاتھ سے کتابیں لکھنا پڑتی تھیں۔ لیکن علم کے شوق نے ان تمام مشکلوں پر قابو پالیا تھا اور کتابوں کا کاروبار باقی اسلامی دنیا کی طرح اندلس میں بھی اتنا ترقی کر گیا تھا کہ ہزاروں لوگوں کی روزی کتابوں کے لکھنے اور بیچنے پر منحصر تھی۔ کہتے ہیں کہ صرف قرطبہ میں بیس ہزار لوگ کتابوں کا کاروبار کرتے تھے۔

کتابوں کے لیے کاغذ ایک ضروری چیز ہے۔اس زمانہ میں سوائے چین اور اسلامی دنیا کے اور کسی ملک کے لوگ کاغذ بنانا نہیں جانتے تھے۔اندلس میں بحیرۂ روم کے کنارے بندرگاہ بلنسیہ کے قریب شہر ''شاطبہ'' کاغذ سازی کا مرکز تھا۔ یہاں کے کارخانوں کا بنا ہوا کاغذ اندلس اور سارے یورپ کو جاتا تھا۔ بعد میں یورپ والوں نے اس جگہ سے کاغذ بنانا سیکھا۔فرانس میں سب سے پہلے ۱۱۸۷ء میں، جرمنی میں ۱۳۲۰ء میں اور انگلستان میں ۱۴۹۴ء میں کاغذ بنانے کی صنعت شروع ہوئی۔ایک امریکی مصنف لکھتا ہے:

''اس زمانہ میں قرطبہ یورپ کا علمی مرکز تھا۔مسیحی یورپ کے اہلِ علم تعلیم حاصل کرنے اور تحقیق کرنے کے لیے اسلامی اندلس کا رُخ کرتے تھے اور بالآخر انہی لوگوں کے ذریعے عربوں کے بہت سے علوم فرانس اور اٹلی پہنچ گئے۔''

(تہذیب کا ماضی اور حال ۴۱۹)

یورپ کے جن مشہور لوگوں نے اندلس آ کر علم حاصل کیا ان میں پاپائے روما پوپ سلویسٹر دوم (۹۴۰۔۱۰۰۳) بھی ہیں۔ وہ فرانس کے رہنے والے تھے۔ بڑے ہو کر اندلس میں تعلیم حاصل کی۔سائنس، ریاضی اور موسیقی پر کئی کتابیں لکھیں۔ بالآخر ۹۹۹ء میں ''پاپائے روم'' منتخب ہوئے۔ہند سے، صفر اور عشاریہ کا استعمال سیکھ کر انہوں نے یورپ میں ان چیزوں کو رواج دیا۔جب یہ یورپ واپس پہنچے تو اسطرلاب اور ریاضی کے استعمال میں غیر معمولی صلاحیت دیکھ کر لوگ یہ کہنے لگے کہ انہوں نے یہ چیزیں شیطان سے سیکھی ہیں۔

مسلمانوں کے عہد عروج میں یورپ کے لوگ کچھ تو اپنی جہالت کی وجہ سے اور کچھ تعصب کی وجہ سے علم حاصل کرنے کے لیے زیادہ تعداد میں اندلس نہیں آتے تھے لیکن جب آہستہ آہستہ ان پر مسلمانوں کا اثر پڑا اور ان میں علم کی قدر پیدا ہوئی اور ۱۰۸۵ء میں شہر طلیطلہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا تو یورپ کے ہر حصہ سے اہل علم طلیطلہ آنے لگے اور یہاں کی عربی کتابوں سے فائدہ اٹھانے لگے۔

ایک یورپی مؤرخ لکھتا ہے:

''قسطالہ اور لیون کے مسیحی حکمران الفانسو ششم (۱۰۶۵۔۱۱۰۹) کا دربار اسلامی تہذیب کا

اسی طرح مرکز بن گیا تھا جس طرح دو سو سال بعد پلر مو میں فریڈرک [1] دوم کا دربار اسلامی تہذیب کا مرکز بنا۔ اس کے زمانہ میں طلیطلہ کی درس گاہوں میں یورپ کے ہر حصہ سے حتیٰ کہ انگلستان اور اسکاٹ لینڈ سے اہل علم کھنچ کھنچ کر چلے آتے تھے۔"

مسلمانوں کے علوم کی سرپرستی کرنے میں قشتالہ کا ایک دوسرا حکمران الفانسو دوم (۱۲۵۲ء۔ ۱۲۸۴ء) سب سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے زمانہ میں بکثرت کتابوں کا عربی سے ہسپانوی اور لاطینی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور عربی کتابوں کی مدد سے لاطینی زبانوں میں مستقل کتابیں لکھیں گئیں۔

مسلمانوں کے اس اثر کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۲۳۰ء میں اندلس کے شہر سلامنکہ میں عیسائیوں نے ایک یونیورسٹی قائم کی جو مسیحی یورپ کی پہلی یونیورسٹی سمجھی جاتی ہے۔

طلیطلہ میں ترجمہ کا کام پورے دو سو سال تک جاری رہا۔ ترجمہ کرنے کی غرض سے یورپ کے ہر حصہ سے اہل علم اس شہر میں آتے تھے اور عربی سے لاطینی زبان میں جو اس وقت یورپ کی علمی زبان تھی ترجمہ کرتے تھے۔ ان میں حسب ذیل مترجم بہت مشہور ہوئے ہیں۔

---

(۱) اندلس کی طرح جزیرہ صقلیہ یعنی سسلی بھی یورپ میں مسلمانوں کی تہذیب کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اس جزیرہ پر مسلمانوں نے تقریباً ڈھائی سو سال تک (۸۳۱ء/۲۱۶ھ تا ۱۰۹۰ء/۴۸۳ھ) حکومت کی۔ شمالی یورپ کی ایک قوم نے جو نارمن کہلاتی تھی اس جزیرہ سے مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ نارمنوں نے اگرچہ اس زمانہ میں عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا لیکن نارمن بادشاہوں کے دربار میں عرصہ تک مسلمانوں کی تہذیب کا اثر رہا۔ ان بادشاہوں میں ایک راجر دوم (۱۱۰۱ء تا ۱۱۵۴ء) ہوا ہے۔ اس کا مسلمانوں کے ساتھ اتنا اچھا سلوک تھا کہ عیسائیوں میں یہ مشہور تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ اس نے مشہور عرب جغرافیہ دان ادریسی (۱۰۹۹ء/۴۹۳ھ تا ۱۱۵۴ء/۵۶۰ھ) کو افریقہ سے بلا کر دنیا کے جغرافیہ پر ایک کتاب لکھوائی اور دنیا کا ایک نقشہ تیار کرایا۔ موجودہ دور سے پہلے یہ نقشہ دنیا کا سب سے صحیح نقشہ تھا۔ ادریسی کی کتاب کا ۱۶۱۹ء میں یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور اس ترجمہ کے ذریعے یورپ والوں کو پہلی مرتبہ ایشیا اور خاص طور پر افریقہ کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔

ایک اور نارمن حکمران فریڈرک دوم (۱۱۹۴ء تا ۱۲۵۰ء) مسلمانوں جیسا لباس پہنتا تھا اور دربار میں مسلمان طبیب اہل علم اور مصاحب رکھتا تھا۔ اس کے زمانہ میں اسلامی تہذیب کا اثر اتنا تھا کہ عیسائی عورتیں بھی پردہ کرتی تھیں اور چہروں پر پردہ ڈالتی تھیں۔ اس کے زمانہ میں عربی کی بہت سی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا۔ ان میں ایک مشہور کتاب رازی کی "حاوی" ہے۔ بعد میں یہ کتابیں سارے یورپ میں پھیل گئیں۔ اس زمانہ میں جنوبی اٹلی کے شہر سلونو میں عربوں کی مدد سے ایک طبی مدرسہ ۱۰۷۰ء میں قائم ہوا جو یورپ میں طب کا پہلا مدرسہ تھا۔ یہاں مسلمان اطباء کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔

۱۔ جرارڈ قرا مونی (۱۱۱۴ء۔۱۱۸۷ء) اٹلی کا رہنے والا تھا۔ اس نے طلیطلہ آ کر اس کثرت سے عربی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا کہ اسے عربی علوم کا باوا آدم کہا جانے لگا۔ اس نے جن مشہور مصنفوں کی کتابوں کا ترجمہ کیا ان میں کندی، فارابی، ابن سینا اور زہراوی کا نام قابل ذکر ہے۔

۲۔ ایڈ لارڈ آف باتھ۔ بارہویں صدی کا ایک انگریز مسیح مترجم اور مصنف گزرا ہے۔ جرارڈ کا ہمعصر تھا۔ اس نے اندلس آ کر خوارزمی اور دوسرے مسلمان مصنفوں کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔

۳۔ مائیکل اسکاٹ (۱۱۷۵ء۔۱۲۳۴ء) انگریز تھا۔ طلیطلہ میں عربی سیکھی اور فریڈرک دوم کے دربار میں عربی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ بعد میں بادشاہ کے حکم سے یہ کتابیں یورپ کے تمام مدرسوں تک پہنچائیں۔ علم نجوم اور علم کیمیا وغیرہ پر اس نے جو کتابیں لکھیں اس کی وجہ سے یورپ کے لوگ پوپ سلویسٹر کی طرح اس کو بھی جادوگر سمجھتے تھے۔

ان ترجموں کی وجہ سے یورپ میں علوم وفنون پھیل گئے اور مسلمان وہاں کی علمی زندگی پر ایسے چھائے کہ ابن رُشد کی فلسفہ کی کتابیں اور ابن سینا کی طب کی کتابیں تین سو سال تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔

یورپ میں اس زمانہ میں اس قدر جہالت تھی کہ جو کوئی ریاضی، علم ہیئت، کیمیا، طب یا سائنس کے مسائل حل کرتا تھا تو لوگ اسے جادوگر قرار دے دیتے تھے۔ پوپ سلویسٹر اور مائیکل اسکاٹ کی طرح ایک اور انگریزی فلسفی اور مصنف راجر بیکن (۱۲۱۴ء۔۱۲۹۴ء) پر بھی یہی الزام تھا۔ اس نے عربی کتابیں پڑھنے کے بعد جو کتابیں لکھیں ان کی مخالفت کی گئی اور دس سال تک وہ پیرس میں مقید رہا۔

۱۵۱۱ء میں ہسپانیہ کی حکومت نے عربی کی کتابوں کو جلا دینے کا حکم دے دیا اور اس طرح لاکھوں کتابیں تباہ کر دی گئیں۔ صرف غرناطہ میں اسی ہزار کتابیں جلائیں گئیں۔ کچھ کتابیں جو جلنے سے بچ گئیں ہسپانیہ میں اسکوریال کے کتب خانہ میں اب تک محفوظ ہیں۔

علم وفن کی طرح اندلس کے مسلمانوں نے زراعت اور صنعت کو بھی خوب ترقی دی۔ چاول اور گنا انہوں نے پہلی مرتبہ اندلس میں پیدا کیا اور یہاں سے یہ رواج یورپ میں پھیلا۔ زراعت کے طریقے اور نہروں کے ذریعے آب پاشی وہ خوب جانتے تھے۔ یہ نظام فرانسیسیوں نے ان سے سیکھا۔

''اندلس کے لینن نامی کپڑے نے بڑی شہرت حاصل کی تھی اور قرطبہ کا ریشم دُور دُور مشہور ہو گیا تھا۔ اندلس میں تیار ہونے والے چمڑے کے سامان، ہتھیاروں اور شیشہ اور مشجر کپڑوں کا یورپ میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔'' (تہذیب کا ماضی اور حال۔ انگریزی)

میکس میو ہوف لکھتا ہے:

''اس طرح یورپ کی سرزمین میں جو علمی اور سائنسی لحاظ سے بنجر تھی سینکڑوں عربی کتابوں کے ترجمے ہو گئے اور جس طرح بارش سے بنجر زمین شاداب اور زرخیز بن جاتی ہے وہی اثر ان ترجموں کا یورپ پر ہوا۔'' (صفحہ ۳۵۱)

اب اگر ہم اندلس کے مسلمانوں کو یورپ کا اُستاد کہیں تو آپ خود ہی بتائیے کہ یہ صحیح ہو گا یا نہیں۔

یہ ہے مختصر تاریخ یورپ میں علم وفن، سائنس وحکمت کی روشنی پھیلنے کی۔ اگرچہ یورپ کو مہذب بنانے کا فخر پوری اسلامی دنیا کو حاصل ہے لیکن اندلس چونکہ یورپ سے سب سے زیادہ قریب تھا اس لیے یورپ والوں نے سب سے زیادہ فائدہ بھی وہیں سے اٹھایا۔ اور اندلس کے مسلمان بجا طور پر ''یورپ کے اُستاد'' کہے جانے کے مستحق ہیں۔

باب ۲۲
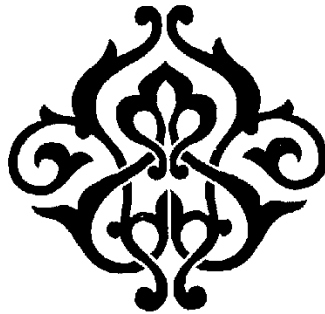
آگ اور خون کا سیلاب

خوارزم شاہی سلطنت

سلجوقیوں کے زوال کے بعد اسلامی دنیا کے مشرقی حصہ میں جو حکومتیں قائم ہوئیں ان میں کارناموں کے لحاظ سے اگرچہ شام و مصر کی زنگی اور ایوبی اور ہرات کی غوری حکومت زیادہ اہم ہے لیکن رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑی حکومت خوارزم کی تھی۔ اس حکومت کی بنیاد خوارزم کے سلجوقی حاکم اتسز نے سلطان سنجر کے انتقال کے بعد ڈالی تھی۔ خوارزم کے دو بادشاہوں۔ علاؤ الدین تکش (۵۶۸ھ تا ۵۹۶ھ) اور علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ (۵۹۶ھ تا ۶۱۷ھ) نے اپنی سلطنت کو بہت بڑھایا۔ علاؤ الدین تکش نے خراسان فتح کر لیا اور علاؤ الدین محمد نے ایک طرف شہاب الدین غوری کے انتقال کے بعد ہرات اور غزنی کو غوریوں سے چھین لیا اور دوسری طرف ماوراء النہر کے علاقہ سے قراخطائیوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ قرہ خطائی وہی تھے جنہوں نے سلطان سنجر سلجوقی کو شکست دے کر ماوراء النہر پر قبضہ کر لیا تھا۔ خوارزم شاہ اب بغداد پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلامی دنیا کا بڑا حصہ اب پھر متحد ہو جائے گا۔ لیکن خدا کو یہ منظور نہیں تھا۔

اسلامی دنیا کی شمال مشرقی سرحد دریائے سیحوں کے مغرب میں جھیل بیکال تک پہنچ گئی تھی۔ ختن، یارقند، کاشغر اور تاشقند اسلامی دنیا کے سرحدی شہر تھے۔ ان شہروں کے بعد چین تک ایک بہت بڑا ریگستان ہے جسے صحرائے گوبی کہتے ہیں۔ افریقہ کے صحرائے اعظم کے بعد یہ دنیا کا سب سے بڑا ریگستان ہے۔ اس ریگستان سے ملا ہوا ایک ملک ہے جو منگولیا کہلاتا ہے۔

محمد خوارزم شاہ کے زمانے میں منگولیا سے چین تک ایک شخص چنگیز خاں (۱۲۰۶ء تا ۱۲۲۷ء) نے ایک زبردست حکومت قائم کر لی تھی اور چین بھی فتح کر لیا تھا۔ یہ منگولوں کی حکومت تھی جو منگولیا کے رہنے والے تھے۔ یہ منگول کافر بڑے وحشی، اجڈ اور خونخوار تھے۔ چنگیز خاں

اچھے اچھے کپڑوں کا شوقین تھا اور یہ کپڑے چونکہ اسلامی دنیا میں بنتے تھے اس لیے اس نے ایک مرتبہ کچھ تاجروں کو خوارزم بھیجا۔ محمد خوارزم شاہ نے ان کو جاسوس سمجھ کر قتل کروا دیا۔ اس پر چنگیز خاں کو بڑا غصہ آیا۔ بات تھی بھی غصہ کی۔ تاجروں کو بغیر کسی گناہ کے قتل کر دینا کوئی انصاف کی بات نہیں۔ چنگیز خاں نے اس کا جواب طلب کیا لیکن خوارزم شاہ نے اس کے قاصد کو بھی قتل کر دیا۔

بس اب کیا تھا چنگیز خاں وحشی منگولوں کی زبردست فوج لے کر چڑھ آیا اور خوارزم شاہ کی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ اس طرح خوارزم شاہ کی وجہ سے اسلامی دنیا کو بڑی تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ خوارزم شاہ ایسا ظلم نہ کرتا تو وحشی منگول حملہ نہ کرتے۔ اس کی ذرا سی غلطی سے لاکھوں انسانوں کو نقصان پہنچا۔ لیکن سب سے بُری بات یہ ہوئی کہ محمد خوارزم شاہ نے چنگیز خاں سے چھیڑ تو شروع کر دی۔ لیکن جب اس نے حملہ کیا تو ایک جگہ بھی میدان جنگ میں آ کر اس کا مقابلہ نہیں کیا۔ وہ ایسا خوف زدہ ہوا کہ کہیں بھی مقابلہ نہیں کیا۔ چنگیز شہر پر شہر فتح کرتا جاتا اور وہ آگے آگے بھاگتا جاتا تھا، یہاں تک کہ بحر خضر کے ایک جزیرہ آبسکون میں جا کر پناہ لی اور وہیں ۱۲۲۰ء/۶۱۷ھ میں انتقال کیا۔

محمد خوارزم کے بعد اس کے لڑکے جلال الدین خوارزم شاہ نے جو بڑا بہادر تھا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ کئی سال تک منگولوں سے لڑتا رہا لیکن کامیاب وہ بھی نہ ہو سکا۔

منگولوں کا یہ حملہ بہت بڑی تباہی لایا۔ سمرقند، بخارا، خوارزم، بلخ، نیشاپور، رے غرض اسلامی دنیا کے وہ تمام شہر جو وسط ایشیا اور ایران میں تھے انہوں نے برباد کر دیئے۔ لوگوں کا قتل عام کیا۔ شہروں میں آگ لگا دی۔ شہروں کی عمارتیں جلا دیں اور دیکھتے دیکھتے اسلامی دنیا کا ایک بڑا حصہ ویران اور خاکستر کر دیا۔ مسجدیں، کُتب خانے اور مدرسے سب برباد کر دیئے گئے۔

بخارا اور سمرقند جن کی آبادی کا اندازہ دس دس لاکھ تک کیا جاتا ہے بالکل تباہ کر دیئے گئے۔ سمرقند کے ساٹھ ہزار کاریگروں کو منگول بیگار میں پکڑ کر لے گئے اور شہر میں صرف پانچ ہزار آدمی زندہ بچے۔ خوارزم میں قتل عام کے بعد منگولوں نے دریائے جیحوں کا بند توڑ دیا جس سے پورا شہر پانی میں ڈوب گیا۔ صوبہ نیشاپور میں سترہ لاکھ اور صوبہ ہرات میں سولہ لاکھ آدمی قتل کیے گئے۔ یہ صوبے جو اسلامی مملکت کے آباد ترین علاقوں میں سے تھے تقریباً غیر آباد ہو گئے۔ شہر رے میں سات لاکھ آدمی یا تو قتل کر دیئے گئے یا قیدی بنا لیے گئے۔ منگولوں کی اس تباہی کا ذکر ایک ہمعصر مؤرخ نے چند لفظوں میں اس طرح کیا ہے:

آمدند و کندند و سوختند و بروند و رفتند

یعنی وہ آئے، توڑ پھوڑ کی، آگ لگائی، لُوٹ مار کی اور چلے گئے۔

اس زمانہ کے ایک مؤرخ ابن اثیر نے جو چنگیز خاں کے حملہ کے وقت موجود تھے ان واقعات کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کے دل پر اسلامی دنیا کی تباہی کا بڑا گہرا اثر ہوا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"یہ حادثہ اتنا ہولناک اور ناگوار ہے کہ مَیں کئی برس تک اس پس و پیش میں رہا کہ اس کا ذکر کروں یا نہ کروں۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی موت کی خبر سُنانا کس کے لیے آسان ہے اور کس کا دل ہے کہ ان کی ذلت اور رُسوائی کی داستان سنائے۔ کاش میں پیدا نہ ہوتا۔ کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا۔ یہ وہ عظیم حادثہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی اور شاید دنیا قیامت تک بھی ایسا واقعہ نہ دیکھے۔"

خوارزم شاہ کی سلطنت کو تباہ کر کے اور رے، ہمدان اور آذر بائیجان تک تمام شہروں کو تباہ کر کے چنگیز منگولیا واپس چلا گیا اور کچھ عرصہ بعد مر گیا۔ لیکن پچاس سال بعد اس کے پوتے ہلاکو خاں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اس نے بغداد پر قبضہ کرنے کا ارادہ کر لیا جو اس وقت اسلامی دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔

خلافتِ عباسیہ کا آخری دَور

سلجوقیوں کے بعد بغداد کے خلیفہ پھر خود مختار ہو گئے تھے۔ ان آخری عباسی خلفاء کی سلطنت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ وہ صرف عراق پر حکومت کرتے تھے۔ بغداد، بصرہ اور کوفہ ان کے قبضے میں تھے۔

آخری دور کے یہ عباسی خلفاء جن کی تعداد سات ہے آخری خلیفہ مستعصم کے علاوہ سب کے سب لائق اور قابل تھے۔ ان میں مقتفی کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ اس نے سلجوقی تسلط کو ختم کرنے کی کامیاب کوشش کی اور ۵۴۷ھ میں سلطنت کو ان سے آزاد کرا لیا۔

ناصر کی شہرت اس لیے ہے کہ اس نے ۴۷ سال حکومت کی۔ عباسی خلفاء میں سے کسی نے اتنی لمبی مدت تک حکومت نہیں کی۔ ناصر کی طبیعت بہت سخت تھی۔ اس نے سلطنت کو بہت مضبوط کر دیا لیکن اس نے لوگوں پر ٹیکس بہت لگائے۔ اور مال حاصل کرنے کے لیے لوگوں پر بڑی

سختیاں کیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے رفاہِ عام کے کام بھی انجام دیئے اور مسجدیں، خانقاہیں اور مسافر خانے بڑی تعداد میں بنوائے۔

ناصر کے بعد اس کا لڑکا ظاہر تخت پر بیٹھا۔ وہ اپنی سیرت میں خلفائے راشدین کا نمونہ تھا۔ اس نے اپنے باپ کے زمانے کے مظالم اور سختیوں کو ختم کر دیا۔ لیکن یہ نیک خلیفہ صرف ۹ ماہ خلافت کر کے اپنے خدا سے جاملا۔

آخری دَور کے عباسی خلفاء میں سب سے زیادہ نیک نام اور مشہور مستنصر ہے۔ وہ اپنے باپ ظاہر کے بعد خلیفہ ہوا۔ اس نے کُل سترہ سال حکومت کی۔ لیکن یہ سترہ سال عباسیوں کے آخری دَور کا عہد زریں ہیں۔ اس کے عہد میں بکثرت مسجدیں، خانقاہیں، مسافر خانے، سرائے اور شفاخانے تعمیر کیے گئے۔ اس نے بغداد میں ایک ایسا مدرسہ بنایا جس کے آگے نظام الملک کا مدرسہ نظامیہ بھی ماند پڑ گیا۔ اس مدرسہ کا نام خلیفہ کے نام پر مدرسہ مستنصریہ تھا۔ اس مدرسہ کی عمارت سات سال میں مکمل ہوئی۔ مدرسہ کا کتب خانہ اتنا بڑا تھا کہ اس کے لیے ساٹھ اونٹوں پر کتابیں لد کر آئیں۔ جب یہ مدرسہ کھلا تو اس میں ڈھائی سو طالب علم داخل ہوئے۔ طلبہ کو مدرسہ کی جانب سے کھانے کے علاوہ مٹھائیاں اور میوے بھی ملتے تھے۔ اس کے علاوہ چٹائیاں، فرش، تیل، کاغذ، دوات مفت ملتی تھی اور ہر طالب علم کو ایک اشرفی ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ مدرسہ میں ایک شفاخانہ اور ایک عمدہ حمام بھی تھا۔

اس مدرسہ کی عمارت شکستہ حالت میں آج بھی بغداد میں موجود ہے۔ مستنصر نے رفاہ عام کے ان کاموں کے علاوہ سلطنت کو بھی بڑا مضبوط کیا۔ اس کا زمانہ بڑا نازک تھا۔ چنگیز خاں کی تاتاری فوجیں ایران اور ماوراء النہر کو تباہ کر چکی تھیں اور اس کی سلطنت کی سرحد عباسی خلافت سے مل گئی تھی۔ مستنصر نے اس خطرہ کی روک تھام کے لیے ایک لاکھ سوار فوج تیار کی۔ پیادہ فوج اس کے علاوہ تھی۔

بغداد کے آخری خلیفہ مستعصم باللہ میں حکومت کی صلاحیت نہیں تھی۔ وہ مغرور اور بیوقوف تھا۔ اس نے مستنصر کی جمع کی ہوئی فوج بھی توڑ دی۔ اس نے اپنے وزیر ابن علقمی پر اعتماد کیا لیکن اس وزیر نے غداری کی اور ہلاکو کو بغداد پر حملہ کے لیے بلا بھیجا۔ ہلاکو خان نے چالیس دن کے محاصرہ کے بعد شہر فتح کر لیا اور منگول فوجیں بغداد میں داخل ہو گئیں۔ یہ واقعہ صفر ۶۵۶ھ مطابق

۱۲۸۵ء کو پیش آیا۔

بغداد اگرچہ اس زمانہ میں اتنا بڑا شہر نہیں رہا تھا جتنا عباسی خلافت کے عروج کے زمانہ میں تھا۔ پھر بھی وہ دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔

یہاں کئی شفاخانے تھے جن میں سوق مارستان کا شفاخانہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں باون طبیب ملازم تھے۔ دوا تیار کرنے والوں اور مریضوں کی دیکھ بھال کرنے والوں اور دوسرے ملازمین کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔

حماموں کی تعداد دو ہزار تھی۔ یہ بڑے شاندار حمام ہوتے تھے۔ ان کی دیواروں اور فرش پر سیاہ رنگ کی چمک دار پالش تھی کہ دیکھنے والوں کو سیاہ رنگ پر فام کا دھوکا ہوتا تھا۔ مسجدوں کی اتنی تعداد تھی کہ ابن جبیر نے لکھا ہے کہ ان کا شمار تو کیا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ مسجدیں بڑی عالیشان تھیں۔

تیس مدرسے تھے اور ہر مدرسہ کی عمارت ایسی عظیم الشان تھی کہ بڑے بڑے محلات کو شرماتی تھی۔

بغداد کے مشرقی حصہ میں عالیشان محل، دلفریب باغات اور بڑے بڑے بازار تھے۔ یہ وہ بغداد تھا جس پر قبضہ کرنے کے بعد وحشی تاتاریوں نے کئی دنوں تک قتل عام کیا اور چالیس دن تک شہر کو لوٹتے رہے۔ عمارتیں ڈھا دیں۔ مکانوں میں آگ لگا دی۔ مسجدیں، مدرسے اور شفاخانے جن کی وجہ سے بغداد مشہور تھا برباد کر دیئے گئے اور دنیا کا سب سے بڑا شہر چند دنوں میں کھنڈر بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ بغداد میں سولہ لاکھ مرد عورتوں اور بچوں کو منگولوں نے قتل کیا۔

مستعصم کے ساتھ بھی ہلاکو نے بُرا سلوک کیا۔ اس کو ڈنڈوں سے پیٹ پیٹ کر ختم کر دیا۔ اور اس کی لاش کو پیروں سے مسل کر پھینک دیا۔

ابن علقمی جس نے غداری کی تھی اس کے ساتھ تاتاریوں نے کوئی سلوک نہیں کیا اور چند دن بعد وہ بھی مر گیا۔

عراق کے دوسرے شہروں کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس کے بعد ہلاکو نے شام کا رُخ کیا اور رہا، حران اور نصیبین کے باشندوں کا قتل عام کیا۔ پھر حلب میں داخل ہو کر پچاس ہزار آدمی قتل کیے اور دس ہزار عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا۔ بالآخر مصر کے حکمران بیبرس نے ۱۵۔ رمضان ۱۲۶۰ء/۶۵۸ھ کو فلسطین کے ایک مقام عین جالوت میں منگولوں کو شکست دے کر شام و مصر کو تباہ

ہونے سے بچالیا۔ ماوراء النہر سے بغداد تک کا علاقہ اسلامی دنیا کا دل تھا۔ منگولوں کے حملہ سے یہ بالکل برباد ہوگیا۔ انہوں نے عراق کی ان نہروں کو بھی برباد کر دیا جس سے عراق سرسبز وشاداب تھا۔

منگولوں کے حملہ کو اگرچہ سات سو برس گزر چکے ہیں اور اس عرصہ میں یہاں بڑی بڑی حکومتیں قائم ہوئیں لیکن ان ملکوں میں خوشحالی، وہ علم وفن کی ترقی پھر کبھی دیکھنے میں نہیں آئی جو تباہی بغداد کے زمانے تک اس خطہ نے کی تھی۔ اس زمانہ میں اسلامی دنیا کا یہ خطہ علم، تمدن، تہذیب اور صنعت وحرفت میں ساری دنیا سے بڑھا ہوا تھا۔ موجودہ صدی میں جدید ترقی کے باوجود اسلامی دنیا کو یہ بلند مقام آج حاصل نہیں۔ مسلمانوں کے اس زوال کے مختلف اسباب ہیں لیکن ایک بہت بڑا سبب منگولوں کا حملہ وران کی پھیلائی ہوئی تباہی اور بربادی بھی ہے۔ ایک طرف اندلس میں اسلامی تہذیب اور شہروں کی تباہی اور کتب خانوں اور مدرسوں کی بربادی نے اور دوسری طرف ترکستان سے شام تک اسلامی دنیا کے قلب کے منگولوں کے ہاتھوں تباہی نے اسلامی دنیا کو زوال کی طرف دھکیل دیا۔ ایک قوم کی ترقی میں اس کے علمی ذخیروں، تمدنی اداروں، صنعت وحرفت اور زراعت کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اگر علم اور تہذیب کے یہ نشان ملیا میٹ کر دیئے جائیں اور شہر اور بستیاں ویران کر دی جائیں اور صدیوں کی کوششوں سے جمع کیا ہوا علمی ذخیرہ برباد کر دیا جائے تو اس قوم کی تباہی میں جوان مصائب کا شکار ہو کیا شک باقی رہ سکتا ہے۔ اگر آج یورپ اور امریکہ کو بھی ایسے حالات سے گزرنا پڑے اور ان کے تمام شہر کھنڈر کر دیئے جائیں، ان میں ہل چلا دیا جائے، مدرسے، کتب خانے اور علمی اور سائنسی تحقیقات کے ادارے ناپید ہو جائیں اور بڑے بڑے شہروں کے عورت، مرد اور بچوں کا قتل عام کر دیا جائے تو شاید یورپ کا مستقبل بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں ہوگا، جو تباہی بغداد کے بعد اسلامی دنیا کا ہوا۔ منگول حملے نے صرف مادی تباہی نہیں پھیلائی اس نے اپنی وحشت اور سفاکی سے مسلمانوں کے حوصلے بھی پست کر دیئے، ان کے دل توڑ دیئے جس کے نتیجہ میں مایوسی کی فضا اور ترک دنیا کی خواہش پیدا ہوگئی اور یہ بات بھی مسلمانوں کے زوال کا باعث ہوئی۔

ابن جوزی

خلافت عباسیہ کے اس آخری دَور میں جو مشہور لوگ گزرے ہیں ان میں ہم علامہ ابن

جوزی (۵۰۸ھ تا ۵۹۷ھ) کو کبھی نہیں بُھلا سکتے۔ ابن جوزی ایک بلند پایہ محدث، ایک بڑے مؤرخ اور ایک عظیم مصلح تھے۔ ان کی ہمت بہت بلند تھی اور وہ چاہتے تھے کہ ہر چیز میں کمال پر پہنچ جائیں۔ وہ اپنی کتاب میں اپنی اس خواہش کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''میری عالی ہمتی کا معاملہ عجیب ہے، میں علم کا وہ درجہ حاصل کرنا چاہتا ہوں جہاں تک مجھے یقین ہے کہ میں پہنچ نہیں سکوں گا۔ میں تمام علوم حاصل کرنا چاہتا ہوں خواہ ان کا موضوع کچھ ہو اور ہر علم میں کمال چاہتا ہوں۔ پھر علم کے ساتھ میں عمل بھی چاہتا ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ مجھ میں بشر حافی کی احتیاط اور معروف کرخی کا زہد جمع ہو جائے۔ پھر میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ لوگوں کا محتاج نہ رہوں۔ لوگوں کا احسان لینے کی بجائے ان پر احسان کرنے کے قابل بن سکوں۔ مجھے اولاد کی بھی خواہش ہے اور بلند پایہ تصانیف کا بھی شوق ہے۔ مجھے اچھی چیزوں سے جائز لطف لینے کا شوق ہے، اسی طرح میں ایسی غذاؤں اور کھانے پینے کا بھی شوقین ہوں جو جسم کے لیے مفید ہوں۔ پھر میری یہ بھی خواہش ہے کہ دُنیا کو اس طرح حاصل کروں کہ میرے دین پر آنچ نہ آئے۔ میری بے چینی کا کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے، ایک طرف مجھے شب بیداری عزیز ہے، احتیاط اور تقویٰ کا اہتمام ہے اور دوسری طرف علم کی اشاعت، تصنیف و تالیف اور جسم کے لیے مناسب غذائیں بھی مطلوب ہیں۔ ایک طرف لوگوں سے ملنا جلنا اور ان کی تعلیم بھی ضروری ہے، دوسری طرف خلوت و تنہائی کی۔ دُعا و مناجات کے لطف میں کمی ہو تو اس پر بھی افسوس ہوتا ہے۔ گھر والوں کے لیے ضروریات زندگی کا انتظام کیا جائے تو زہد و احتیاط کے معیار میں فرق آتا ہے۔ لیکن میں نے اس ساری تکلیف اور کوفت کو گوارا کر رکھا ہے۔ شاید میری اصلاح و ترقی اسی تکلیف و کشمکش میں ہے۔ اس لیے کہ بلند ہمت لوگ ایسے اعمال کی فکر میں رہتے ہیں جو خدا کے ہاں باعث تقرب ہیں۔ اگر میرا مقصد حاصل ہو گیا تو سبحان اللہ ورنہ ایک مومن کی نیت اس کے علم سے بہتر ہے۔''

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں میں مال و دولت کی کثرت اور تہذیب و تمدن کی سہولتوں کی وجہ سے بڑی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں اور ان کے اخلاق بگڑ گئے تھے۔ لوگوں کی یہ حالت دیکھ کر ابنِ جوزی کا دل بہت کڑھتا تھا اور آخر کار انہوں نے بھی عوام کی اصلاح کے لیے وہی طریقہ اختیار کیا

جو ان سے کچھ ہی پہلے غزالیؒ اور عبدالقادر جیلانیؒ اختیار کر چکے تھے۔ ابن جوزی نے اصلاح کی غرض سے کتابیں بھی لکھیں اور وعظ نصیحت سے بھی کام لیا۔ انہوں نے عمر بن عبدالعزیزؒ احمد بن حنبلؒ اور ان بڑے بڑے لوگوں کے حالات بھی لکھے جن کی زندگی اسلامی سیرت کا نمونہ تھیں۔ اس سے ابن جوزی کا مقصد یہ تھا کہ لوگ ان عظیم ہستیوں کے حالات پڑھ کر اپنی زندگی بھی ویسی ہی بنانے کی کوشش کریں۔

ابن جوزی ایک اعلیٰ درجہ کے مقرر بھی تھے۔ ان کی اصلاحی تقریروں سے سارے بغداد میں ہل چل مچ گئی تھی۔ ان کی ان تقریروں اور درس و تعلیم کی مجلسوں میں ایک ایک لاکھ آدمی جمع ہو جاتے تھے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ایک لاکھ آدمی نے ان کے ہاتھ پر بُرے کاموں سے توبہ کی اور بیس ہزار یہودیوں اور عیسائیوں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ یہ ان کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جس کی مثال شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے علاوہ تاریخ میں شاید ہی کسی دوسری جگہ ملے۔

ابن اثیر اور یاقوت حموی

عباسیوں کے اس آخری دَور میں ابن جوزی کے علاوہ بھی کئی اور عظیم مصنف ہوئے ہیں ان میں ایک ابن اثیر (۱۱۶۰ء/۵۵۵ھ تا ۱۲۳۴ء/۶۳۰ھ) ہیں۔ وہ تاریخ ''الکامل'' کے نام سے ایک کتاب کے مصنف ہیں جس میں آغاز اسلام سے ۱۲۳۰ء تک کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ یہ کتاب اسلامی تاریخ کی اہم ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ابن اثیر کی دوسری اہم کتاب تاریخ اتابکہ موصل ہے۔ یہ زنگی خاندان کی سب سے مستند اور مفصل تاریخ ہے۔ ابن اثیر کی تیسری بڑی کتاب ''اسد الغابہ'' ہے جس میں کئی سو صحابہ کی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں۔

اس دَور کی ایک اور بڑی شخصیت یاقوت حموی (۱۱۷۹ء/۵۷۵ھ تا ۱۲۲۹ء/۶۲۶ھ) کی ہے۔ حموی اپنے دَور کا سب سے بڑا جغرافیہ دان اور سیاح تھا۔ جغرافیہ میں اس کی کتاب ''معجم البلدان'' بڑی بلند پایہ کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یاقوت ''معجم الادباء'' کے نام سے ایک اور کتاب کا مصنف بھی ہے جس میں کئی سو ادیبوں، مصنفوں اور شاعروں کے حالات ہیں۔

خوارزم شاہی سلطنت

(۱۱۵۶ء/۵۵۱ھ تا ۱۲۳۱ء/۶۲۸ھ)

۱۔ ایل ارسلان	۱۱۵۶ء/۵۵۱ھ تا ۱۱۷۰ء/۵۶۶ھ
۲۔ سلطان شاہ	۱۱۷۰ء/۵۶۶ھ تا ۱۱۷۲ء/۵۶۸ھ
۳۔ علاؤالدین تکش	۱۱۷۲ء/۵۶۸ھ تا ۱۲۰۰ء/۵۹۶ھ
۴۔ علاؤالدین محمد	۱۲۰۰ء/۵۹۶ھ تا ۱۲۲۰ء/۶۱۷ھ
۵۔ جلال الدین	۱۲۲۰ء/۶۱۷ھ تا ۱۲۳۱ء/۶۲۸ھ

بغداد کے آخری خلفاء

(۱۱۵۲ء/۵۴۷ھ تا ۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ)

۱۔ مقتفی لامر اللہ ۱۱۳۶ء/۵۳۰ھ تا ۱۱۶۰ء/۵۵۵ھ

سلجوقی اقتدار سے ۱۱۵۲ء/۵۴۷ھ میں آزاد حاصل کر لی۔

۲۔ مستنجد باللہ	۱۱۶۰ء/۵۵۵ھ تا ۱۱۷۰ء/۵۶۶ھ
۳۔ مستضی بامر اللہ	۱۱۷۰ء/۵۶۶ھ تا ۱۲۲۵ء/۵۷۵ھ
۴۔ الناصر الدین اللہ	۱۱۸۰ء/۵۷۵ھ تا ۱۲۲۵ء/۶۲۲ھ
۵۔ ظاہر بامر اللہ	۱۲۲۵ء/۶۲۲ھ تا ۱۲۲۶ء/۶۲۳ھ
۶۔ مستنصر باللہ	۱۲۲۶ء/۶۲۳ھ تا ۱۲۴۲ء/۶۴۰ھ
۷۔ مستعصم باللہ	۱۲۴۲ء/۶۴۰ھ تا ۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ

۱۲۱۸ء/۶۱۵ھ خوارزم شاہی سلطنت پر چنگیز خاں کے حملے کا آغاز۔

۱۲۲۰ء/۶۱۷ھ بخارا، سمرقند اور خوارزم پر قبضہ۔

۱۲۲۱ء/۶۱۸ھ نیشاپور اور اس کے بعد رے اور ہمدان کی تباہی۔

۱۲۲۰ء/۶۱۹ھ چنگیز خاں کی منگولیا واپسی۔

مزید مُطالعہ کے لیے کتابیں

۱۔ تاریخ اسلام حصہ چہارم از شاہ معین الدین احمد ندوی۔

۲۔ تاریخ اسلام حصہ سوم از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

۳۔ تاریخ دعوت وعزیمت حصہ اول از سید ابوالحسن علی ندوی۔

۴۔ تاریخ ادبیات ایران (درعہد مقولان) براؤن کی ادبی تاریخ کا ترجمہ۔

باب ۲۳

مسلمانوں کے عروج کے دَورِ اوّل کا خاتمہ

تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی اور اندلس میں مسلمانوں کے زوال پر اسلامی تاریخ کا ایک اہم دَور ختم ہو جاتا ہے۔ یہ دَور مسلمانوں کے عروج کا پہلا دَور ہے۔ اس کی ابتداء ۶۲۲ء/ ۱ھ میں مدینہ میں اسلامی حکومت کے قائم ہونے سے ہوتی ہے اور ۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ میں بغداد کی تباہی پر اس دَور اول کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بغداد اگرچہ تباہ ہو گیا۔ اسلامی دنیا کا بڑا حصہ کافر تاتاریوں کے قبضہ میں چلا گیا اور اندلس مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا ان تمام نقصانوں اور تباہیوں کے باوجود مسلمانوں کا زوال ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ بغداد کی تباہی کے بعد بھی پورے ساڑھے چار سو سال تک مسلمانوں کا عروج رہا۔ ساڑھے چار سو سال کا یہ زمانہ مسلمانوں کے عروج کا دوسرا دَور ہے۔ اس جگہ یہ سمجھ لینا بہت ضروری ہے کہ مسلمانوں کے عروج کے پہلے دَور کی کیا خصوصیت ہے۔ تاکہ بعد میں عروج کے دَور اول اور دَور ثانی کا فرق اچھی طرح سمجھا جا سکے۔ دَور اول کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱۔ اسلامی سلطنت رقبہ کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی حکومت بن گئی تھی۔ عربوں کے عہد عروج میں جب کہ دمشق اور بغداد اسلامی حکومت کے دارالخلافہ تھے اسلامی سلطنت جتنی وسیع تھی اتنی وسیع سلطنت اس وقت تک دنیا میں کسی قوم نے قائم نہیں کی تھی۔ ایران کی کیانی سلطنت، اطالیہ کی رومی سلطنت اور چین کی تانگ سلطنت جو پرانے زمانے میں دُنیا کی سب سے بڑی حکومتیں تھیں رقبہ میں اسلامی حکومت سے بہت کم تھیں۔

۲۔ اس دَور میں مسلمان صرف سیاسی لحاظ سے ہی عروج کی انتہا پر نہیں پہنچے بلکہ علمی لحاظ سے انتہائی عروج پر پہنچے۔ چنانچہ اس زمانہ میں مسلمانوں میں جیسے بڑے بڑے مصنف ہوئے اور انہوں نے تفسیر، حدیث، فلسفہ، ریاضی، طب، تاریخ، سوانح اور جغرافیہ وغیرہ

پر جیسی عمدہ کتابیں لکھیں اور جیسی ایجادیں کیں ویسی اس دَور میں دنیا میں کسی قوم نے نہیں کیں۔ اس دَور کی تصانیف تخلیقی نوعیت کی تھیں۔ یعنی ان میں ایک نئی بات اور نیا تصور پیش کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتابیں کلاسیکی سمجھی جاتی ہیں۔ یہ کتابیں بعد میں لکھی جانے والی کتابوں کے لیے ایک طرح کی بنیاد بن گئیں۔

۳۔ اس دَور میں عربی تمام مسلمانوں کی علمی زبان تھی۔ ترک، ایرانی، حبشی، بربر تمام قوموں کے عالم تصنیف و تالیف کے لیے عربی زبان ہی استعمال کرتے تھے۔ عربی زبان تمام مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی جس کی وجہ سے ماوراء النہر میں لکھی ہوئی کتابیں اندلس تک اور اندلس میں لکھی ہوئی کتابیں ماوراء النہر تک آسانی سے پھیل جاتی تھیں۔ اس کی وجہ سے پوری اسلامی دُنیا کے مسلمان ایک دوسرے کے خیالات سے واقفیت رکھتے تھے۔ بعد میں جب اسلامی دنیا میں انتشار پیدا ہو گیا اور ایک کی جگہ کئی کئی حکومتیں قائم ہو گئیں تو یہی عربی زبان تھی جس کے ذریعے مسلمانوں میں اتحاد قائم تھا۔ عربی اس دَور میں دنیا کی سب سے بڑی علمی زبان بن گئی تھی۔

ایک مغربی محقق جارج سارٹن نے ساری دنیا کی ایک علمی تاریخ مرتب کی ہے۔ اس میں اس نے اسلامی تاریخ کے اس دَور کے متعلق لکھا ہے۔

''عہد وسطیٰ میں سب سے زیادہ عظیم کارنامے مسلمانوں نے انجام دیئے۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ میں لاطینی زبان میں بھی کئی اہم کتابیں لکھی گئیں۔ اس طرح یونانی، سریانی، فارسی، سنسکرت اور چینی حتیٰ کہ جاپانی زبان میں بھی چند اہم کتابیں لکھی گئیں لیکن سب سے زیادہ قابل قدر، سب سے زیادہ قدرت رکھنے والی اور سب سے زیادہ نتیجہ خیز اور مفید کتابیں عربی میں لکھی گئیں۔ آٹھویں صدی کے نصف آخر سے گیارہویں صدی تک عربی نوع انسان کی ترقی پسند علمی زبان تھی۔ اس زمانہ میں ایک ایسے شخص کے لیے جو ہر قسم کا اور جدید ترین علم حاصل کرنا چاہتا ہو عربی ہی پڑھنا پڑتی تھی۔ چنانچہ ان لوگوں نے جو غیر عرب تھے کثرت سے ایسا ہی کیا بالکل اسی طرح جس طرح کہ اس زمانہ میں ایک ایسا شخص جو علمی ترقی کرنا چاہتا ہو تو اس کے لیے بڑی بڑی مغربی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کا سیکھنا لازمی ہے۔''

۴۔ اس دَور میں مسلمان اسلامی تعلیمات سے بہت قریب تھے۔ خلافت راشدہ کا زمانہ اسی دَور سے تعلق رکھتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز، نظام الملک طوسی، نور الدین، صلاح الدین، ہشام اول، عبدالمومن اور ابویعقوب المنصور جیسے اچھے حکمران اسی دَور میں ہوئے۔ ان حکمرانوں نے اپنے زمانہ میں اسلامی اصولوں پر زیادہ سے زیادہ عمل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام غزالیؒ، ابن حزم اور عبدالقادر جیلانیؒ جیسے عالم اسی دَور میں ہوئے۔ ان کی کوششوں کی وجہ سے مسلمانوں میں زیادہ خرابیاں نہیں پھیل سکیں اور مسلمان غیر اسلامی اثر سے بچے رہے ان کی اخلاقی حالت اچھی رہی۔

۵۔ تمدنی لحاظ سے اسلامی دنیا ساری دنیا سے آگے بڑھ گئی۔ یہاں بغداد، کوفہ، سمرقند، بخارا، رے، قاہرہ، مراکش، فاس، قرطبہ، اشبیلیہ جیسے عظیم الشان شہروں کی کثرت تھی اور جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ ان شہروں میں سے ہر ایک کی کئی کئی لاکھ آبادی تھی۔ ان کی سڑکیں پختہ ہوتی تھیں۔ صفائی ستھرائی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ عمارتیں پختہ اور کئی کئی منزلوں کی ہوتی تھیں۔ اہل شہر کے لیے کثرت سے باغات اور تفریح گاہیں ہوتی تھیں۔

ہر شہر میں حمام، مسجدیں، شفاخانے اور مدرسے ہوتے تھے۔ لوگوں کے مطالعے کے لیے کتب خانے ہوتے تھے اور لوگ ذاتی کُتب خانے بھی رکھتے تھے۔ علم ہیئت کے لیے جگہ جگہ رصدگاہیں ہوتی تھیں۔

ان شہروں میں بہترین قسم کا سوتی، اونی اور ریشمی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ عمدہ قسم کا چمڑے کا سامان بنتا تھا۔ عطر بنائے جاتے تھے۔ تلواریں اور ہتھیار بنتے تھے۔ پانی کے جہاز بنتے تھے۔ علم ہیئت اور طب میں استعمال ہونے والے آلات بنائے جاتے تھے۔ غرض کہ ہر شہر ہر قسم کی صنعت وحرفت کا مرکز تھا۔

اس زمانہ میں اسلامی دنیا اور یورپ میں جو فرق تھا اس کا اندازہ ذیل کے خاکے سے کیا جاسکتا ہے۔

اِسلامی دنیا اور یورپ کا فرق

(۷۵۰ء اور ۱۲۵۸ء کے درمیان)

	اِسلامی دُنیا		یورپ
۱۔	دو درجن سے زیادہ شہر ایسے تھے جن کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ بصرہ، کوفہ اور اشبیلیہ کی آبادی پانچ پانچ لاکھ، قاہرہ کی دس لاکھ، قرطبہ کی پندرہ لاکھ اور بغداد کی آبادی ۲۵ لاکھ تھی۔	۱۔	سوائے قسطنطنیہ کے ایک شہر بھی ایسا نہیں تھا جس کی آبادی ایک لاکھ ہو۔ روم اور فلورنس سب سے بڑے شہر تھے جن کی آبادی بالترتیب پچاس ہزار اور ۴۵ ہزار تھی۔ لندن کی ۲۵ ہزار تھی۔ بارہویں صدی میں پورے انگلستان کی آبادی صرف ۲۲ لاکھ تھی
۲۔	ہر شہر میں پختہ عمارتیں ہوتی تھیں۔ بڑے شہروں میں پانچ سے آٹھ منزل تک کی عمارتیں عام تھیں اور بڑے مکانوں کے ساتھ پائیں باغ ہوتے تھے۔	۲۔	یورپ کے تمام شہروں میں مکانات زیادہ تر کچی مٹی کے یا گھاس پھوس اور لکڑی کے ہوتے تھے۔
۳۔	شہروں میں پختہ سڑکیں ہوتیں تھیں۔ گندے پانی کے نکاس کے لیے بڑی بڑی نالیاں اور بدرَویں ہوتی تھیں۔	۳۔	شہروں کی سڑکیں زیادہ تر کچی ہوتی تھیں۔ گندے پانی کے نکاس کا انتظام نہیں تھا جس کی وجہ سے سڑکوں اور راستوں پر کیچڑ رہتی تھی۔
۴۔	تعلیم عام تھی اور بلا معاوضہ۔ بڑے مدرسوں میں چھ ہزار تک طالب علم ہوتے تھے۔	۴۔	مدرسوں کا نام نہیں تھا۔ سوائے پادریوں کے اور کوئی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ بارہویں صدی سے مدرسے قائم ہونا شروع ہوئے۔

۵۔ ہر شہر میں کتب خانوں کی کثرت تھی۔ عام کتب خانے بھی ہوتے تھے اور ذاتی بھی۔	۵۔ ایک بھی قابل ذکر کتب خانہ نہیں تھا۔
۶۔ عام طور پر ہر بڑے شہر میں علم ہیئت کی تحقیق کے لیے رصدگاہیں ہوتی تھیں۔	۶۔ ایک بھی رصدگاہ قائم نہیں تھی۔
۷۔ ہر ملک میں کاغذ بنایا جاتا تھا۔	۷۔ کاغذ بنانا نہیں جانتے تھے۔
۸۔ شیشہ سازی کا فن پورے عروج پر تھا۔	۸۔ شیشہ سازی سے ناواقف تھے۔
۹۔ بہترین قسم کا سوتی، اونی اور ریشمی کپڑا تیار ہوتا تھا۔	۹۔ بھدے قسم کے کپڑے تیار ہوتے تھے۔ امراء کے گھروں میں اسلامی ملکوں کے کپڑوں کی مانگ رہا کرتی تھی۔
۱۰۔ برف بنانے کی صنعت موجود تھی۔	۱۰۔ یورپ والے سولہویں صدی میں برف بنانا سیکھے۔
۱۱۔ علاج کے لیے جگہ جگہ عالیشان شفاخانے تھے۔	۱۱۔ دوا[illegible] سے ناواقف تھے۔ ٹونوں ٹوٹکوں سے علاج کرتے تھے۔ پہلا شفاخانہ تیرہویں صدی میں روم میں بنا۔
۱۲۔ ہر شہر میں کثرت سے حمام ہوتے تھے۔ بغداد میں حمام اور قرطبہ میں حمام تھے۔	۱۲۔ حمام بنانا کفر سمجھا جاتا تھا۔

اس جگہ یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اسلامی دنیا کو علم وفن اور تہذیب وتمدن میں یہ زبردست برتری صرف یورپ کے ملکوں کے مقابلہ میں حاصل تھی۔ مشرق کے ملکوں اور خاص کر ہندوستان اور چین کے مقابلے میں اسلامی دنیا کو برتری ضروری حاصل تھی لیکن اتنی زیادہ حاصل نہیں تھی۔

اس زمانہ میں ہندوستان اور چین میں بھی بڑے بڑے شہر تھے۔ بڑی اچھی حکومتیں قائم

تھیں۔ بہترین عمارتیں بنائی جاتی تھیں۔ نہروں کے ذریعے سے آبپاشی ہوتی تھی۔ صنعت اور زراعت ترقی پر تھی۔ سوتی کپڑوں میں ہندوستان اور ریشمی کپڑوں میں چین اسلامی دنیا کے مقابلے میں کسی طرح پیچھے نہیں تھے۔ صفر کا استعمال اور ہندسوں کا استعمال مسلمانوں نے ہندوؤں ہی سے سیکھا۔ اس طرح کاغذ بنانا اور قطب نما کا استعمال مسلمانوں نے چین کے لوگوں سے سیکھا لیکن اس کے باوجود ہم یہی کہیں گے کہ اسلامی دنیا اس زمانہ میں مجموعی طور پر ہندوستان اور چین سے بھی آگے بڑھ گئی تھی۔

ہم نے مانا کہ ہندوستان میں بڑے بڑے شہر تھے لیکن یہ شہر اتنے خوبصورت اور باقاعدہ نہیں ہوتے تھے جتنے اسلامی دنیا کے شہر تھے۔ تفریح گاہوں، باغوں اور فواروں کا تو ہندوستان میں رواج ہی نہیں تھا۔ نہ یہاں کے شہروں میں ایسے شفاخانے تھے جیسے مراکش، قاہرہ، دمشق وغیرہ میں تھے اور جن کا حال ہم پڑھ چکے ہیں۔ نہ یہاں اسلامی شہروں کی طرح شاندار مدرسے تھے اور نہ یہاں کے لوگ کاغذ بنانا جانتے تھے۔ پھر ہندوستان والے علم جغرافیہ اور تاریخ سے بھی ناواقف تھے۔ ان علوم میں ان کی ناواقفیت کا یہ حال تھا کہ وہ خود اپنی تاریخ اور اپنے ملک تک سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ اگر البیرونی، ابن حوقل اور دوسرے مسلمان مورخ اور سیاح ہندوستان کے حالات نہ لکھتے تو آج نہ تو ان کے بہت سے شہروں کے حالات سے واقف ہوتے اور نہ ان کی بہت سی تاریخ سے۔

ہندوستان کے ہندو باشندے تو بس اپنے ملک میں ہی رہتے تھے۔ سمندر پار جانا بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ جب ایسا تھا تو بھلا ان میں مسعودی، ابن حوقل اور ابن جبیر جیسے سیاح کیسے پیدا ہو سکتے تھے۔

ہندوستان میں ایک اور عیب یہ تھا کہ وہاں ذات پات کی تفریق تھی۔ برہمنوں کے علاوہ دوسرے لوگ علم حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ مسلمانوں میں یہ بات نہیں تھی۔ ہمارے یہاں غلام بھی بادشاہ ہو جاتے تھے اور معمولی سے معمولی کام کرنے والے مزدور اور کاریگر بھی بڑے بڑے عالم ہو سکتے تھے۔

رہا چین کا حال تو مسلمان وہاں کے لوگوں سے بھی بہت سی باتوں میں بڑھے ہوئے تھے۔ چین والے ایک زمانہ میں بہت سیر و سیاحت کرتے تھے لیکن جب سے مسلمانوں کو عروج ہوا ان کی سیر و سیاحت بھی ختم ہو گئی۔ پھر علوم کے معاملے میں وہ چین ہی کے اندر بند رہتے تھے جس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علم طب، ہیئت، سائنس اور جغرافیہ میں مسلمانوں کی طرح ترقی نہیں کر سکے اور ان علوم میں پانچ سو سال کے عرصہ میں شاید دو چار مصنف بھی ایسے نہیں ہوئے جو مسلمان علماء حکماء کے مقابلے میں پیش کیے جا سکیں۔

چین والے زیادہ سے زیادہ ایران تک کے حالات سے واقف تھے لیکن مسلمان چین سے لے کر بحر اوقیانوس کے ساحل تک بلکہ صحرائے اعظم کے پار تک کے ملکوں کے حالات سے اچھی طرح واقف تھے۔ چین والے ان علاقوں کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔

مسلمانوں نے ایک طرف ہندوستان سے علم ہندسہ سیکھا اور دوسری طرف یورپ والوں کو سکھا دیا۔ انہوں نے ہندوستان اور چین کی طب اور ہیئت اور دوسرے علوم کو ملا کر نئی طب مرتب کی اور ہندوستان میں ہونے والے پھل اور پھولوں کی اسلامی ملکوں میں کاشت کی اور پھر ان کا علم یورپ تک پہنچا دیا۔

مختصراً ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ۱۵۰ھ سے ۶۵۰ھ تک کے زمانہ میں جو پانچ سو سال[۱] پر مشتمل ہے دنیا میں سب سے زیادہ متمدن، ترقی یافتہ، مہذب اور علم و فن کا مرکز اسلامی دنیا کے ملک تھے۔ مسلمانوں کے بعد تہذیب و تمدن میں ہندوستان اور چین بڑھے ہوئے تھے اور سب سے زیادہ پست، کم ترقی یافتہ غیر مہذب اور جاہل وہ ملک تھے جو کہ یورپ میں واقع تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی تاریخ میں قرون وسطیٰ کا زمانہ ''تاریک زمانہ'' کہلاتا ہے۔ لیکن یورپ کے بہت سے مؤرخ اور مصنف جن کی کتابیں ہمارے یہاں بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں اپنی جہالت کی وجہ سے پورے قرون وسطیٰ ہی کو ''تاریک زمانہ'' کہہ ڈالتے ہیں۔ اسلامی تاریخ کے طالب علم کو کبھی یہ دھوکا نہیں ہو سکتا۔ وہ جب قرونِ وسطیٰ کا لفظ پڑھتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ وہ ہمارا ''زریں دور'' تھا۔ اسلامی دنیا کا زوال کس طرح شروع ہوا اور یورپ اپنے تاریک دَور سے کس طرح نکلا اور اس نے موجودہ عروج کس طرح حاصل کیا اس کا حال اس کتاب کے دوسرے حصے میں بتایا جائے گا۔

(۱) آٹھویں صدی عیسوی کے وسط سے تیرہویں صدی عیسوی کے وسط تک۔

مزید مُطالعہ کے لیے کتابیں

اسلامی تاریخ سے متعلق چند مختصر لیکن جامع اور مفید کتابیں جن کے مطالعہ سے تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ تاریخ الخلفاء از علامہ جلال الدین سیوطی (اردو ترجمہ)

۲۔ تاریخ الفخری (اردو ترجمہ)

۳۔ تجدید و احیائے دین از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

۴۔ تاریخ دعوت و عزیمت (تین حصے) از سید ابوالحسن علی ندوی۔

۵۔ مسلمانوں کے زوال سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا از سید ابوالحسن علی ندوی۔

تاریخی اشخاص، مقامات اور اصطلاحات کے انگریزی مترادفات

Abencuzman	ابن قزمان
Adana	اذانہ۔اطنہ۔ادانہ
Adata	الحدث
Adriatic	بحر ادریاس۔ خلیج بندقی
Aghlabids	اغالبہ
Alarcos	الارک
Albacete	البسیط
Albarracin	بنو ازین
Albategnius	بطانی
Alcazar	القصر (اشبیلیہ)
Alcira	الجزیرہ (اندلس)
Alepoo	حلب
Alexandretta	اسکندرونہ
Alexandria	اسکندریہ
Alfragauus	الفرغانی
Algarve	الغرب (اندلس)
Algazel	الغزالی
Algeeiras	جزیرۃ الخضراء (اندلس)
Algiers	الجزائر

Alhazen	ابن هيثم
Alicante	لقنت
Aljarafe	سرف (اندلس)
Almagest	الجسطی
Almeria	الميريه
Almadovar de Rio	حصن المدور
Almohades	موحدين
Almoravids	مرابطين
Almunecar	المنكب(اندلس)
Alpetragius	بطروجی
Alpharabius	فارابی
Alpuente	البونت
Alpuxarras (Alpujarras)	البشارات
Amida	آمد۔دیار بکر
Amerion	عموريه
Amysos	صاسون (ترکی)
Antiocn	انطاکیه
Apologos	اُبله
Arabian Nights	الف ليلیٰ
Aragon	ارغون (اندلس)
Araxes	دریائے ارس
Archimedes	ارشمیدس
Aristotle	ارسطو
Arsamosota	شمشاط۔خرپوت

Arzachel	زرقلی
Astorga	اشتورقه
Asturias	استوراس
Athens	ائینه۔ ایتھنز
Avempace	ابن باجه
Avendeath	ابن داؤد
Avenzoar	ابن زُهر
Averros	ابن رشد
Avica	جزیرہ یابسه
Avicebron	ابن جبریل
Avicenna	ابن سینا
Avignon	اوی نون (فرانس)
Badajoz	بطلیوس
Baeza	بیاسه
Barcelona	برشلونه
Beja	باجه (اندلس)
Biscay	بشکنس (خلیج)
Bone	بونا (الجزائر)
Bordeaux	برذیل
Bougie	بجایه
Burgos	برغُش۔ برغوش
Cadiz	قادس (اندلس)
Caesarea	قیصریه۔ قیصری
Cairo	قاهره

Calabria	قدوریه (اٹلی)
Calatayud	قلعه ایوب (اندلس)
Cambay	قلعه رباح
Cambay	کھمبائت
Canamusali	عمار موصلی
Canaries	جزائر سعادت
Canton	خانفو
Carcassonne	قرقشونه (فرانس)
Carmatniane	قرامطه
Carmona	قرمونه
Casablanca	دارالبیضا (مراکش)
Caspian	بحیرۂ خزر، بحیرۂ طبرستان، بحیرۂ جرجان
Castamon	قسطمونیه۔ قسطمون
Castellon	قشتیلیون
Castile	قشتاله۔ قشتالیه
Catalonia	قیطلونیه
Ceuta	سبته (مراکش)
Ceylon	سرالدیب (لنکا)
Chaboras	دریائے خابور
Chosroes	خسرو
Cintra	شنتره
Circeium	قرقیبا
Claudiopolis	بولو (ترکی)

Clysma	قلزم
Constantine	قسطنطین
Constantine son of Luke	قسطابن لوقا
Constantinople	قسطنطنیہ
Cordova	قرطبہ
Covadonga	صخرۃ بلائی
Crete	اقریطش۔کریٹ
Ctesiphon	طیسیفون۔مدائن
Cuenca	کونکہ (اندلس)
Cyprus	قبرص
Damascus	دمشق
Damietta	دمیاط (مصر)
Darro	دریائے حدارہ (اندلس)
Denia	دانیہ (اندلس)
Dome of Rock	قبۃ الصخرہ
Dorylean	درولیہ
Douro	دریائے دویرہ
Ebro	دریائے ابرہ (اندلس)
Ecbastana	ہمدان
Edessa	رہا۔ارفا (ترکی)
Edrisi	ادریسی
Egypt	مصر
Elvira	البیرہ
Ephesus	افسوس (ترکی)

Euclid	جبل البُرکان
Euphrates	اقلیدس
Euphrates	دریائے فرات
Farragat	فرح بن سالم
Fes (Fez)	فاس
Galen	جالینوس
Galicia	جلیقیہ (اندلس)
Garcia	غرسیہ (حکمران)
Geber	جابر ابن حیان
Generalife	جنت العارف
Gerona	جرندہ
Gibralter	جبل الطارق
Goths	قوم لوط
Granada	غرناطہ
Guadalete	وادیٔ لکہ بالطہ (اندلس)
Guadiana	وادیٔ آنہ (اندلس)
Guadalaviar	وادی ابیض (اندلس)
Guadix	وادی آش (اندلس)
Guadalajara	وادی المحجارہ (اندلس)
Guadalquivie	وادی الکبیر (اندلس)
Haly Rodoam	علی ابن رضوان
Halys	آلس۔قزل ارماق (ترکی)
Hangehou	خنا (چین)
Heraclia	ہرقلہ (ترکی)

Heraclius	ھرقل
Hierapolis	منبج (شام)
Hippoerates	بقراط
Hittin	حطین
Huesea	وشقه
Inconium	قولیه
Jaen	جیان
Jativa	شاطبه
Jaxartes	سیردریا۔سیحون
Jerusalem	یروشلم۔بیت المقدس
Jesualy	علی ابن عیسی (کحال)
Kamacha	کمخ (ترکی)
Karallia	بے شہر (ترکی)
Khanfu	کینٹن (چین)
Khazar	خزر
Kinsa	خنسا۔ھانک چائو
Kiphas (Cephe)	حصن۔کیفا (ترکی)
Larache	العرائش (مراکش)
Lerida	لارده
Lisbon	لشبونه۔اشبونه
Loadicia	لاذقیه (ترکی)
Lombardy	الانکورده
Lorea	لورقه
Lyons	حصن لوذون

Lugo	لک
Madrid	مجریه
Magazin	مخازن
Magnesia	مغنسیه۔ منیسا
Maimonides, Moses	موسی ابن میمون
Majorea	جزیرہ میورقه
Marasion	مرعش (ترکی)
Malaga	مالقه
Martyropolis	میافارقین (ترکی)
Media	جبال (ایران)
Medinacell	مدینه سالم (اندالس)
Massawa	مصوع
Merida	مارده (اندلس)
Messina	مسینی
Minorea	جزیرہ منورقه
Mesopotamia	عراق
Mopsuetta	مصیصه
Moriscos	مولدین
Mozaribe	مستعرب
Murcia	مرسیه
Narbonne	اربونه۔ فربونه (فرانس)
Navarra	نبره (اندلس)
Nicaea	نفیسه۔ ازنیق
Nazareth	ناصره (فلسطین)

Nicephorus	ثقفور (قیصر روم)
Nieomedia	ازمت (ترکی)
Neibla	نبیلۃ (اندلس)
Nisibis	نصیبین
Opporto	برتقال (پرتگال)
Oran	وھران (الجزائر)
Orontes	دریائے عاصی
Ottoman	عثمانی
Oujda	وجدہ (مراکش)
Oxus	دریائے سیحون۔ آمودریا
Palermo	بلرم
Pamplona	بنبلونہ (اندلس)
Pekin (Cambaluc)	خان بالیغ
Pelay	بلائی (قوطی سردار)
Peloponeso	بلبونس
Pelusium	فرما (مصر)
Pergamos	برغمہ (ترکی)
Persepolis	اصطخر
phrygia	کرمیان (ترکی)
plato	افلاطون
pontos	بحر بنطس۔ بحیرہ اسود
Prusa	بروصہ
Ptolemy	بطلیموس
Pyramus	دریائے جیحان (ترکی)

Pyreness	جبل البرانس۔ جبل البرقات
Pythagoras	فیثاغورث
Quilon	کولم
Rasi	رازی
Rayy	رے
Regio	ریہ
Rhages	رے
Rhazes	رازی
Rhodes	رودس
Rhone	دریائے رونہ
Roderic	لرریق
Ramanus Deogenes	قیصر۔ دیوجانس
Ronda	رندہ
Sacralias	زلاقہ (اندلس)
Salamanca	ظلمنکہ (اندلس)
Samosata	سمیساط
Sancho	سانچہ (حکمران)
Santarem	شنترین
Santiago de Compostela	شنت یعقوب
Saladin	صلاح الدین
Saragossa	سرقسطہ (اندلس)
Sardenia	جزیرہ سردانیہ
Sarus	دریائے سیحان (ترکی)
Sebastia	سیواس

Segovia	شقوبیہ
Segura	شقورہ
Seville	اشبیلیہ
Saint Maria de Algarve	شنت ماریہ الغرب
Saint Yago	شنت یعقوب (اندلس)
Sieily	صقلیہ
Sidon	صیدا (لبنان)
Sidonia	شذونہ
Sierra Nevada	جبل الشلید۔جبل الثلج
Silves	شلب
Simancas	شبت نکش
Sogdiana	صغد
Syraouse	سرقوسہ
Strait of Gibralter	بحر زقاق
Tagus	دریاء تاجہ (اندلس)
Talavera	طبیرہ
Tamerlane	تیمور
Tangier	طنجہ
Tarifa	جزیرہ طریف
Tarragona	طرکونہ
Theodomir	تدمیر (قوطی سردار)
Theodosiopolis (Karim)	قالیقلا۔ارض روم
Thueda	طوطہ (ملکہ)
Tibrias	طبریہ

Tigris	دریائے دجلہ
Toledo	طلیطلہ
Tortosa	طرطوشہ (اندلس)
Toulousa	طلوشہ (فرانس)
Trafalgar	طرف الاغر
Transoxania	ماوراء النہر
Trebizond	تراپزون
Tripoli	طرابلس
Tyana	طوانہ (ترکی)
Tyre	صور
Ukhaidir	الاخیضر (عراق)
Valencia	بلنسیہ (اندلس)
Venice	بندقیہ
Visigoth	بشتولقات
Volga	اِتل۔ایدل
Xenil	دریائے شنیل
Xeres	شریش
Zamora	سمورہ (اندلس)
Zaragoza	سرقسطہ (اندلس)
Xardalis (Arzachel)	زرقلی

عالمِ اسلام کے معروف مُصنفین کی چار مقبول ترین کتابیں

اسلام اور ایمان کی جامع تعریف اور عبادات کی منفرد تشریح
ایسی کتاب جس نے لاکھوں زندگیوں کو تبدیل کر دیا

اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تحریکی انداز میں مطالعہ
سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مقبول ترین کتاب

احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں راہنمائی کا انمول خزینہ
مختصر مگر جامع تشریح

بندگانِ خدا کے دلوں میں اسلام کا جذبہ شوق
وعقیدت بیدار کرنے کے لیے قرآن اور حدیث
کی روشنی میں کامیاب زندگی کے سنہری اصول
ہر طبقہ فکر میں یکساں مقبول

★ چاروں کتابیں یکساں سائز، خوبصورت ٹائٹل، امپورٹڈ کاغذ، معیاری طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ

★ عید، شادی اور دیگر خوشی کے مواقع پر خوبصورت تحفہ

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
منصورہ ملتان روڈ، لاہور پاکستان 042-35252501-2